

حکیم الامت دامت برکاتہا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریباً جملہ تصانیف
سے منتخب سنیکڑوں الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۳)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الکہف - تا - سورۃ الشوریٰ

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

نظر ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ

مرتبین

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب
ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

ہوک فوارہ نمستان ہکستان فون: 540513-519240

Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۳)
تاریخ اشاعت..... صفر الفظفر ۱۴۲۵ھ
ناشر..... اِدارۃ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوسہ
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD
BOLTON BL13NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جزا، ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ ”سبق الغایات فی نسق الآیات“ بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

اجمالی فہرست

۵	سورة الکہف
۳۰	سورة مریم
۴۲	سورة طہ
۵۶	سورة الانبیاء
۶۶	سورة الحج
۸۷	سورة المؤمنون
۹۲	سورة النور
۱۳۱	سورة الفرقان
۱۴۳	سورة الشعراء
۱۴۸	سورة النمل
۱۵۰	سورة القصص
۱۷۲	سورة العنکبوت
۱۹۶	سورة الروم
۱۰۴	سورة لقمان
۲۱۷	سورة الاحزاب
۲۵۵	سورة سبا
۲۶۱	سورة فاطر
۲۷۶	سورة یس
۲۷۹	سورة الصافات
۲۸۴	سورة ص
۲۹۲	سورة الزمر
۳۲۲	سورة المؤمن
۳۲۸	سورة طہ السجدة
۳۴۵	سورة الشوری

سُورَةُ الْكَهْفِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِذْ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَوَّا إِلَى الْكَهْفِ

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرفَقًا ﴿١٦﴾

ترجمہ: اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان کے معبودوں سے بھی مگر اللہ سے تو تم (فلاں) غار میں چل کر پناہ لو۔ تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں بھی کامیابی کا سامان درست کر دے گا۔

تفسیری نکات

قصہ اصحاب کہف

یہ قصہ اصحاب کہف کا ہے۔ میں مفصل قصہ ان کا نہ بیان کروں گا۔ قرآن مجید میں بقدر ضرورت ہی ہے۔ اکثر واعظین قصے ہی بیان کیا کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا مشرب تو موافق قرآن کے یہ ہے

ما قصہ سکندر و دارا خواندہ ایم از ماجز حکایت مہر و وفا پیرس

ترجمہ: ہم نے دارا و سکندر کا قصہ نہیں پڑھا ہم سے تو محبت و وفا کا قصہ تو پوچھ۔

اصحاب کہف ایک مشہور جماعت کا لقب ہے۔ یہ سات آدمی تھے ایک کافر بادشاہ کے زمانے میں وہ

بادشاہ بتوں کو سجدہ کرایا کرتا تھا ان سات کو اللہ تعالیٰ نے خود بخود ہدایت کی اور توحیدان کے دل میں گھر کر گئی اب ان کو پریشانی ہوئی کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو بادشاہ ہم سے شرک کرائے گا اور مقابلہ کریں تو کیسے کر سکتے ہیں سات آدمی ایک سلطنت کا کس طرح مقابلہ کریں ایسی صورت میں آدمی اپنی جان اور ایمان مخفی ہو جانے اور بھاگ جانے ہی سے بچا سکتا ہے ہاں شاذ و نادر اتفاق سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حکمت عملی سے حق بھی ظاہر ہو جائے اور جان و ایمان بھی بچ جائے۔

اسی لئے ان حضرات نے اسی میں سلامتی سمجھی کہ سب سے خفیہ طور سے رہو چنانچہ چند روز تک مخفی طور سے رہے ایک مرتبہ مشورہ کیا کہ یوں کب تک رہیں گے اگر کسی دن ظاہر ہو گئے تو پھر آفت آوے گی اور نیز یہاں اگر اسی طرح رہتے رہے تو ان کی صحبت کا اثر نہ ہم پر ہو جاوے اس لئے کہیں ایسی جگہ چل دو کہ ان کو ہماری مطلق خبر نہ ہو چنانچہ مشورہ کر کے وہ ایک غار میں جا چھپے اور ان کے ہمراہ ایک کتاب بھی چلا گیا اور وہاں پر ان پر اللہ تعالیٰ نے نوم مسلط کر دی چنانچہ تین سو برس سوتے رہے اس کے بعد آنکھ کھلی آگے پورا قصہ ان کا اس سورۃ میں ہے عجیب قصہ ہے مجھ کو اتنا ہی بیان کرنا تھا غرض اس مقام کی یہ آیت ہے اس آیت میں ان کے مشورہ کا ذکر ہے۔ ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ جب تم ان سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے سوا اللہ کے۔ الا اللہ میں دو احتمال ہیں اول تو یہ کہ یا تو ان میں یبعدون عامل ہے اس وقت تو یہ معنی ہوں گے کہ تم لوگ ان کفار سے اور جن کی وہ سوائے اللہ کے عبادت کیا کرتے تھے ان سے علیحدہ ہو گئے لیکن اس توجیہ پر ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کلام سے معلوم نہیں ہوا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ الا اللہ اعتزلتموہم کا معمول ہو یعنی جب کہ تم لوگ ان سے علیحدہ ہو گئے مگر اللہ سے کہ اس سے علیحدہ نہیں ہوئے اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا اور الا اللہ کی یہ تقدیر ہوگی لکن اللہ فلم تعتزلوہ فاوالی الکھف یعنی جب ان سے علیحدہ ہو گئے تو اب غار کی طرف چلو نتیجہ اس کا کیا ہوگا ینشر لکم ربکم من رحمته یعنی نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت کا حصہ پھیلائیں گے۔ یہ لوگ کیسے مؤدب تھے کہ ان کو حالانکہ نہ شرائع معلوم تھے نہ کسی سے تعلیم پائی تھی نہ کسی کے صحبت یافتہ تھے لیکن مؤدب اس درجہ کہ واذا اعتزلتموہم الخ سے وہم ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی چھوڑ دیا ہو اس لئے کہ کلام اس طرح کا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں جب تم نے سب معبودین کو چھوڑ دیا جس میں اللہ تعالیٰ بھی بظاہر داخل ہیں کیونکہ وہ سب ہی کے معبود ہیں بت پرست بھی ان کی عبادت کے مدعی ہیں گو اگر الا اللہ نہ ہوتا تب بھی یہ معلوم تھا کہ ان سب کو اللہ ہی کی واسطے چھوڑا ہے تو پھر خدا کو کیسے چھوڑتے لیکن تاہم کلام میں ادب ملحوظ رکھنے کے لئے الا اللہ بڑھایا اس سے ان کا اللہ تعالیٰ کا محبت ہونا اور نہایت مؤدب ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم تو کہیں پائی نہ تھی ان کے دل میں یہ کیسے

آیا کہ دین کے بچانے کی ضرورت ہے یہ نہایت درجہ ان کے متادب ہونے کو بتلا رہا ہے تیسرے یہ کہ غار میں جانے کے ثمرات کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرماویں گے اور حقیقت شناسی ملاحظہ کیجئے کہ یوں کہا ینشر لکم ربکم رحمته بلکہ من بڑھایا جس سے یہ مسئلہ مستفاد ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت غیر متناہی ہے جس پر رحمت ہوگی کوئی حصہ اس کا ہوگا باقی اس کی صفت رحمت کا کیا ٹھکانا ہے اس قدر وسیع ہے کہ جس کی نہایت نہیں ہے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس برس تک رحمت کا بیان کیا ایک روز قہر کا بیان فرما دیا تو کئی آدمی مر گئے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر کیا ہماری اتنی ہی رحمت تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا پس رحمت کی اور اسی طرح حق تعالیٰ کی ہر صفت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے

غرض حق تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے اس لئے رحمت پر من بڑھایا ایک ثمرہ تو غار میں جانے کا یہ ہوا دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ یھسنی لکم من امرکم مرفقاً اور مہیا کر دے گا تمہارے امر دین میں کامیابی کا سامان پس دوسرے بیان کئے ایک تو اشارہ مقصود کی طرف ہے اور دوسرے میں اس مقصود کے مقدمات کی طرف تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقصود رحمت حق ہے جو فاوا الی الکھف پر مرتب ہے لیکن یہ مقصود عادتاً اس پر بلا واسطہ مرتب نہ ہوگا گو کلام میں بوجہ اہتمام شان اور بسبب اس کی مقصودیت کی اظہار کے اس کو بلا فصل فاوا الی الکھف کے بعد ذکر کر دیا ہے لیکن صورت اس کے ترتیب کی یہ ہوگی کہ کہف میں جانے کے بعد اسباب مہیا ہوں گے تکمیل دین کے اور بواسطہ اس کے رحمت کا ترتیب ہوگا پس رحمت کا مقدمہ تکمیل دین کے اسباب کا مہیا ہونا ہے اور تکمیل دین کا مقدمہ کہف میں جانا ہے پس کہف میں جانا مقدمہ کا مقدمہ ہے اور یہ آیت شرح اور اعادہ ہے اس اجمال کا جو اول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یعنی اول حق تعالیٰ نے اجمالاً قصہ اصحاب کا بیان فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اذا وى الفتية الى الكهف فقالوا ربنا اتنا من لدنك رحمة وهينى لنا من امرنا وشدا فضر بنا على اذانهم فى الكهف سنين عددا ثم بعثناهم لنعلم اى الحزبين احصى لما لبثوا امداً۔
یہ قصہ ہے اجمالاً گویا متن ہے آگے نحن نقص علیک نباهم بالحق سے اس کی شرح ہے متن کے اندر جو اصل مغز تھا قصہ کا وہ بیان فرمادیا شرح میں اس کی تفصیل ہے سبحان اللہ کیا عجیب طرز ہے مصنفین کی عادت ہے کہ اول مختصر بطور فہرست کے مقصود بیان کرتے ہیں حق تعالیٰ نے ان اسالیب کی اپنے کلام پاک میں رعایت فرمائی ہے اور دوسرے مقامات میں بھی ایسے امور کی بہت رعایت ہے دیکھئے خطیبو اور واعظین کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے بعد خطبہ پڑھتے ہیں اس کے بعد مقصود شروع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی ایک مقام پر دلائل توحید سے پہلے خطبہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے قل الحمد لله وسلام على عباده الذين

اصطفسے یہ ایک خطبہ ہے اس کے بعد مقصود یعنی بیان دلائل تو حید شروع ہوا ہے اور یہاں متن کے موقع پر ایک دعا آئی ہے ربنا اتنا من لدنک رحمةً وہیئ لنا من امرٍ رشداً۔ اس آیت میں جو کہ شرح کے موقع پر ہے ینشر لکم ربکم من رحمته سے اس کی طرف اشارہ ہے یہاں اضافت کی وجہ سے رحمت کی تنکیر نہ ہو سکتی تھی اس لئے یہاں من بڑھا دیا اور متن کے موقع پر من لدنک کی وجہ سے تعریف کی ضرورت نہ تھی اس لئے رحمۃ کو منکر لائے جو تنکیر کے سبب مترادف ہے من رحمته کا متن میں جس رحمت کی درخواست کی تھی شرح میں بھی اس کی امید کو فاوا الی الکھف کا ثمرہ کر کے ظاہر کیا ہے گویا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ جس رحمت کا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا وہ ہم کو عنایت فرمائیے سبحان اللہ کلام میں کیا تناسب ہے اور فاوا الی الکھف ینشر لکم ربکم الخ میں ایک مسئلہ لطیف کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اعمال کو گوشمرات میں دخل ہے لیکن بدوں مشیت حق کے ان کا ترتیب ضروری نہیں ہے بعض مرتبہ بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور ثمرہ کچھ مرتب نہیں ہوتا اس لئے ہر حالت میں یہ ضروری ہے کہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے عمل کرے اور عمل پر نظر نہ ہو۔ الحاصل اصحاب کھف کو اپنے عمل پر ناز نہیں ہوا بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رہی اور اول جو دعا کی تھی ربنا اتنا من لدنک رحمةً الخ اس کو یہاں بطور ثمرہ دوسرے عنوان سے بیان کیا اور اس عنوان بدلنے میں بہت اسرار اور غوامض ہوں گے جو غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

پس جاننا چاہیے کہ اس آیت سے چند امور ثابت ہوئے (اول) تو فاوا الی الکھف سے یہ سمجھا گیا کہ کسی درجہ میں خلوت مقصود ہے (دوم) فاوا اعتزلتموہم پر مرتب کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ خلوت جب نافع ہے جبکہ جلوت سے مضرت ہو (سوم) اشارہ اس طرف ہوا کہ مسلم کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جب باطننا عزلت ہے تو ظاہر بھی عزلت ہونا چاہیے (چہارم) خلوت فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ رحمت حق مقصود ہے کما یدل علیہ ینشر لکم الخ (پنجم) جب ناجنسوں کی صحبت میں ہو تو ایسے وقت خلوت ممکن دین ہے۔

قرآن شریف میں ہے فلا تما رفہم الامراء ظاہرا (سو آپ ان کے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مرآء بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مرآء بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مرآء ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو اس کو صورتہ مرآء کہہ دیا گیا بوجہ مشاکلتہ کے ورنہ حقیقی مرآء حرام ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَلَا تَطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۝

ترجمہ: اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔ اور دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور ایسے شخص کا کہنا مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا (یہ) حال حد سے گزر گیا ہے۔

تفسیری نکات

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم الخ (یہ ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جما کر بٹھلائیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پاویں۔ (یعنی آنکھیں بھی ادھر ہی متوجہ رہیں) اس سے بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اول جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے کے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا۔ آگے فرماتے ہیں تريد زينة الحياة الدنيا (دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے) اس کو بعض نے مستقل جملہ کہا ہے یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لا تعد میں منفی کو اس کا عامل اور عیناک کو بوجہ اقامت عین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذی قید دونوں کے ارتقاع سے ہے یعنی جو عددان بارادة زینت حيوۃ دنیا ہوتا ہو متروک ہے اس طرح سے کہ عدوان ہے نہ ارادہ زینت پس اس سے وقوع زینت کا لازم نہیں آتا آگے دوسری نہیں ہے لا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه و كان امره فرطاً یعنی ان کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور اس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جس کی یہ حالت نہ ہو۔

اغفلنا قلبه الخ (ہم نے اس کے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں

ہوتی۔ چنانچہ رؤساء کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ممانعت فرمادی۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا بتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے۔

اہل اللہ خلوت کو پسند فرماتے ہیں

یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ماتکرہ یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اس کو ناگوار ہو اور اس سے معلوم ہو کہ آپ مجمع سے گھبراتے تھے مگر لوگوں کی مصلحت کے لئے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے کیوں کہ ان کی نظر تو اور ہی طرف ہے جس کو جامی فرماتے ہیں

خوشا دقتی و خرم روز گارے کہ یارے برخوردار وصل یارے
اور ان کی یہ شان ہوتی ہے

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث شنیدن ندہم
ان کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تو دوست تو کیوں نہ موجب پریشانی ہوں گے۔ لوگ ان کو تعظیم و تکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے چین میں ہیں مگر کوئی انہیں کے دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ اے ترا خارے پنا شکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند
کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجانست و مخالطت کو برداشت کرتے ہیں
در نیابد حال پختہ چچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام
غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پا کاں را قیاس از خود مکیر گرچ ماند در نوشتن شیر و شیر
انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔

الْمَالِ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ

عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ: مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ ﷺ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔

تفسیری نکات

آرائش دنیا

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دنیائے مذموم سے منع فرمایا ہے اور آخرت کی ترغیب دی ہے مگر عنوان دونوں جگہ ایسا عجیب ہے جس سے دنیا و آخرت دونوں کی اصلی حقیقت تھوڑے سے لفظوں میں ظاہر فرمادی واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس آیت سے پہلے دنیا کا بے حقیقت ہونا ایک مثال سے ظاہر فرمایا ہے واضرب لهم مثل الحیوة الدنیا کماء انزلناه من السماء فاختلط به نبات الارض فاصبح هشیما تذروه الرياح و کان اللہ علی کل شیء مقتدرا (اور بتلا دیجئے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے پھر رلا ملا نکال اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہوا میں اڑتا اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے) اس کے بعد یہ آیت ہے المال والبنون زینۃ الحیوة الدنیا (مال اور اولاد حیوة دنیا کی زینت و آرائش ہیں) اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زینت ہر چیز کی اس کے تابع ہوا کرتی ہے اور جب تابع ہے تو اس کا مرتبہ اصل سے کم ہوا اور متبوع کا بے حقیقت ہونا پہلے یعنی اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے اس سے خود ہی معلوم کیا گیا کہ اس کا تابع کیسا کچھ ہوگا تو ایک لفظ زینت سے اس قدر ان کی بے وقعتی کو واضح بیان کر دیا ہے عجیب فصاحت و بلاغت ہے اور اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ آرائش اور زینت کی چیزیں اکثر فضول اور زائد اور بے ضرورت ہوا کرتی ہیں تو حق تعالیٰ نے مال اور بنون کا بے حقیقت و بے ضرورت ہونا لفظ زینت سے ظاہر فرمادیا ہے یہ سب زینت ہی زینت ہیں اور کچھ نہیں پس مطلب یہ ہے کہ جو مال و اولاد تم کو مطلوب ہے جس میں عبادت کو تم منہمک ہو رہے ہو وہ بے ضرورت اور زائد چیزیں ہیں کیونکہ مال سے مقصود رفع ضرورت ہے اور رفع ضرورت سے مطلوب بقاء النفس ہے تو اصل مقصود کے لئے یہ واسطہ در واسطہ ہے پھر ایسے واسطہ کو مطلوب بنالینا حماقت ہی نہیں کہ رات دن اسی

میں منہمک لگا ہوا اور بقاء نفس جو مطلوب ہے وہ بھی بے حقیقت ہے کیونکہ اس کا بقاء چند روزہ ہے جو قابل اعتبار نہیں غرض مال خود مطلوب بنانے کے قابل ہرگز نہیں اور اولاد تو اس سے بھی گھٹیا ہے کیونکہ وہ تو بقاء نفس کے لئے بھی نہیں صرف بقاء نوع کے لئے مطلوب ہے اور بقا نوع کے لئے اسی کی کیا ضرورت ہے کہ آپ ہی کے اولاد ہوا اگر میرے اولاد نہ ہوئی اور آپ کے دو ہو گئیں تو اس سے بھی بقاء نوع ہو سکتی ہے دوسرے بقاء نوع کی آپ کو کیوں فکر ہے جب تک حق تعالیٰ کو انسان کی آبادی دنیا میں مطلوب ہے اس وقت تک وہ اس کی تدبیریں کریں گے آپ اس میں رائے دینے والے کون ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی نوع باقی ہی رہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ آپ ہی کے اولاد ہو یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ بنات زینت دنیا نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی بیان فرماتے پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمانا اور بنات کو ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفان زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت ہے اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے لئے پھر و اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کو پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس سے معنی لغت میں چھپانے کی چیز تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پہننے کی چیز کو نہ پہناؤ اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول لغو ہے کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علمی سے رکی ہوئی ہیں میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ عوام کے لئے یکسوئی اور اجماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم

کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت اور علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے پاس سیر و سیاحت سے تجربہ میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اسی لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں مرد تو برسوں میں کسی بہت ہی بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورتوں کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کر لیا کرتیں (جیسا کہ آجکل یورپ میں ہو رہا ہے) بس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی ان کو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں نظر حقیقت سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے ہی اندر تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلوار یوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو دامن درا تو زغنیہ کم ندمیدہ در دل کشا نکمن درا
(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو)
چوں کوئے دوست ہست بصحر اچہ حاجت ست خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت ست
جب محبوب کے دربار میں ہو جنگل کی کیا ضرورت ہے خلوت نشین کو تماشا کی کیا حاجت یعنی تارکان تعلق ماسوی اللہ کو دوسری طرف التفات نہ چاہیے اس سے بے اتفاقی کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ بستی چھوڑ کر جنگل میں جا رہیں بلکہ توجہ الی الحق کافی ہے۔

عورتیں زینت دنیا نہیں

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بے پردگی کے بہت برے نتائج ہو رہے ہیں اور یہ کم عقلی اور بد فہم لوگ اس وقت سمجھیں گے جب بات ہاتھوں سے نکل جائے گی اس وقت تو دماغ کو چڑھ رہی ہے بدحواس ہو رہے ہیں کچھ خبر نہیں مگر یہ نشہ بہت ہی قریب اتر جانے والا ہے یورپ کا تو اتر گیا اور ان کا تو دیر میں بھی اتر ان کا بہت جلد اتر جائے گا اس لئے کہ ان کا ہر کام جوش کے ماتحت ہوتا ہے وہ چاہے دین کا کام ہو یا دنیا کا اور جوش کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے میں نے تو اس کے متعلق اپنے ایک بیان میں نہایت بسط کے ساتھ تقریر کی ہے اور اس میں ایک لطیف نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں المال والبنون زينة الحياة الدنيا اور یوں نہیں فرمایا کہ المال

والبنات اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز عام منظر پر لانے کی نہیں ہوتی وہ حیوۃ دنیا کی زینت نہیں کیونکہ زینت کے لئے تو ظہور ضروری ہے اس لئے بنون فرمایا کہ یہ ہے حیوۃ دنیا کی زینت۔

باقیات صالحات

مجھے اس وقت زیادہ تر آیت کے اسی جزو کا بیان مقصود ہے والباقیات الصلحت خیر عند ربک ثوابا و خیرا ملاً۔ کیونکہ یہ بیان مدرسہ کے جلسہ میں ہو رہا ہے اور مدرسہ باقیات صالحات سے ہے سونے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی چیزوں سے (مراد اچھے اعمال ہیں) ثواب کے اعتبار سے اور امید کے اعتبار سے تمہارے پروردگار کے نزدیک زیادہ بہتر ہے یہاں حق تعالیٰ نے لفظ اعمال کو مقدر فرمادیا ہے کیونکہ مقصود بقاء کا مدار خیریت بتلانا ہے گو تحقیق اس کا مادہ اعمال ہی میں ہو۔ پس اگر اعمال کا ذکر ہوتا تو باقیات کا مفہوم اس کی صفت واقع ہو کر تابع ہو جاتا تو مقصود مذکور میں صریح نہ ہوتا۔

یہاں چند نکات طالب علمانہ ذہن میں اور ہیں ان کو مختصر اذکر کرتا ہوں ایک یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اعمال شرک و کفر نہیں فرمایا حالانکہ وہ بھی باقیات سے ہیں کیونکہ جس طرح اعمال صالحہ کی جزا جنت ہے اور وہ باقی ہے ایسے ہی اعمال شرک و کفر کی سزا جہنم ہے اور وہ بھی باقی ہے تو جب یہاں اعمال کی بقاء کا ثابت کرنا مقصود ہے تو ان کو بھی بیان کرنا چاہیے تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان کو بقاء علی الاطلاق نہیں کیونکہ بعض اعمال شرک و کفر باقی ہے اور بعض کو گو باقی ہے جیسے کفر و شرک کی مگر چونکہ اس جزا والوں کی یہ حالت ہے کہ لا یموت فیہا ولا یحی کہ نہ ان کو وہاں موت ہے نہ زندگی ہے تو ایسی حیات جس کے متعلق لائیجی بھی ارشاد ہے اس قابل نہیں کہ اس کو باقیات کے ساتھ موصوف کیا جاوے اور ان کے لئے بقاء ثابت کیا جائے کیونکہ وہ بقاء مثل عدم بقاء کے ہے۔

دوسری باقیات صالحات جو ہیں ان کی بقاء محض لغوی نہیں بلکہ بناء برایصال الی الباقی کے ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق خیر ہی کو ہے شرک و کفر نہیں بلکہ وہ تو اس سے تعلق کو قطع کرنے والی ہے اس لئے اعمال صالحہ ہی باقیات کے ساتھ موصوف کرنے کے قابل ہیں پس صالحات کی قید محض توضیح کے لئے ہے ورنہ صرف لفظ باقیات ہی اعمال صالحہ پر دلالت کے لئے کافی ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ اعمال صالحہ کی بقاء بوجہ تعلق بحق کے ہے یہ ایک تفسیر کی بناء پر نص سے بھی موید ہے کل شیء ہالک الا وجہہ کی تفسیر ایک تو ذاتہ سے کی گئی ہے اور ایک تفسیر ماکان لاجلہ سے بھی کی گئی ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اعمال صالحہ کیا فناء عالم کے وقت بھی باقی رہیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک کچھ دیر کو فنا ہو جائیں گے مگر چونکہ وہ ساعت قلیلہ ہے اس لئے

عرفادہ گویا باقی ہی ہیں کیونکہ عرفا انقطاع قلیل کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح سے شام تک چلتا رہا تو اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو تو کوئی اس پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ وہ صاحب وہ تو پانچ منٹ بیٹھا بھی تھا۔

اور مثال لیجئے شعلہ جو الہ سے حرکت کے وقت ایک پورا دائرہ روشن نظر آتا ہے حالانکہ زیادہ حصہ اس کا تاریک ہے مگر عرفا اس تاریکی کا اعتبار نہیں کیا جاتا عدم الاحساس اور اگر اس کو خط مستدیر پر نہ گھمایا جائے بلکہ یمین سے یسار کو اور پھر رجعت یمین سے یسار کو اور پھر رجعت قہقری سے حرکت دی جائے تو رجعت کے وقت تو یسار سے یمین کو ضرور ہی تاریکی ہوگی لتحلل السكون بین الحركتین یعنی دو حرکتوں کے درمیان سکون کا ہونا ضروری ہے لیکن عرفا یہی کہا جاتا ہے کہ یہ روشنی مستمر معلوم ہے کیونکہ سکون محض آنی ہے اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ پس ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ ساعت قلیلہ میں فنا ہو جانا اعمال صالحہ کے بقاء و عرفا مضر نہیں کیونکہ زیادہ حصہ تو بقاء ہی کا ہے اور گو غیر خیر میں بھی ایسا ہی بقاء ہے مگر اوپر ان دونوں میں فرق بیان ہو چکا ہے۔

اعمال باقی

اب ایک شبہ اور رہا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہاں اعمال کو باقی فرمایا ہے حالانکہ وہ تو اعراض ہیں وہ کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

لان العرض لا بقاء له بالذات بل تبعاً للمعروض والمعرض ليس بباق بفتائہ بالموت مثلاً پھر بقاء تبعاً للمعروض بھی اعراض لازمہ کو ہے نہ کہ غیر لازمہ کو اور اعمال صالحہ ظاہر ہے کہ اعراض لازمہ نہیں بلکہ غیر لازمہ ہیں ان کا بقاء تبعاً للمعروض بھی نہیں رہ سکتا مثلاً نماز پڑھ کر جہاں فارغ ہوئے بس عمل ختم ہوا۔ اب اس کا بقاء نہ اصلۃً سے نہ تبعاً۔

اس جگہ سب معقولی تھک گئے مگر علامہ جلال الدین دوانی نے رسالہ زوراء میں لکھا ہے کہ آخرت میں یہ اعراض جو اہر ہوں گے یعنی جو عمل ہم کرتے ہیں وہ یہاں تو عرض ہے مگر عالم آخرت میں (جو کہ مکانا اس وقت بھی موجود ہے) جو اہر ہوں گے فقط اور اس کے لئے یہ صورت جو ہر یہ صدور ہی کے وقت سے حاصل ہو جاتی ہے اور وہ صورت جو ہر یہ باقی رہے گی۔

اب کوئی اشکال نہیں۔ عارفین تو کشفی طور پر اس کے قائل ہیں ہی مگر ایک معقولی عقلی طور پر بھی اس کا قائل ہے اور عقلاً اس کو جائز و ممکن سمجھتا ہے تقریب الی الفہم کے لئے میں طلباء کے واسطے ایک معقولی مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن بہت حکماء کے نزدیک حق ہے اور ظاہر ہے کہ حصول بانفسہا سے مراد یہ تو

نہیں ہے کہ بعینہ یہی شے جو خارج میں ہے ذہن میں حاصل ہوتی ہے اگر بعینہ حصول ہو تو تصور جہاں سے ذہن کا انشقاق اور تصور نار سے احراق لازم ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت شے کی ذہن میں حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت جوہر کی جوہر ہے حالانکہ صورتہ حاصل فی الذہن عرض ہے تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے جس طرح اعراض ذہنیہ خارج میں جوہر ہیں اسی طرح اعراض دنیویہ آخرت میں جوہر ہوں تو اشکال کیا ہے۔

ایک نکتہ اس جگہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے الباقیات الصالحات نہیں بلکہ الباقیات الصالحات فرمایا ہے۔ اس عنوان میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اعمال میں ہر ہر عمل میں مستقل صلاحیت ہے اس لئے صالحہ کا مصداق بھی متعدد ہو کر صالحات صادق آوے گا یہ نہیں کہ مجموعہ میں صلاحیت ہوتا کہ ان کو مجموعہ بنا کر صالحتہ صفت مفردہ سے تعبیر کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو بعض اعمال صالحہ کو حقیر سمجھتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت

غرض باقیات کے ساتھ صالحات کے جمع لانے میں ہر عمل کی وقعت کا اظہار ہے اور جب اعمال آخرت باقی رہنے والے ہیں اور اس کے مقابلہ میں مال و بنون کو زینت فرمایا گیا ہے تو اس لفظ سے اس پر تنبیہ ہے کہ دنیا کی چیزیں فنا ہونے والی ہیں اور جب دنیا کے اموال و اولاد فانی ہیں تو اگر وہ آپ سے پہلے اور آپ کے سامنے ہی فنا ہو جائیں تو غم نہ کرو کیونکہ وہ تو فنا ہونے والے تھے ہی۔

قرآن مجید میں ہے ووجدوا عملوا حاضراً (جو جو اعمال انہوں نے کئے ہیں ان میں موجود پائیں گے ۱۲)

اعمال قیامت میں اپنی شکل میں ظاہر ہوں گے

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی بھی تفسیر فرمائی تھی۔ مشہور تفسیر تو اس کی مکتوب فی الصحیفہ (نامہ اعمال میں لکھا ہوا ۱۲) سے کی ہے مگر مولانا فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے جب ظاہر الفاظ و وجد و ماعملوا حاضراً سے معلوم ہوتا ہے یعنی قیامت کے روز سارے اعمال کو حاضر پائیں گے اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالہ زوراء میں یہ ثابت کیا ہے کہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں یہ رسالہ حضرت نے میرے پاس بھیجا تھا شاید بھیجنے سے یہ مقصود ہو کہ ان کی تحقیق حضرت کو پسند آئی ہو واللہ اعلم میں اس کو یقیناً کہہ نہیں سکتا کیونکہ کچھ فرمایا نہیں میں نے اس رسالہ کو دیکھا میری سمجھ میں یہ بات تو نہیں آتی کہ حقائق اعمال جوہر ہیں ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدري قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تحریر مولانا محمد یعقوب صاحب ان اعمال کے اثر قیامت کے روز

شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گی مثلاً جو چوری کر چکا ہے وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے زنا کر چکا وہاں نظر آئے گا کہ زنا کر رہا ہے غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔ اس کی مثال یہاں بھی خدا نے پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بایسکوپ کے اندر گزشتہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن یہ بھی بایسکوپ بن جائے گا اور اس کے ہاتھ پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے ایک زانی کی حکایت ہے کہ زنا کر کے غسل کر رہا تھا غسل کا پانی نالی سے بہہ رہا تھا ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اس پانی کو دیکھ کر کہا اس میں زنا بہہ رہا ہے پوچھا حضرت آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کوئی زانی غسل کر رہا ہے مجھے پانی کے ہر قطرہ میں زنا کی تصور پر نظر آتی ہے۔ اہل کشف کی صورتیں اعمال کی نظر آ جاتی ہیں حضرت عثمانؓ کی مجلس میں ایک شخص کسی نامحرم عورت کو دیکھ کر آیا تھا آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے اسی طرح جب کوئی طاعت کرتا ہے تو اس کا ایک اثر اس میں پیدا ہوتا ہے جس کا اہل کشف کو علم ہوتا ہے فرشتوں کو تو اعمال ماضیہ کا نامہ اعمال دیکھنے سے علم ہوتا ہے اور اہل کشف کے لئے یہ شخص اپنا آپ نامہ اعمال ہے اسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

غذائک فیک وما تبصر دوائک منک وما تشعر
(تمہاری غذا خود تمہارے اندر ہے اور تم دیکھتے نہیں تمہاری دوا تم ہی سے ہے اور تم نہیں شعور کرتے ۱۲)
وانت الکتاب المبین الذی باحرفہ یتظهر المضمّر
(تم وہ کتاب ہو کہ اس کے حروف سے پوشیدگیوں کا ظہور ہوتا ہے ۱۲)
وتزعم انک جرم صغیر وفیک تطوی العالم الاکبر
(تم اپنے آپ کو جرم صغیر سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے اندر ایک عالم اکبر لپٹا ہوا ہے ۱۲)
تو گویا تم خود کتاب مبین ہو۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ
 حُقُبًا ۚ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ
 سَرَبًا ۖ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي آتٍ بِغَدَاةٍ لَّيْسَ لَكُمَا مِنْهَا شَأْنٌ
 هَذَا انْصَبَا ۖ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ
 وَمَا أَنْسَيْتُهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ
 عَجَبًا ۖ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ ۖ فَارْتَدَّ عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۖ
 فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتِيَهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعِلْمَنَّهُ مِنْ لَّدُنَّا
 عِلْمًا ۖ قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ أَتَيْكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَ مِثْلًا عَلِمْتَ
 رُشْدًا ۖ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا
 لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۖ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي
 لَكَ أَمْرًا ۖ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ
 لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۖ فَانْطَلَقَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ
 أَخَرَقْتُهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ
 إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَ
 لَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۖ فَانْطَلَقَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا الْقِيَاغُلُ مَأْكَلَهُ
 قَالَ أَقْتَلْتُ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۖ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۖ

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ قَالَ إِن
 سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَٰذَا فَلَا تُصِيبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ
 أَهْلِهَآ فَابْوَاْ أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن
 يَنْقَضَ فَأَقَامَهُ ۚ قَالَ لَوْ شِئْتُ لَتَّخَذْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ قَالَ
 هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ
 عَلَيْهِ صَبْرًا ۚ أَمَّا السَّفِينَةُ ۖ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ
 فَأَرَدْتُ أَن أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ
 غَصْبًا ۚ وَآلُ الْغُلَامِ فَكَانَ أَبُوهُمُ مُّؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا
 طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَ
 أَقْرَبَ رُحْمًا ۚ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ
 وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن
 يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا
 فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۚ

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا
 جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز
 تک چلتا رہوں گا۔ پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہنچے اس وقت
 اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی۔ پھر جب دونوں (وہاں)

(سے) آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تولاؤ ہم کو تو اس سفر میں (یعنی آج کی منزل میں) بڑی تکلیف پہنچی۔ خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا اور (وہ قصہ یہ ہوا) کہ اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکایت سن کر فرمایا کہ یہی موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اٹھے لوٹے۔ سو وہاں (پہنچ کر) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا اور ان سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو (منجانب اللہ) سکھایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں۔ ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر میرے افعال پر (صبر نہ ہو سکے گا اور) ایسے امور پر آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پاویں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کروں گا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو (اتنا خیال رہے کہ) مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک میں اس کے متعلق خود ہی ابتداء ذکر نہ کروں۔ پھر دونوں (کسی طرف) یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی میں چھید کر دیا موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہوگا کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری اور خطرناک بات کی ہے۔ ان بزرگ نے کہا کہ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ (مجھ کو یاد نہ رہا تھا سو) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے۔ پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا اور وہ بھی بے بدلے کسی جان کے بے شک آپ نے (تو) بڑی بے جا حرکت کی۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ نے فرمایا خیر اب اور جانے دیجئے اگر اس مرتبہ کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق کچھ پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے بے شک آپ میری طرف سے عذر کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں پھر دونوں آگے چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا تو وہاں

والوں سے کھانے کو مانگا کہ (ہم مہمان ہیں) سوانہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گراہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو (ہاتھ کے اشارے) سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کچھ اجرت ہی لے لیتے۔ ان بزرگ نے کہا کہ یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے جیسا کہ خود آپ نے شرط کی تھی میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ جو کشتی تھی سو چند آدمیوں کی تھی جو اس کے ذریعہ سے دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے سو میں نے سوچا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے سو ہم کو اندیشہ (یعنی تحقیق ہوا کہ یہ دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر ڈال دے۔ پس ہم کو یہ منظور نہ ہوا کہ بجائے اس کے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے جو پاکیزگی (یعنی دین) میں سے بہتر ہو اور ماں باپ کے ساتھ محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے تھے اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا جو ان کے باپ کی میراث سے پہنچا ہے اور ان کا باپ (جو مر گیا ہے وہ) ایک نیک آدمی تھا۔ سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جاویں اور اپنا دینیہ نکال لیں اور یہ سارے کام میں نے بالہام الہی کئے ہیں ان میں کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔ لیجئے یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

سفارش سے خضر علیہ السلام کے واقعہ سے ایک نکتہ

ایک نووارد صاحب نے حاضر ہو کر کسی معاملہ میں حضرت والا سے سفارش کی درخواست کی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ سفارش کے متعلق ایک تمہید سنو۔ خضر علیہ السلام کے پاس جانے کا موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ جا کر علوم سیکھو۔ آپ خضر علیہ السلام کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے پوچھا کون فرمایا موسیٰ کون موسیٰ فرمایا بنی اسرائیل کا موسیٰ پوچھا کیسے آئے فرمایا ہل اتبعک علی ان تعلمن مما علمت رشداً۔ یعنی میں علوم سیکھنے کے لئے تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اتنے بڑے نبی اولوالعزم اور خضر فرماتے ہیں ”ہل اتبعک“ میں تمہارے ساتھ ہوں مجھ کو کچھ علوم سکھا دیجئے۔ یقینی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے علوم کے سامنے خضر کے علوم کیا چیز تھے مگر خیر جو کچھ بھی تھے ان کے سیکھنے کی درخواست کی خیر یہ تو قصہ ہے مگر اس میں دیکھنا یہ ہے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس گفتگو میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں یہ فرماتے تو اعلیٰ درجہ

کی سفارش ہوتی سو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آجکل جو سفارش لکھا کر لے جاتے ہیں یا جا کر کسی کا نام لے دیتے ہیں بعض اوقات اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہی حقیقی علوم کے حامل ہیں۔ دیکھئے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کے ارشاد سے آیا ہوں کیونکہ یہ سن کر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے پھر چوں چراندہ کریں گے۔ آزادی نہ رہے گی چنانچہ خضر علیہ السلام نے نہایت آزادی سے شرطیں لگا دیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدوں اذن کے کسی کی صحبت سے استفادہ حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ نیز دوسرے کے پاس جا کر یہ نہ کہے کہ میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا ہوں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۰۴ ج ۳)

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے

واقعہ پر چند اشکالات اور لطیف جواب

فرمایا کہ قرآن کریم میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بغرض تکمیل علم کے سفر کرنا مذکور ہے اس میں حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہی یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ان کے کسی کام پر ٹوکیں گے نہیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر کیوں قائم نہ رہے کہ بار بار ان کے کاموں پر ٹوکا۔ حضرت نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا اس صورت میں واجب ہے کہ اس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ خلاف شرع تو وعدہ توڑنا لازم ہو جاتا ہے اسی طرح ایسا وعدہ جس کے خلاف کرنے پر دوسرے فریق کا کوئی ضرر اور نقصان نہ ہو اس کا ایفاء بھی واجب نہیں ہوتا۔

تین واقعے جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کو ٹوکا۔ ان میں ایک واقعہ تو ظاہر شرع کے بالکل خلاف تھا کہ لڑکے کو قتل کر دیا اور دو واقعے کشتی توڑنے کا اور دیوار سیدھا کرنے کا جو خلاف شرع اور ناجائز نہ تھے مگر جب دوسری مرتبہ بچے کے قتل کا معاملہ سامنے آیا جو ظاہر شریعت کی رو سے بالکل حرام تھا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر شدت سے ٹوکا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام نے پھر پچھلا قول و قرار یاد دلایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی نسیان وغیرہ کا عذر بھی نہیں کیا اور آئندہ کے لئے اس وعدہ پر قائم رہنے کا فیصلہ بھی نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ اگر میں آئندہ آپ سے کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایک اللہ کا نبی اپنے منہبی فریضہ کی بناء پر کھلے ہوئے خلاف شرع پر خاموش نہیں رہ سکتا اور نہ اس کا وعدہ کر سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تو شریعت کے آداب کی پابندی اس طرح واضح ہو گئی اور دوسری طرف حضرت خضر علیہ السلام نے بھی ظاہر شریعت کی پابندی کی مگر حالات کے تابع خلاف استحباب و مروت تھے۔ پیغمبران چیزوں پر صبر نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہیے اس لئے مجبور ہو کر ٹوکا۔ خصوصاً یہ بھی معلوم تھا کہ ان چیزوں پر ٹوکنے میں حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی ضرر اور نقصان نہیں۔ (انتہی)

یہاں دو یا تین ادب شریعت کے متعلق اور قابل نظر ہیں۔ اول تو یہ کہ شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ واقعات ایسے پیش آویں گے جو شریعت کے خلاف ہوں اس لئے یہ وعدہ کر لیا کہ

ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصى لك امرا۔

یعنی ان شاء اللہ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

پھر جب کشتی توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو اس کو مروت و اخلاق کے خلاف سمجھتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے۔

لقد جئت شینا امرا یعنی ”یہ کام تو آپ نے بہت عجیب کیا کہ اپنے احسان کرنے والے کشتی بانوں کو نقصان پہنچا دیا“

اس وقت حضرت خضر علیہ السلام نے وعدہ یاد دلایا تو موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر کر کے آگے کو وعدہ کی پابندی کا اقرار کیا کہ احترام کو ملحوظ رکھا کہ لڑکے کا قتل جو شریعت کی رو سے حرام تھا اس واقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جدا نہیں کیا بلکہ تیسرے واقعہ میں جو دیوار کے سیدھا کرنے کا معاملہ تھا وہ کسی طرح بھی خلاف شرع نہیں تھا۔ خلاف مصلحت کہا جاسکتا تھا اس پر بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا تو اس وقت فرمایا۔

هذا فراق بینی و بینک ”اب ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی کا موقع آ گیا“

دیکھئے اس پورے واقعہ میں شریعت کے احترام کا دونوں طرف سے کس طرح اہتمام کیا گیا ہے۔ اب جاہل مدعیان تصوف نے اس واقعہ کا یہ نتیجہ نکال رکھا ہے کہ شریعت اور چیز ہے طریقت اور چیز جو چیزیں شریعت میں حرام ہیں وہ طریقت میں جائز ہو سکتی ہیں معاذ اللہ یہ کھلا ہوا انکار شریعت ہے طریقت کی حقیقت شریعت پر عمل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو طریقت شریعت کے خلاف ہو وہ الحاد و زندقہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ اس واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے خلاف شرع کام کو کیسے اختیار کر لیا جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اعتراض کرنا پڑا اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی اللہ کے نبی اور صاحب وحی تھے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پا کر اس پر عمل کر رہے تھے اور شریعت کے مقررہ قانون میں خود وحی الہی کے ذریعہ تبدیلی اور استثنائی صورتیں ہونا کوئی امر مستبعد نہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وحی کی خبر نہ تھی جس نے حضرت خضر علیہ السلام کے لئے شریعت کے عام قاعدہ سے اس واقعہ کو مستثنیٰ کر دیا تھا اس لئے انہوں نے ضابطہ شریعت کے مطابق اس پر اعتراض کرنا ضروری سمجھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو بھائیوں کی طرف چوری منسوب کرنا مذکور ہے اگرچہ انہوں نے چوری نہیں کی تھی۔ ایسی حالت میں ان کو چور قرار دینا شرعاً جائز نہیں تھا اس کی بھی یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام صاحب وحی ہیں ان کو بطور استثناء یہ اجازت مل گئی ہوگی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ شکل صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ایسا کرنے والا نبی اور صاحب وحی ہو کوئی ولی صاحب کشف والہام ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کیونکہ کشف والہام کوئی حجت شرعی نہیں اس کے ذریعہ شریعت کے کسی قاعدہ میں ترمیم یا استثناء نہیں ہو سکتا جاہل صوفیوں نے جو اس واقعہ کو خلاف شرع امور کے ارتکاب کے لئے وجہ جواز بنا لیا ہے وہ سراسر گمراہی ہے اب نہ کوئی نبی آ سکتا ہے نہ کسی پر وحی آ سکتی ہے نہ شریعت کے حکم کے خلاف کوئی استثناء ہو سکتا ہے۔

شیطان کا منقش اشیاء کا حال معلوم کر لینا منافی عصمت نہیں

فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد سے دریافت کیا کہ میرے دل میں کیا ہے اور آپ نے آیت دخان کے اپنے دل میں لے لی۔ تو اس نے کہا درخ ہے اب یہاں پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیسے اطلاع ہو گئی اس کا جواب یہ ہے کہ عصمت کے لوازم سے یہ ہے کہ عمل معصیت نہیں کر سکتا باقی اگر قلب کا حال یا دوسرے اعضاء میں جو چیز منقش ہو اس کو معلوم کر لینا یہ منافی عصمت نہیں اس کا ثبوت اکثر آیات قرآن مجید سے ہوتا ہے چنانچہ ہمراہی موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے وَمَا أَنَسَانِي إِلَّا الشَّيْطَانُ يَا أَيُّوبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَقَوْلِ انِّي مَسْنَى الشَّيْطَانِ بِنَصْبٍ وَعَذَابٍ وَغَيْرِهِ اس کے مؤید ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہیں ہو سکے گا۔

دوسری آیت میں لک بڑھانے کا سبب

حضرت موسیٰ و خضر علیہ السلام کے قصہ میں ایک جگہ توالم اقل انک لن تستطیع معی صبرا وارد ہے اور دوسری آیت میں الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا ہے علماء میں یہ سوال ہوا ہے کہ دوسری آیت میں لک کیوں بڑھایا گیا اس کی وجہ اہل بلاغت نے یہ بیان کی ہے کہ جواب سوال کے مثل ہونا چاہیے اگر سوال میں شدت ہو تو جواب بھی تشدید کے ساتھ دیا جائے گا اور سوال میں خفت ہو تو جواب میں بھی خفت کا لحاظ کیا جائے گا چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خفیف تھا کہ ابتدائی تھا اس لئے خضر علیہ السلام نے بھی اس کا جواب تخفیف کے ساتھ دیا اور دوسرے اعتراض میں شدت تھی کیونکہ بعد ممانعت کے تھا اس لئے خضر علیہ السلام نے بھی جواب میں اسی کے مناسب قوت و شدت اختیار کی اور لک بڑھا دیا۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے۔

عدم مناسبت کے سبب علیحدگی

حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جس وقت خضر علیہ السلام نے فرمایا ہذا فراق بینی و بینک ایسے اولوالعزم پیغمبر یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کیا کسی معصیت کا ارتکاب کیا تھا محض عدم مناسبت کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو علیحدہ کر دیا۔

اور ان کا باپ نیک شخص تھا تو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ وہ دونوں یتیم جوان ہو کر خود اپنا خزانہ نکال لیں یہ رحمت تھی خدا تعالیٰ کی طرف سے

آباؤ اجداد کی برکت سے اولاد کو نفع پہنچتا ہے

اس جگہ پر مفسرین نے متنبہ فرمایا ہے کہ وکان ابوہما صالحاً سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں باپ کی صلاحیت کو بھی دخل تھا اگرچہ مفسرین کی اس تنبیہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس تنبیہ پر آیت کی دلالت کا مدار ہے عقل سے خود آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ اگر باپ کی صلاحیت کو خضر علیہ السلام کے فعل میں کچھ بھی دخل نہ تھا تو ان کو اس جملہ کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی وکان ابوہما صالحاً مگر خدا تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دے بدیہی باتوں پر بھی تنبیہ کر دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کو اس طرف الہام ہو تو التفات ہو جائے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض باتیں تو مفسرین کے بیان کے بعد بدیہی معلوم ہوتی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تو شاید التفات ہی نہ ہوتا ان کے بتلانے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی غرض اس واقعہ سے معلوم ہوتا کہ آباؤ اجداد کی برکت سے بھی اولاد کو نفع ہوتا ہے مگر یہ مؤمنین کے واسطے ہے اور کفار کے بارے میں یہ ارشاد ہے فلا انس اب بینہم یومئذ ولا یتساءلون نہ ان میں تعلقات رہیں گے نہ آپس میں ایک دوسرے سے حال پوچھیں گے۔ مؤمنین کی اولاد کے بارے میں ایک آیت میں اس طرح موجود ہے والذین امنوا واتبعتہم ذریعتہم بایمان الحق انابہم ذریعتہم جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی اقتدا کی تو ہم اس اولاد کو آباؤ اجداد ہی سے ملا دیں گے یعنی اگر اولاد کا درجہ کم ہوگا اور باپ کا درجہ بلند ہوگا تو اس اولاد کو بھی باپ ہی کے درجہ میں رکھیں گے تاکہ اولاد کے قریب سے آباء کو انس زیادہ ہو۔ آگے فرماتے ہیں وما التناہم من عملہم من شیء یعنی ان باپ دادوں کے اعمال میں سے ہم کم نہ کریں گے اس میں بعض وہمیوں کے شبہ کا جواب ہے وہ یہ کہ اولاد باپ کے پاس پہنچانے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اولاد کے اعمال ادنیٰ ملنے کے قابل ہیں اور باپ کے اعلیٰ درجہ کے تو کچھ باپ کے کام کم کر کے اولاد کی طرف لگا دیئے جائیں اور اوسط نکال کر دونوں درمیانی درجہ میں رکھ دیا جائے کچھ باپ کی طرف کم کر دیا اور کچھ اولاد کی طرف بڑھا دیا تو فرماتے ہیں یہ صورت نہ ہوگی آباء کے اعمال میں کمی نہ کی جائے گی بلکہ ابناء کے اعمال میں زیادتی کر کے ان کو اسی درجہ میں پہنچا دیں گے جہاں ان کے آباء ہیں۔

لم دریافت کرنے کا منشاء کبر ہے

فرمایا ایک شخص نے کہا حلت بیضہ طیور کی کیا دلیل ہے۔ میں نے لکھا اور خود طیور کی حلت کی کیا دلیل ہے الگ الگ لکھو پھر میں پوچھوں گا ہرن کی حلت کی کیا دلیل ہے اور نیل گائے کی حلت کس سے ثابت تاکہ معلوم ہو سوال کی حقیقت منشاء اس کا کبر ہے ہر شخص بڑا بننا چاہتا ہے انقیاد سے عار آتی ہے۔

آداب شیخ

فرمایا اگر دفعہ کوئی آجائے اور بات ہے اور جب اجازت لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بلا اجازت نہ آنا چاہیے۔ چاہیے تو دفعہ بھی نہ آئے اس میں جانہن کو لطف رہتا ہے اور یہ قرآن سے ثابت ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے ذی رتبہ کون ہوگا اور پھر اللہ میاں کی اجازت بلکہ حکم ہے پھر بھی حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جا کر کہتے ہیں هل اتبعک علی ان تعلمن مما علمت رشدا کیا اب مجھے اجازت ہے ساتھ رہنے کا دیکھئے موسیٰ علیہ السلام اتنے بڑے اولوالعزم نبی اور خضر علیہ السلام جن کی نبوت میں بھی کلام ہے ان سے اجازت لیتے ہیں یہ کتنا ادب شیخ کا ہے جب وہ شیخ ہے تو اس کی اتباع کرنا چاہیے اور دیکھئے انہوں نے شرط کیا لگائی کہ جو کچھ میں کروں بولنا مت یہ نبی کیلئے سب سے بڑی شرط ہے مگر مان گئے اور پھر جب غلطی ہوئی تو یہ نہ کہنا کہ ایسی ہی ہونی چاہیے بلکہ میں بھول گیا غلطی ہوئی۔ یہاں تک تیسری بار کہہ دیا اگر پھر ہوا تو ساتھ نہیں رہوں گا۔ یہ شبہ نہ ہو کہ اجازت کیوں لی جب اللہ میاں نے کہہ دیا۔ نہیں اللہ میاں کا بھی مطلب یہی ہے کہ جاؤ اور ان سے اجازت لے کر ہی رہو۔ کیا کیا ادب ہے شیخ کا۔ دیکھئے اگر کوئی علامہ ہے، فلسفی بھی ہے ہر فن کے اندر کمال رکھتا ہے اور ایک بڑھئی کے پاس بخاری سیکھنے گیا تو اس وقت گردن جھکا ہی دے گا کیونکہ اس فن میں تو وہ شیخ ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شیخ امام عاصمؒ ہیں۔ قراءت میں جب وہ بوڑھے ہو گئے تو حضرت امامؒ کے پاس جاتے تھے اور کہتے تھے یا ابو حنیفہؒ قد جنتنا صغیرا و قد جنتنا کبیرا اور مؤدب بیٹھتے تھے۔ شاگرد سے بھی وہی ادب ہے جو شیخ سے کرنا چاہیے کیونکہ اس فن میں وہ شیخ ہیں۔ میں ایک صاحب سے فارسی پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے عربی پڑھتے تھے۔ جب میں فارسی پڑھتا تھا ادب کرتا تھا اور جب وہ عربی پڑھتے تھے ادب کرتے تھے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵)

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ

كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر کا (پانی) روشنائی کی جگہ ہو تو رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے (اور باتیں احاطہ نہ آئیں) اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لئے ہم لے آئیں

تفسیری نکات

حق تعالیٰ شانہ نے اپنا نام لینے کیلئے
القاب و آداب کی شرط نہیں لگائی

صاحبو! اگر حق تعالیٰ بھی اپنے نام پاک کے ساتھ القاب و آداب کی شرط لگاتے ہیں تو بتلائیے کہ ہم وہ القاب و آداب جو اس بارگاہ کے لائق ہیں کہاں سے لاتے اگر ازل سے ابد تک ان القاب و آداب کے لانے میں مشغول رہتے تو ان کو ہمارے القاب کی حق تعالیٰ کے اوصاف کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہ ہوتی جیسی ایک قطرہ کو سمندر سے ہوتی۔

نہ حسن غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں بمیرد تشنہ مستقی و دریا بچناں باقی
(یعنی نہ محبوب حقیقی کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے جلندر والا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے محبوب کے حسن کا بیان باقی رہ گیا)

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد
نگاہ کا دامن تنگ ہے تیرے حسن کے پھول بہت ہیں تیرے بہار کے پھول چننے والا کوتاہی دامن کی شکایت کرتا ہے یعنی محبوب حقیقی کے کمالات و اوصاف بہت ہی ہیں ان کی انتہا نہیں ہیں ہماری زبان و نظر ان کے بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔

سبب قسم

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جاننا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہ کی بے انتہا صفات ہیں چنانچہ ارشاد ہے قل لو کان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً

اور یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ایک خاص صفت سے تعبیر فرما کر اور حضور کی طرف مضاف کر کے قسم کھائی ہے جس کا مطلب بعنوان دیگر یہ ہوا کہ ہم اپنی ذات کی اس حیثیت سے کہ ہم آپ کے مربی ہیں قسم کھا کر کہتے ہیں تو یہ جیسے قسم میں آپ کی طرف اعتبار کرنے سے آپ کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے اسی طرح درجہ سے بھی آپ کا عظیم الشان ہونا ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کی گویا قسم کھائی ہے اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کے مخلوق کے ساتھ بہت سے علاقے میں مثلاً خالقیت رزاقیت ربوبیت وغیرہ ان علاقوں میں سے یہاں ربوبیت کو ذکر فرمایا اور تربیت کے معنی شینا فشینا ایسی شے کو جس کی شان سے تربیت ہے اس کے کمال پر پہنچانا ہیں پس فلاور بک کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے آپ کے مربی کی اور تربیت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان ہے پس مربی بہ معنی محسن ہوا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ قسم ہے آپ کے محسن کی اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرۃ ہے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلہ میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا دوسری وجہ بطرز فن تصوف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقۃً ذات باری تعالیٰ کے لئے ہیں اور مخلوق کے اندر ان کا ظل ہے۔ مثلاً مخلوق کسی مجرم کا قصور معاف کر دے تو یہ صفت عفو کا پر تو ہے اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جوادیت کا اثر ہے اور یہ مسلم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افراد بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہر اکمل و اتم ہیں پس صفت احسان کے بھی آپ مظہر اتم ہوئے تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے اور تربیت کا منشاء چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضور کی طرف تو گویا یہ فرمایا فلاور محبک اور جو خدا کا محبوب ہو وہ مخلوق کا بدرجہ اولیٰ محبوب ہونا چاہیے پس آپ محبوب بھی ہوئے تمام مخلوق کے تو فلاورک سے آپ کا عظیم الشان ہونا اور محسن ہونا اور محبوب ہونا سب ثابت ہوا اور چونکہ آپ مظہر صفات حق ہیں اور حق تعالیٰ کی صفت محبتیہ للمر بوب ثابت ہوئی پس آپ نے بھی اپنے غلاموں کے ہوں گے پس فلاور بک ہر سہ وجہ اطاعت کو مع زیادہ صفت الحبتیہ مشتمل ہو گیا۔

مسئلہ تقدیر کی تعلیم

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ مضر نہیں اور اس کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادیات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادیات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہی اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرائھا ان ذلک علی اللہ یسیر۔ لکیلا تا سوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما تاکم واللہ لا یحب کل مختال فحور

یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے (اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس کو قدرت الہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں۔ کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی۔ اس لئے تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو۔ (بلکہ اس سے تسلی حاصل کر لو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی۔ اس کا آنا ضرور تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتر آؤ نہیں۔ بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں۔ حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے یہ نعمت ہمارے لئے مقدر کر دی تھی ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر یہ پریشان نہ ہو۔ اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطرنہ ہو۔ ان کو اپنا کمال نہ سمجھے۔ جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ الشیء اذا خلا عن غایۃ انشئ۔ شے جب اپنی حالت سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے۔ تو اب جس شخص کا مصائب و نعم کے وقت یہ حال نہ ہو وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں یعنی کامل معتقد نہیں۔ اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اس کی غرض ضرور مرتب ہوتی۔

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے اس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں فکر کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے۔ اب جو شخص توحید کا قائل ہے مگر غیر اللہ سے خوف و طمع بھی رکھتا ہو وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں بلکہ مشرک ہے۔ چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں

فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملاً صالحاً ولا يشرك بعبادة ربه احداً

یہ جو کوئی لقاء رب کی امید رکھتا ہو۔ وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حدیث میں لایشرک کی تفسیر لایرانی آئی ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاء مشرک ہے حالانکہ ریاء میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لئے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو شرک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے کیونکہ عبادت غیر اللہ جوارج سے ہوتی ہے اور جب وہ شرک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکر شرک نہ ہوگا۔ یہ تو قلبی عبادت ہے پس غیر اللہ سے خوف و طمع پر صوفیہ کا لفظ شرک اطلاق کرنا غلط نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں توحید کی غایت مفقود ہے۔ اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے۔ کہنا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادت میں اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

(المراد ماحقہ مواظب و دنیا و آخرت ص ۸۷ ص ۸۸)

سُورَةُ مَرْيَمَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا

ترجمہ: فرشتہ نے کہا میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دے دوں۔

تفسیری نکات

ممنوع نام رکھنے کا رواج عام

نبی بخش، علی بخش، رسول بخش وغیرہ ایسے ناموں کو علماء نے منع کیا ہے اور ایک شخص نے غضب ہی کیا کہ اس نے قرآن سے اس قسم کا نام نکالا یعنی اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام جبریل بخش مستحب کیا اس طرح سے کہ قرآن میں ہے لاهب لک غلاماً زکياً کیا یہ حضرت جبریل کا قول ہے حضرت مریم سے کہ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جبریل کے دیئے ہوئے ہوئے تو جبریل بخش ہوئے مگر یہ بھی خبر ہے کہ وہاں حضرت مریم اور حضرت جبریل دونوں کا کیا عقیدہ تھا آگے حضرت جبریل خود فرماتے ہیں قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلٰی هٰٓئِن وَّ لَنَجْعَلَنَّ اٰیَةً لِلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرٌ مَّقْضٰی جَس سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں اس ولادت کو تصرف الہی سمجھتے تھے خیر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی ایسے ناموں کا جواز نہیں نکلتا کیونکہ وہاں جبریل نے ایک فعل تو کیا تھا یعنی نفخ فی الحبیب تو اسناد الی السبب ہو گئی اور یہاں سالار۔ نبی۔ رسول وغیرہ نے کون سا فعل کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نام رکھا گیا ہے اور فعل جبریل کا یعنی نفخ اس آیت میں مذکور ہے فنفخنا فیہا من روحنا یہاں استطراداً ایک کام کی بات بھی یاد آگئی اس کو سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ قرآن میں احصنت فرجھا سوء تہذیب کا اشکال

پیدا ہوتا ہے کہ خاص موقع کا صریح نام لے دیا گیا مگر تفسیر میرے ذہن میں نہایت سہل آئی ہے وہ یہ کہ فرج کے معنی یہاں پر چاک گریبان کے ہیں جو ممیض میں عموماً ہوتا ہے جس کو عربی میں جیب بھی کہتے ہیں اور فارسی میں گریبان کہتے ہیں تو احصنت فرجھا کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مریم نے اپنے چاک یا گریبان کو پاک و صاف اور باعفت رکھا تھا کہ کسی غیر کا اس میں ہاتھ بھی نہیں لگا تھا اور یہ کنایہ ہے ان کی پاکدامنی سے اور اب نفخ کا محل نفخنا فیہا بھی یہی فرج بالمعنی المذكور ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ان کے گریبان میں پھونک ماردی اور عموماً عادت بھی یہی ہے تو اب وہ بناء ہی نہ رہی جس سے شبہ پیدا ہوا تھا بہر حال یہاں پیدا کرنے والے گو واقع میں حق تعالیٰ ہیں مگر جبریل درمیان میں سبب تو ہیں کیونکہ نفخ ظاہری فعل جبریلی تھا گو سبب اس نفخ کا حکم الہی تھا اس لئے سبب کی طرف اسناد مجازی کر دی گئی ہے اور یہاں سالار بخش وغیرہ میں تو سالار نے کوئی فعل ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے اسناد کی گئی ہے اور اگر کوئی کہے کہ سالار صاحب نے بھی ایک فعل کیا تھا یعنی دعا کی تھی تو میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا دلیل کہ دعا کی تھی آج کل تو نام ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی انہیں دور سے بھی نہیں دیکھا تھا پھر دعا کرنا کیسے معلوم ہو گیا پھر اس زمانہ میں نبی بخش بھی تو نام رکھا جاتا ہے تو حضور نے ان صاحبزادہ کے واسطے کس دن دعا کی تھی ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض کا نام محمد نبی ہوتا ہے یہ تو اور بھی برا ہے چنانچہ ایک صاحب کا یہی نام تھا میں نے اسے بدل کر محمد نبیہ کر دیا کہ نبیہ کے معنی رفیع کے ہیں۔

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا

ترجمہ: وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو ان دونوں کے درمیان ہیں سو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ۔ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی بے انتہا شفقت

اصل محیط فائدہ اور ماسبق لہ الکلام اس آیت میں فاعبد ہے اور اس کا سابق تمہید کے لئے ہے اور سیاق یعنی و اصطر لِعِبَادَتِهِ (اور اس کی عبادت پر قائم رہ) اس کا متمم ہے اور هل تعلم له سميا (بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے) اس کی تائید ہے بہر حال سابق و سیاق تمہید و تائید کے لئے ہے اور اصل مقصود فاعبدہ

(سو اس کی عبادت کر) ہے اور ابتداء اس کی جو رب السموات سے کی گئی تو وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی عادت ہے کہ جب کوئی مشکل کام بتاتے ہیں تو اس کے آسان کرنے کا بھی اس جگہ اہتمام فرماتے ہیں اور اہتمام میں نے مجازاً کہہ دیا ورنہ اہتمام مشتق ہے ہم بمعنی فکر سے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں مطلب یہ ہے کلام الہی میں یہ بھی التزام ہے کہ سہولت کی بھی رعایت کی جاتی ہے اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص تو سکول کا ماسٹر ہے گو بچوں کو وہ تعلیم دیتا ہے مگر چونکہ پبلک کانوکر ہے اس لئے اسے کوئی خاص انس و شفقت نہیں بلکہ محض ضابطہ اور وقت کا پابند ہے اسے اس سے بھی یہ بحث نہیں کہ میں نے جو کچھ پڑھایا وہ بچوں کی سمجھ میں بھی آیا یا نہیں کیونکہ تنخواہ دار استاد کو بچوں سے بالکل اجنبیت ہوتی ہے محض اپنی تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے اور ایک تعلیم ہے باپ کی کہ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا سمجھ ہی جائے ان دونوں کی تعلیم میں بڑا فرق ہے ماسٹر تو اپنے گھنٹہ میں آئے اور لڑکوں کو تقریر سنا کر چل دیئے اور باپ کی تعلیم یہ نہیں کہ الفاظ ادا کر دیئے اور چل دیئے بلکہ وہ سوچتا ہے کہ کون سے عنوان سے سمجھانا زیادہ مؤثر ہوگا وہ یہی سوچے گا کہ آخر اتنے دن پڑھتے ہوئے ہو گئے نفع کیوں نہیں ہوتا میں کوئی تدبیر اختیار کروں جو نفع ہو کبھی ترغیب دیتا ہے کبھی ترہیب کرتا ہے کبھی یہ سوچتا ہے کہ میرے کہنے کا اثر ہوتا تو لاؤ اس کے کسی دوست سے کہلو اوں حق تعالیٰ کی تعلیم اسی رنگ کی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے غنا کو اگر دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ان کو کیا ضرورت ہے اس قدر اہتمام کی مگر کیا ٹھکانا ہے ان کی شفقت کا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی بندہ ہم سے جدا رہے اور کیوں نہ ہو انہوں ہی نے تو ان تمام شفقتوں کو پیدا کیا بس جس نے باپ کے دل میں اتنی شفقت پیدا کر دی وہ خود کیسا شفیق ہوگا چہ باشند آن نگار خود کہ بندہ اس نگار ہا۔ (وہ کیسا محبوب ہوگا جس نے ایسے محبوب پیدا کئے ہیں) سبحان اللہ مشکل سے مشکل تعلیم کو کیسا سہل کر دیا ہے مقصود تو یہ تھا کہ عبادت کیا کرو یعنی غلام بنو)

رب السموات الخ (وہ رب ہے آسمانوں کا الخ) یہاں پر ہو مبتدا مقدر ہے اور رب السموات اس کی خبر ہے اور اس نے جس صفت کی خبر دی ہے وہ صفت اعبدہ (اس کی عبادت کر) مقتضی ہے اور وہ صفت ہے مسلم تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ اب نفس کو امتثال امر میں خلجان نہ رہے گا کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے صفات و کمالات بھی معلوم ہو گئے اور اس کا امر بھی معلوم ہو گیا اور یہ طبعی امر ہے کہ صاحب عظمت و کمال کی اطاعت طبعاً سہل ہوتی ہے اور یوں تو حق تعالیٰ کے صفات کما رہے شمار ہیں مگر ان کو فاعبده (پس اس کی عبادت کر) کی تسہیل میں اتنا بن دخل نہیں جتنا صفت ربوبیت ہے کیونکہ محسن کی اطاعت کی طرف آدمی زیادہ دوڑتا ہے چنانچہ حکماء کی بھی اس پر نظر گئی ہے اور اسی لئے ان کا قول ہے الانسان عبد الاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) اور یہ اقتضا صرف قولی ہی نہیں بلکہ عملی ہے کہ محسن کی تعظیم و تکریم صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً بھی کی جاتی ہے کیونکہ احسان میں یہ اثر ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور ربوبیت سماء وارض سے بڑھ کر کیا احسان ہوگا اور اسی

لئے ربکم (تمہارا رب) یا ربک (تیرا رب) نہیں فرمایا بلکہ رب السموت والارض (وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا) فرمایا اس واسطے کہ ربکم فرمانے سے یہ ہوتا کہ بعض صورتوں کو تو حق تعالیٰ کا احسان سمجھتے اور بعض کہ نہ سمجھتے مثلاً اس کو تو احسان سمجھتے کہ جنگل میں بھوکے بیٹھے تھے کہ ایک خوان کھانے کا نازل ہو گیا مگر اس کو نہ سمجھتے کہ مثلاً پانچ سو روپیہ کی تنخواہ ہے اور اس سے اجناس خریدے گئے اور طرح طرح کے اسباب معیشت مہیا کئے گئے اور کھاپی رہے ہیں تو یہ ان وسائط کی تربیت پر نظر کر کے یہ سمجھتا کہ میں نے بی اے پاس کیا تھا اس سے پانچ سو کی نوکری ملی اور اس سے کھاپی رہے ہیں اس میں کسی کا کیا دخل اور کیا احسان اور یہ مذہب مسلمان کا تو ہے قارون کا مذہب ہے کیونکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا احسن کما احسن اللہ الیک (تو بھی خلق کے ساتھ) احسان کر جیسا خدا نے تجھ پر احسان کیا) تو اس نے جواب دیا انما اوتیتہ علی علم عندی (کہ اور کچھ نہیں صرف یہی بات ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم کی بدولت ملا ہے) اس میں خدا کے احسان کو کیا دخل (نعوذ باللہ) اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ علم کیا تھا ایک قول یہ ہے کہ کیمیا ہے کوئی کہتا ہے فن تجارت ہے غرض مختلف اقوال ہیں مگر چونکہ کسی دلیل کی تعیین دلیل صحیح سے نہیں اس لئے علم کو عام ہی رکھا جائے تو مناسب ہوگا خواہ وہ علم کیمیا ہو خواہ علم زراعت ہو خواہ فن تجارت ہو خواہ سود لینا دینا ہو بہر حال کوئی تدبیر تھی ترقی مال کی جس کو اس نے کہا علی علم عندی (میرے علم کی بدولت) خیر وہ تو کافر تھا افسوس تو مسلمان پر ہے (کہ وہ ترقی دنیا کو مطلوب سمجھتے ہیں)

حکم استقامت عبدیت

بہر حال فاعبدہ میں حکم ہے کہ غلام بن جاؤ۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ہم لوگوں میں ایسے حیلہ جو اور بہانہ باز بھی ہیں کہ صرف فاعبدہ سن کے ایک مرتبہ نماز پڑھ لینے ہی کو یہ سمجھتے کہ بس اعتثال امر ہو گیا اس لئے آگے فرماتے ہیں واصطبر لعبادته یعنی اپنی غلامی پر مداومت رکھو پس ایک درجہ غلام بننے کا ہے اور دوسرا درجہ غلامی پر قائم رہنے کا اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ تہمت ہے ماسبق کا تا کہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ فقط غلام ہونا مقصود تھا غلام رہنا مقصود نہ تھا بلکہ غلام غلام بننے کے بعد پھر اللہ میاں نے آزاد کر دیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی آزاد کر دیتے تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے کہ اعتقه اللہ من رقه یعنی خدا نے غلامی سے آزاد کر دیا یہ معنی ہوتے کہ اعتقه اللہ من النار یعنی خدا نے عذاب دوزخ سے آزاد کر دیا جیسے آقا اپنے غلام کا بدل جنایت ادا کر کے اس کو سلاسل و اغلال سے آزاد کر دے سو ظاہر ہے کہ یہ معنی تو ہونا محال تھا ہے کہ اس نے اپنی غلامی سے بھی آزاد کر دیا چنانچہ استحالہ اس کا ظاہر ہے مخلوق و مربوب کے لئے مملوک و محکوم ہونا لازم عقلی ہے جب یہ آزادی محال ہے تو ظاہر ہے کہ

غلام رہنا واجب ہے تو اگر واصطبر بھی نہ ہوتا تب بھی اس کے معنی کا تحقق واجب تھا اور یہاں سے حریت کی بھی تحقیق معلوم ہو سکتی ہے جس کی تمام دنیا میں بالچل ہے اور اس کو مذہبی و فطرتی حق ٹھہرایا جاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ حریت کوئی آزادی ہے آیا اس حریت کے معنی غیر حق سے آزاد ہونا ہے یا حق سے آزاد ہونا واقع میں غلامی ہی میں ہمارا فخر ہے نہ آزاد میں۔ چنانچہ جن کو اس غلامی کی حقیقت کا مزہ آ گیا وہ کہتے ہیں۔

اسیرش نخواهد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کند

ومن يفعل ذلك يلق اثمًا يضاعف له العذاب يوم القيمة ويخلد فيه مهانا الا من تاب الخ۔
اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب سے آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گو اس کا زمانہ محدود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حب ذاتی اور بغض ذاتی نہیں کفار سے بھی ان کی ذات کی وجہ سے بغض نہیں بلکہ ان کے افعال سے بغض ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے اور دوسرے افعال بھی موجب بغض ہیں۔

واذا تتلى عليهم اياتنا بينت قال الذين كفروا للذين امنوا اى الفريقين خير مقاماً واحسن ندیا و کم اهلکنا قبلہم من قرن ہم احسن اثناً و رنباً

پہلی آیت میں کفار کا تفاخر ساز و سامان اور اہل و اعوان پر مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کا اور دوسری آیت میں ان سے زیادہ سامان و نمود والوں کا مبغوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کے قابل تفاخر نہ ہونے کا۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ مقولہ یہ ہے اى الفريقين خير مقاماً و احسن ندیا یعنی جب ہماری آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان والوں سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کونسا فریق بہتر ہے۔

تخصیص کی نفی

واذا تتلى عليهم میں ہم کی ضمیر ظاہر ان کفار کی طرف عائد ہے مگر نہ تخصیص کی بناء پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔

تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ کر کے اس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو سنیں گے مگر ہماری مجلس غرباء سے علیحدہ کر دیجئے ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم

رُؤِساء ہیں ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بڑھاتا ہے ہماری اہانت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت کی غرض سے اس کا کچھ خفیف سا خیال بھی کیا تھا تا کہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ

اور مت دور کرو ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں رضامندی اس کی تم پر نہیں ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تمہارے حساب سے ان پر کچھ تم اگر ان کو دور کر دو پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَہٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنُکَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطْعَمْ مِنْ غَفْلِنَا قَلْبُہٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبِعْ هَوَاہٗ وَكَانَ امْرَہٗ فَرَطًا

اور روک رکھو اپنی ذات کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طالب ہیں اس کی رضامندی کے اور نہ ہٹیں تمہاری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ کہا مانو اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیروی کی اس نے اپنی خواہش کی اور ہے اس کا کام حد سے نکلا ہوا۔

یہ تشرید مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا (یعنی ارادہ زینت دنیا کا) صدور بھی ہوا ہو بلکہ نہی کے تحت میں ہے اور ترکیب میں حال ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشا اور سبب ارادہ حیات دنیا کا ہوتا ہے۔ آگے صاف صاف فرمادیا۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ کہ جسکے جی میں آئے ایمان لائے جس کے جی میں آئے کفر کرے۔ آپ ﷺ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ غرض آپ ﷺ کو منع فرمادیا کہ کوئی خاص جلسہ ان خمیشوں کے لئے نہ کیا جاوے ان کو سود فحشاء پڑے آئیں ورنہ جائیں جہنم میں۔

مقام طالب و مطلوب

امام مالکؒ سے خلیفہ نے درخواست کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا ان کے لئے عار ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا خلیفہ نے پہلے ان سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آ کر درس دیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب ہے طالب نہیں۔ خلیفہ سمجھ دار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا اس لئے فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو تسلی علیہم کے متعلق تحقیق تھی اس کے بعد آیت میں بیانات کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل مستنبط بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارت النص بالکل کھلا ہوا ہے

اس میں کچھ اغلاق نہیں باقی دلالتہ النص اور اشارة النص اور اقتضاء النص وہ کھلے ہوئے نہیں کہ ہر کوئی اس کو سمجھ لے۔ چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالْيَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی آتی ہے اس کو پھیلا دیتے ہیں جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں قوت استنباط شرط ہے تو امور امور علمیہ تو جدار ہے ہاں ظاہری مدلول کھلا ہوا ہے ہی۔ غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اگر ہم برے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے نہ مال دیتے نہ اولاد دیتے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِثَا

کہ ہم نے تم سے پہلے کتنے قرن ہلاک کر دیئے جو سامان اور منظر میں تم سے بڑھے ہوئے تھے یعنی ان کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی مال و اسباب بھی بہت تھا۔ اچھے اچھے مکانات تھے نشست گاہیں نہایت آراستہ و پیراستہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیب و زینت کی چیزیں ان کے پاس بہت تھیں مگر پھر بھی معذب ہوئے تو ان میں بھی یہی دوا مرض تھے حب مال اور حب جاہ۔

حب مال کے اثرات

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور جاہ کی بھی۔ میرا مقصود اس کی مذمت سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ کفار کی خصلت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہیے اور یہاں گو چند علمی مضامین بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں کیونکہ مجمع مستورات کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں اس لئے سہل سہل مضامین بیان کر رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابل فخر ہیں نہ زینت کی چیزیں قابل فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اس سے جاہ پیدا کریں اور چونکہ یہ دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ حب مال کی وجہ سے۔ اگر حب مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا غیبت اسی وجہ سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جاہ ہے غصہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور اور دوسرے کو حقیر خیال کرتا ہے جو کہ جاہ اور تکبر ہے اور یہ تکبر ایسی بری خصلت ہے کہ اس سے اور بہت سی بری

باتیں پیدا ہوتی ہیں شیطان میں یہی تو تھا اس لئے تو یہ کہا تھا۔

خلقتنی من نار و خلقتہ من طین کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے۔ لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص اکڑتا ہوا گزرا۔ انہوں نے اس کو نصیحت کی۔ اس نے کہا تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ بولے ہاں جانتا ہوں۔

اولک نطفۃ مذرہ و اخرک جیفۃ قدرہ وانت بین ذلک تحمل العذرة

یعنی اول تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سڑا ہوا مردار ہو جاوے گا اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے اندر پاخانہ بھرا ہے۔

صاحبو! یہ ساری خرابیاں حب مال اور حب جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

قال الذین کفرو واللذین آمنوا ای الفريقین خیر مقاماً و احسن ندیا۔

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ بتلاؤ ہم دونوں فرقوں میں سے کس کا گھرا چھا ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔

آگے ان کا جواب ہے

و کم اهلکنا قبلہم من قرن ہم احسن اثاثا ورنیا

یعنی ہم نے تم سے پہلے لوگ ہلاک کر دیئے جو تم سے اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔ جیسے فرعون، ہامان، شداد، قارون وغیرہ۔

شرف باسم شرف مسمی کی دلیل ہے

فرمایا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے آیت لم نجعل لہ من قبل سمیا سے استدلال کیا ہے اس پر شرف اسم شرف مسمی کی دلیل ہے ورنہ امتنان کیوں کر ہوگا کہ آدمی نام اچھا رکھے۔ ہاں ایسے نام نہ رکھے جن میں طرفہ اور تکبر پایا جائے۔ جیسے آج کل بعض لوگ سوچ سوچ کر ایسے نام رکھتے ہیں جیسے برہم، قدر، رفیع الشان وغیرہ

(ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۱)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ

الرَّحْمَنُ وُدًّا ①

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔

تفسیری نکات

حب مال و حب جاہ

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حب مال اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں بلکہ حب مال کی ہے جس سے برے آثار پیدا ہوتے ہیں تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حب مال اور حب جاہ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دنیا) کے طور پر فرماتے ہیں ان الذین امنوا و عملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودا کہ ہم مؤمنین اہل عمل صالح کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمہول ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں حدیث میں ہے کہ بعضے لوگ اپنی نظر میں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سور) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔ ایک مرتبہ دہلی میں میں بیان کر رہا تھا رات کا وقت تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے تو کیا یہ اس کی عزت تھی ہرگز نہیں تو جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں جاہ تو یہ ہے

صاحب وہ بادشاہ جسمہاست صاحب دل شاہ دلہائے شماست

(یعنی گاؤں کا مالک جسموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا بادشاہ ہے)

تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں سيجعل لهم الرحمن ودا (اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) پس معلوم ہوا کہ جاہ بری چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ بطور امتنان (نعمت دنیا) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتا بتلارہ ہیں اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ نعم المال الصالح للرجل الصالح (نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے) پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حب مال اور حب جاہ ہیں جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ما ذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسد لہامن حب المال والشرف لدين المرء یعنی حب مال اور حب شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیے بھوکے بھی بکری کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حب کا لفظ تصریحاً فرمادیا تو حب بری چیز ہے اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حب کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرائن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ جب مال ہوتا ہے تو حب مال بھی ہوتی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حب کے درجے میں ہو۔

ان الذين امنوا و عملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا
حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر دو کا مدار رکھا ہے۔ اس میں بھی دو چیزیں ہیں ایک مقصود جس کا بیان سيجعل لهم الرحمن ودا میں ہے اور ایک طریق یعنی ایمان و عمل صالح جس کا بیان الذين امنوا و عملوا الصلحت میں ہے۔

طریق نجات

یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے۔ ایک مقصود و دوسرے طریق مقصود اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے وہ دو چیزیں ہیں۔ امنوا و عملوا الصلحت کیونکہ حق تعالیٰ یہی تو فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان و عمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو وہ ہے اور ایمان و عمل صالح اس کے ترتیب کی شرط ہے یہی حاصل ہے طریق ہونے کا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب و مقبول بننا چاہے اس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہیے اور یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایمان و عمل صالح مقبولیت و نجات کا طریق ہے تو بدوں اس کے تمام نسبتیں نجات کے لئے ناکافی ہیں مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تبرک ہونا یہ تنہا نجات کے لئے کافی نہیں۔

پس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے محبوب بن جاویں گے اور اس کے فروغ میں سے یہ بھی بتلادیا گیا تھا کہ یہ شخص خلق کا بھی محبوب ہو جاوے

ان الذين امنوا و عملوا الصلحت سيجعل لهم الرحمن ودا
حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لئے اللہ تعالیٰ ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گویا آخرت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر يجعل سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہو جائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہو جائے گا۔ پس ہم کو بناء علی القواعد السانیۃ یہ حق حاصل ہے جس شے کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرماویں اس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت جلد حاصل ہو جانے پر محمول کر لیں۔

ودا کا مفہوم

بہر حال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ ودا کا جس کا نام محبت ہے فرماتے ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبت اللہ تعالیٰ پیدا کریں گے اس مقام پر اہل علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اس حاصل ترجمہ میں ودا کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔

محبوبیت کا باطنی سبب

تبرعاً اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں کہ ایمان و عمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہے۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہے جیسے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہے۔ ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا۔ اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جاوے گا۔ اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو اول بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبریل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو محبت ہے تم بھی اس کو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار دو۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔

سنیے بات یہ ہے کہ فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ زمین پہ اعلان کیا جاتا ہے۔ فیوضع له القبول فی الارض پس وہ سب کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضورؐ نے استشہاد میں یہ آیت پڑھی ان الذين امنوا و عملوا الصلحت سيجعل لهم الرحمن ودا حضورؐ کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے اس پر کہ ودا یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے اور میرا اس مضمون کو اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے۔ دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ

کے قبضہ میں ہیں جب وہ قلوب میں کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اس کے سامنے جھک جانا ہی پڑے گا اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔

اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے کل تین سبب ہوا کرتے ہیں نوال کمال جمال یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے چنانچہ محسن سے اسی بناء پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کر دی جائے یا کسی کا کام کر دیا جائے کسی کو بے ہودگی پر درگزر کی جائے۔ کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی مثلاً اہل علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ ان میں کمال علم ہے۔

الحاصل! جو اسباب محبت کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے اس کی مبلغ وجہ تعلیم فرمائی ہے پس جو شخص شریعت پر عمل کرے گا جو کہ عملوا الصلحت کا مدلول ہے وہ بالطبع محبوب ہو جائے گا اور اپنی قوم میں تو محبوب ہوگا ہی غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہوگا اس سے بعض اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آ گیا ہوگا جو کہ باب معاملہ و معاشرت و اخلاق سے ہے۔

ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل

اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اس کی نسبت سنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ کوئی کام ہو اول اس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا جوارح سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس کا تقاضا شدید قلب میں راسخ ہو جائے اور اس کے اضداد و موانع قلب سے مرتفع ہو جائیں ورنہ ارادہ ہوگا۔ مگر غیر راسخ جب راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا پس ثابت ہوا کہ مداومت و استقامت بدوں تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا پس اس قاعدہ کے موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخل ہونا محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نہ ہو سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب میں تقاضا رسوخ ہو اور وہ تقاضا رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز کے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام قواعد متعلقہ بصدق و معاملات اللہ و رسول نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں۔ تو جب تک تصدیق اللہ و رسول کی قلب میں راسخ نہ ہوگی تو ان تعلیمات پر استقامت نہ ہوگی۔ یہ تو ایمان کا دخل ہوا اور روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اس سے قوت بھیمیہ کا انکسار ہوتا ہے اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بھیمیہ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیہ کی۔ پس صوم و صلوٰۃ سے اس کی اصلاح ہوگی اور اس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہونگے جو مدار ہے محبوبیت کا اور مسبب کا سبب ہے۔ پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صلوٰۃ و صوم کا موضوع لہ صرف یہی ہے اصلی موضوع لہ تو ان کا قرب الہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اور سیر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہو جاتی ہے چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ اس لئے اس کا بھی اس میں دخل بیان کر دیا گیا۔

سُورَةُ طه

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۝

ترجمہ: وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے

تفسیری نکات

اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مفہوم

ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ مجسمہ (ایک فرقہ ہے جو خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا قائل ہے) نے الرحمن علی العرش استوی۔ (اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی) کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر ایسے ہی بیٹھے ہیں جیسے ہم چوکی پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ قدر نہ جانی اور عرش کو انہوں نے بڑھا دیا کیونکہ مستقر بفتح القاف عادتاً مستقر بکسر القاف سے اوسع ہوتا ہے (یعنی جس چیز پر قرار پکڑا جاتا ہے وہ زیادہ وسیع ہوتی ہے قرار پکڑنے والی چیز سے) حالانکہ عرش کو ذات باری تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں ایسی بھی نسبت نہیں جیسے کہ رائی کے دانہ کو ہم سے ہے اگر کوئی رائی کا دانہ ہمارے قدم کے نیچے پڑا ہو تو کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اور کیا یہ محاورہ صحیح کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس پر بیٹھے ہیں رائی کا دانہ بے چارہ کیا چیز ہے۔ پس عرش کہاں اور خالق عرش کہاں پس معنی اس آیت کے یہ نہیں ہیں جو مجسمہ نے یہ سمجھے ہیں۔

اب رہی یہ بات پھر کیا معنی ہیں تو سلف صالحین نے اس آیت اور جو اس کے مشابہ اور آیات ہیں ان کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان کے معنی کے تعین نہ کرو اور ان کے معانی کو اللہ کے حوالہ کرو صرف اتنا اعتقاد رکھو کہ جو کچھ مراد ہے وہ حق ہے اور اسلم طریقہ آیات متشابہات میں یہی ہے باقی متاخرین نے اس میں کچھ تاویل فرمائی ہے بعض نے یہ کہ استوی کے معنی استولی ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں اور ایک تاویل احقر کیا کرتا

ہے کہ استوی علی العرش بمعنی بر تخت نشستن (تخت پر بیٹھنا) کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور سے چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد یدبر الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہو سکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش (اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر تخت قائم ہوا) استوی میں ضمیر اللہ کی طرف ہے سو وہاں حسب قاعدہ القرآن یفسر بعضہ ببعضاً (بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے) یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم ۱۲ منہ)

اور تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب و غریب فرمائی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا اللہ علی العرش استوی تاکہ یہ لازم آوے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمن فرمایا ہے پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس اس تاویل سے یہ آیت وسعت رحمتی کل شئیء (میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے) کی مراد ف ہوگی اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلا واسطہ اس کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بواسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوئی ہے یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق متجلی لہ (جس کے لئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جاوے تجلی کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔

عرش اللہ تعالیٰ کا مکان نہیں ہے

الرحمن علی العرش استوی کے معنی عرش پر تجلی رحمانیت ہوتی ہے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عرش پر خدا تعالیٰ بیٹھے ہیں اور وہ ان کا مکان ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مکان کو مکین کے برابر یا کم از کم اس کے مقارب ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص زمین پر بیٹھے اور اس کے نیچے رائی کا دانہ آ جائے تو زمین کے خاص حصہ کو تو اس کا مکان کہا جائے گا رائی کے دانہ کو کوئی شخص اس کا مکان نہ کہے گا کیونکہ انسان سے اس کو کچھ بھی نسبت نہیں پھر وہ اس کا مکان کیونکر ہو سکتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ عرش حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہو سکتا کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات خداوندی غیر محدود ہے محدود کسی طرح غیر محدود کا مکان نہیں ہو سکتا پس۔ استوی علی العرش کے معنی وہی ہیں کہ حق تعالیٰ کی تجلی صفت رحمانیت کے اعتبار سے اس پر ہوتی ہے اسی واسطے الرحمن علی العرش استوی فرمایا اللہ علی العرش استوی نہیں فرمایا کیونکہ اللہ علم ذات ہے اور الرحمن اسم صفت ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ عرش محل ذات نہیں بلکہ صفت رحمت ہے کہ وہاں تجلی رحمت اور مکانات سے زیادہ ہے تو یہ استقبال قبلہ کا راز ہوا۔ الرحمن علی العرش استوی ”اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی“

اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں اور ایک تاویل احقر کیا کرتا ہے کہ استوی علی العرش بمعنی برتخت نشستن کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور میں تصرف کرنا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد مدبر الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہو سکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا استوی میں ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ سو وہاں حسب قاعدہ القرآن تفسیر بعضہ بعضا بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم) ایک تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب و غریب فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ اللہ علی العرش استوی (اللہ عرش پر بیٹھے ہیں) تاکہ یہ لازم آئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمن فرمایا۔ پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے پس اس تاویل سے یہ آیت

وسعت رحمتی کل شیء (میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے)

کی مرادف ہوگی اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلا واسطہ اس کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بلا واسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوتی ہے۔

تجلی کی معنی

یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق متجلی لہ (جس کیلئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جائے۔ تجلی کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۝

ترجمہ: (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کے اچھے اچھے نام ہیں

تفسیری نکات

حوادث اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مظاہر ہیں

حضرت حاجی صاحب پر تو حید کا بہت زیادہ غلبہ تھا وحدۃ الوجود تو حضرت کے سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشاہد ہے یعنی ہے ایک مرتبہ سورۃ طہ سنتے رہے اس آیت پر پہنچ کر لا الہ الا ہولہ الاسماء الحسنی حضرت

پراسکا غلبہ ہو گیا بطور تفسیر کے فرمایا کہ پہلے جملہ پر سوال وارد ہوا کہ جب سواء اللہ کے کوئی نہیں تو یہ حوادث کیا ہیں جواب ارشاد ہوا لا الہ الا اسماء الحسنیٰ یعنی سب اسی اسماء و صفات کے مظاہر ہیں اسی کو کسی نے کہا ہے۔
ہر چہ بنم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

إِنِّى أَنَا اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِى وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِى ⑪

ترجمہ: (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۔

تفسیری نکات

نماز کا ایک عظیم ثمرہ

اب میں اقم الصلوٰۃ لذكری میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں جس سے نماز کی فضیلت دیگر عبادات پر بہت زیادہ ثابت ہوتی ہے اور یہ محض نکتہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے وہ یہ کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ثمرہ کے لئے مقصود ہوں اور ثمرہ عمل کا مغائر ہو دوسرے وہ جو ثمرہ کے لئے مقصود نہیں بلکہ بذاتہ مقصود ہے اور جو ثمرہ اس کے ساتھ مذکور ہے وہ اس کا مغائر نہیں بلکہ عین ہے مثلاً ہم کسی حاکم سے ملنے جائیں اور وہ ہم کو کوئی کام بتلائے تو بعض کام تو ایسے ہوتے ہیں جو خود مقصود نہیں بلکہ ان کا ثمرہ مقصود ہے مثلاً حاکم یہ کہے کہ تم انٹرنس پاس کر لو تو ہم تم کو فلاں عہدہ دیدیں گے یہاں انٹرنس پاس کرنا خود مقصود نہیں بلکہ عہدہ مقصود ہے جو اس کا ثمرہ ہے اور یہ ثمرہ عمل کا غیر ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ یوں کہے تم ہمارے پاس ہر روز آیا کرو یہاں یہ عمل خود مقصود ہے کیونکہ حاکم کے دربار میں حاضری نصیب ہو جانا یہ خود بڑی چیز ہے گو اس پر ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں مگر ان ثمرات کے ساتھ خود حاضری دربار بھی بڑا مقصود ہے چنانچہ بہت لوگ اس حاضری ہی کے لئے بڑی بڑی کوششیں کرتے ہیں گو اس کے حصول کے بعد کوئی ثمرہ بھی حاصل نہ ہو۔ اب میں نماز کے متعلق دعویٰ کرتا ہوں کہ نماز میں جتنے اعمال ہیں اور نماز ان اعمال سے مرکب ہے وہ سب اجزاء ایسے ہیں کہ اعمال تو ہیں ہی مگر ثمرات بھی ہیں یعنی ان اعمال کے لئے کوئی ایسا ثمرہ نہیں جس کے اعتبار سے ان اعمال کو مقصود بالغرض اور اس ثمرہ کو مقصود بالذات کہا جائے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجزاء صلوٰۃ خود مقصود بالذات ہیں جس کو میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں اور جب اجزاء کا یہ حال ہے تو صلوٰۃ کا حال بھی اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی

مقصود بالذات ہے کیونکہ اجزاء میں اور مجموعہ میں محض اعتباری تغائر ہے اور تغائر اعتباری محض فرض ہی فرض ہے امور واقعہ میں اس کا اعتبار فضول ہے اور کسی عمل کا مقصود بالذات ہونا اور مقصود بالغرض نہ ہونا یہ اس کی بڑی فضیلت اور اعلیٰ درجہ کا کمال ہے اب سنئے کہ نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی محبوب عاشق سے کہے کہ ہم کو دیکھو اور ہم سے باتیں کرو ہر چند کہ دیکھنا اور باتیں کرنا ایک عمل ہے مگر ایسا عمل ہے کہ خود ہی عمل ہے اور خود ہی ثمرہ مقصود ہے اس سے کوئی اور ثمرہ مقصود نہیں عاشق کے دل سے پوچھو وہ اس عمل سے کسی غیر کو مقصود نہ سمجھے گا کیونکہ وہ تو عمر بھر اسی کو ترستا تھا کہ کسی طرح ایک نگاہ محبوب کو دیکھ لوں اور اس سے ایک دو بات کر لوں تو اب جبکہ محبوب نے اس کو اپنے دیکھنے اور اپنے سے ہم کلام ہونے کا امر کیا ہے یقیناً اس کو اس رویت و کلام سے کسی اور ثمرہ کی طلب نہ ہوگی بلکہ اسی کو مطلوب سمجھے گا رہا یہ اشکال کہ صاحب اصل مقصود تولذت ہے جو رویت و کلام محبوب سے حاصل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ احکام طبعیہ میں لذت و رویت و کلام کا غیر نہیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ ساتھ معاً حاصل ہوتی ہے دونوں میں تقدم و تاخر زمانی نہیں۔

نماز قیام و قعود و رکوع و سجود و قراءت سے مرکب ہے اور ان ارکان کے ساتھ تسبیح و تقدیس و تکبیر و ذکر بھی لگا ہوا ہے۔ یہ نماز کے اجزاء ہیں اب بتلائیے اگر نماز فرض نہ ہوتی تو جو چیزیں نماز کے اندر ہیں کیا آپ ان کو نہ ڈھونڈتے یقیناً آپ خود ان کو ڈھونڈتے اور ان کی طلب و تلاش میں عمر ختم کر دیتے کیونکہ ہر عاشق کو اس کی تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کرے اور اس کی تعریف و ثناء میں زبان کو تر کرے اور اس کی یاد سے دل کو تسلی دے۔

اب نمازیوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی نماز پر ناز نہ کریں کیونکہ حق تعالیٰ نے محض صل نہیں فرمایا کہ نماز پڑھا کرو بلکہ اقم الصلوٰۃ فرمایا ہے جس میں اقامت کا امر ہے اور اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ اس کے سب ارکان اعتدال و تسویہ کے ساتھ ادا کئے جائیں تو نماز پڑھ کر بے فکر نہ ہو جائیے بلکہ اقامت کی کوشش کیجئے۔

نماز کی روح

لذکری میں لام غایت کا ہے یعنی نماز کی غایت اور روح میری یاد ہے۔

یہاں ذکر کے معنی یاد کے ہیں اس کا اول درجہ یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کا دل میں خیال نہ ہو حتیٰ کہ اس کا بھی کہ میں اس وقت خدا کو یاد کر رہا ہوں حاصل یہ کہ قلب میں مذکور کا خیال ہو ذکر کا خیال نہ ہو۔ دوسرا مرتبہ یہ کہ مذکور کی یاد نہ سہی تو ذکر کی یاد ہی سہی یعنی یہی سہی کہ میں اس وقت یاد کرتا ہوں۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يُمُوسَى ۖ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ

أَهْشُ بِهَا عَلَى غَنَمِي وَلِي فِيهَا مَارِبٌ أُخْرَى ۝

ترجمہ: اور تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ علیہ السلام۔ انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں کبھی اس پر سہارا لگاتا ہوں اور کبھی اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔

تفسیری نکات

امور طبعیہ کے مؤثر ہونے میں حکمتیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يُمُوسَى تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهْشُ بِهَا عَلَى غَنَمِي وَلِي فِيهَا مَارِبٌ أُخْرَى یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب مہمل نہیں اس کو اسباب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو موسیٰ علیہ السلام کو کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقع مل گیا تو جہاں تک دائرہ بلاغت میں رہ کر کام میں وسعت ہو سکے اس کو وسعت دینا چاہیے اس لئے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آ سکتی تھیں سب بیان کر دیں۔ یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا کر دیتے ہیں گو اس میں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جواب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔

اِنْ اَقْذِفْهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفْهُ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ

ترجمہ: یہ کہ موسیٰ کو ایک صندوق میں رکھو پھر اُن کو دریا میں ڈال دو پھر دریا اُن کو کنارے تک لے آوے گا

قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر

فرمایا کہ بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مغلوب الغضب تھے کہ تختیاں پھینک دیں۔ جواب یہ ہے کہ ”القاء“ اور ”قذف“ کے معنی ایک ہی ہے۔ فاقذف فیہ میں قذف کے معنی یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ کو پھینک دیا بلکہ معنی یہ ہے کہ جلدی سے دریا میں رکھ دیا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے الواح کو جلدی سے رکھ دیا۔ (الکلام الحسن ج ۲ ص ۵۸)

حق تعالیٰ سے ہم کلامی

صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہمل زبان تصنیف کر کے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہمل زبان ہی اس کی نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی کیونکہ محبوب کی زبان ہے اور قرآن تو مہمل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح اور بلیغ، عجیب و غریب شیریں زبان ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت و بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہی ہیں مگر جو نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن پاک کے عادی ہیں وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدوں معنی سمجھے تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں۔ واللہ! بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ بس قرآن کی یہ حالت ہے بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح سے اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے سوال ہوا تھا

وما تلک بیمینک یا موسیٰ (اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟)

اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ عصا کہہ دیتے مگر نہیں چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے جواب دیا ہی عصای اتو کوا علیہا واہش بہا علی غنمی

یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر سہارا لگالتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔

کتنی تطویل کی ہے کہ ہسی بڑھایا اور یاء متکلم کا اضافہ کیا آخر میں پھر اس لاٹھی کے منافع دو جملوں میں بیان کئے اور اس کے بعد فرمایا ولسی فیہا ما رب اخوی کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں۔ یہ اس واسطے بڑھایا تا کہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق دریافت فرمائیں کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں ذرا وہ بھی بیان کیجئے۔ تو پھر اور باتیں کروں گا۔ یا خود ہی عرض کروں گا کہ حضور اس وقت اس کی شرح نہ ہوئی تھی اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ غرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی۔ یہ بات ابھی ذہن میں آئی۔

غرض عشاق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور بہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر لیں یعنی قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔ پھر حیرت ہے کہ قرآن کے بدوں سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے۔ کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ (الفاظ القرآن ملحقہ مؤ اعظم علم و عمل)

وَالْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۖ وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ۖ

ترجمہ: اور میں تمہارے اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی

فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی فرعون کے گھوڑے پر سوار ہوئے تھے اور اسی کی طرح کپڑے پہنتے تھے بہت خوب صورت تھے۔ اسی واسطے حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) اور خود فرعون دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ القیت عليك محبة منی میں نے تم پر (یعنی موسیٰ پر) اپنی طرف سے محبت ڈال دی) سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے کہا پھر فرعون نے قتل قبلی پر غصہ کیوں ظاہر کیا۔ انصاف کرنا ضروری تھا اور فرمایا کہ بعد القاء تجلی اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئے تھے۔ اس واسطے جس بزرگ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہوتی ہے اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے جیسے حضرت مدار رحمۃ اللہ علیہ۔ اس واسطے وہ منہ پر پردہ رکھتے تھے تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

إِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ فَقَوْلَا لَهُ قَوْلًا لِّئِنَّا لَعَلَّيْتَنَّا كُرْ

أَوْ يَخْشَىٰ ۖ قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ ۖ قَالَ

لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَآرِي ۖ

ترجمہ: دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ بہ رغبت نصیحت قبول کرے یا عذاب الہی سے ڈر جائے دونوں نے عرض کیا کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت کرنے لگے ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو کیونکہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں۔

تفسیری نکات

امور طبعیہ فطری چیز ہیں

امور طبعیہ فطریہ وہ چیزیں ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جو سب سے زیادہ قوی القلب تھے ان پر بھی ان کا اثر ہوتا تھا قرآن پاک میں متعدد جگہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو ارشاد فرمایا ہے ان میں صریح دلالت ہے کہ ایسی چیزوں سے انبیاء علیہم السلام بھی متاثر ہوتے تھے میں ان واقعات کو عرض کرتا ہوں حق

تعالیٰ فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے اذہبا الیٰ فرعون انه طغیٰ فقولالہ
قولالینا لعلہ یتذکر اویخشیٰ دونوں عرض کرتے ہیں قال ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا وان
یطغیٰ اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں قال لا تخافا اننی معکم اسمع واری اور سنئے موسیٰ علیہ السلام اژدہا
سے طبعاً ڈرے یہ واقعہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں والقی عصاک فلما راها تھتز
کانہا جان ولی مدبراً ولم یعقب یموسیٰ لا تخف انی لا یخاف لدی المرسلون اور حق تعالیٰ
فرماتے ہیں یموسیٰ اقبل ولا تخف انک من الامنین ایک اور واقعہ قرآن پاک میں مذکور ہے جب
موسیٰ علیہ السلام حکم خداوندی سے عصا کو زمین پر ڈالتے ہیں تو وہ دوڑتا ہوا سانپ بن جاتا ہے اس پر حکم ہوتا ہے
خلعہا ولا تخف سنعید ہاسیر تھا الا ولی پکڑو ڈرو نہیں اور ایک واقعہ مذکور ہے کہ جب جادو گروں نے
اپنا جادو شروع کیا اور سانپ بننے شروع ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف کے آثار پیدا ہونے لگے۔
خواہ خوف کا سبب کچھ ہی ہو جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں فواجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قلنا لا تخف
انک انت الاعلیٰ غرض جو چیزیں ڈرنے کی ہیں ان سے ڈرو اور جو نہ ڈرنے کی ہیں ان سے مت ڈرو۔

اور بالکل خوف نہ ہونا نقص ہے فطری کمی ہے کمال یہی ہے کہ خوف بھی ہو اور قوت بھی ہو اور امور طبعیہ کا
اثر ہونے میں بڑی حکمتیں ہیں سب میں بڑی حکمت تو یہی ہے کہ انسان کو اپنا عجز اور ضعف معلوم ہو کہ شان
عبدیت کا استحضار رہتا ہے جو روح ہے تمام مجاہدات اور ریاضات کی ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ
علیہ زمانہ غدر میں شریک جنگ ہوئے اول مرتبہ جو بندوق چلی ثقات نے بیان کیا کہ بے ہوش ہو گئے اس کے
بعد تلوار لے کر خود لڑے سو یہ کوئی نقص کی بات نہیں طبعی بات ہے عقلی بات جو تھی وہ یہ کہ جنگ میں شرکت کی
اس میں خوف نہیں ہو اور دوسری مثال سنئے مثلاً حکم ہے کہ طاعون سے بھاگنا جائز نہیں آگے دو صورتیں ہیں ایک تو
طبعی خوف ہے اس سے اگر وحشت دہشت کے زوال کی تدابیر کرے یا مبتلا ہو کر علاج کرے جائز ہے بلکہ
علاج کرنا ضروری ہے دوسرا عقلی خوف ہے وہ مذموم ہے کہ وہاں سے بھاگے امور طبعیہ کے وجود عدم کا مدار
ایمان یا کفر پر نہیں اس میں سب شریک ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُوسَىٰ ۖ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ

ثُمَّ هَدَىٰ ۖ

ترجمہ: وہ کہنے لگا پھر (یہ بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ، موسیٰ نے کہا کہ (ہمارا سب کا) رب وہ جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی۔ پھر راہنمائی فرمائیں۔

تفسیری نکات

فرعون کا روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ربنا الذین اعطی کل شیء خلقه ثم ہدی یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمّن ربکما کے بعد مقتضی ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ وہاں کہا جاتا جب فمّن ربکما میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو نداء میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیے مگر حق تعالیٰ نے صرف ”یا موسیٰ“ فرمایا ہے اس کی کیا وجہ یہ وہ باتیں ہیں کہ ان کا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پر ناچنے لگے لوگ ڈھولکی اور ستار پر کیا ناچتے ہیں واللہ قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات کر رہا تھا ہارون علیہ السلام سے تبعاً تھا نہ کہ اصالتاً اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ کو تربیت کیا تھا۔

اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا قال فما بال القرون الاولیٰ کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے (جو مرچکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا ان العذاب علی من کذب و تولی جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔ اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گزرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی قال علمہا عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں ہے اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لئے سب کو لکھ بھی دیا ہے میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی پس لکھتا اس غرض سے نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے پس حالت تو ان کی علم الہی میں منضبط ہے۔ اب صرف انتظار وقت موعود آنے کا ہے اس وقت عذاب اکبر کا ظہور ہو جاوے گا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تاکہ ان کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع و وعید کے لئے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے چنانچہ ارشاد ہے الذی جعل لکم الارض مہداً و سلك لکم فیہا سبلاً و انزل من السماء ماء جس نے زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے نہ لوہے کے مانند جس پر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو تکلیف ہو نہ بہت نرم ہے گارے کی مانند جس پر پاؤں دھنسنے لگے اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لئے راستے چلا دیئے (اگر زمین بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اس پر راستوں کے

نشانات یا تو قائم ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جس پر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں (اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے فاخر جنا به از واجا من نبات شتی کلوا وارعوا انعامکم ان فی ذلک لآیات لا ولی النہی پھر ہم نے پانی کے ذریعہ سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں کمال قدرت الہیہ غیر متناہیہ پر) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے صیغوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انزل من السماء ماء تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا انہوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تمیم کلام کے لئے بڑھادیا اور بتلادیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو گیا تو غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا ”فاخر جنا“ فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ شجرہ طور نے کہا تھا انی انا اللہ رب العلمین یہ اہل حال بہت دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہل ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر ان پر انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو) بہر حال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالیٰ نے ان کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لئے یہاں حق تعالیٰ نے مراقبہ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعون ”مراقبہ ارض“ ہی کے قابل تھے مراقبہ سماء کے قابل نہ تھے۔ یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لئے تم کو بھی مراقبہ ارض کی تعلیم کی جانی ہے (یہ تیسرا نکتہ ہے ۱۲) مگر حق تعالیٰ کے یہاں ایسے انبیا کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیا کو مراقبہ سماء تعلیم فرماتے ہیں (جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے ویتفکرون فی خلق السموات والارض و قدم فیہ السموات لان المقام مقام مدح اولی الالباب ۱۲ جامع) اور انبیا کو مراقبہ ارض بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کر لیں تو ان کے دن بھلے ہو جائیں۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۝۱۹

ترجمہ: اور جادوگر کہیں جائے کامیاب نہیں ہوتا

تفسیری نکات

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ پر شبہ

ارشاد فرمایا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ میں شبہ ہوتا ہے کہ ساحر تو اکثر کامیاب ہوتا ہے پھر باوجود اس کے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ میرے نزدیک یہاں پر ایک قید محذوف ہے جو قصہ موسیٰ علیہ السلام و

ساحرین سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ولا یفلح الساحر فی معارضته المعجزة (یعنی ساحر معجزہ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا) (الافاضات الیومین ج ۳ ص ۳۰۴)

ایک شبہ کا حل

ارشاد فرمایا لا یفلح الساحر میں شبہ ہوتا ہے کہ ساحر تو اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ پھر باوجود اس کے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ولا یفلح الساحر میرے نزدیک یہاں پر ایک قید محذوف ہے جو قصہ موسیٰ علیہ السلام و ساحرین سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ولا یفلح الساحر فی معارضة المعجزة (ملفوظ نمبر ۴)

ساحران موسیٰ علیہ السلام کا ایمان کامل

ان نو مسلموں کو کہ فرعون نے جب ان کو یہ دھمکی دی ہے لا قطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولا صلبنکم فی جذوع النخل ولتعملن اینا اشد عذابا وابقی (میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواؤں گا اور یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر پا ہے) تو انہوں نے نہایت دلیری سے جواب دیا قالو الن نؤثرک علی ما جاءنا من البینات والذی فطرنا فاقض ما انت قاض انما تقضی هذه الحیوة الدنیا انا امنّا برّبنا لیغفر لنا خطایانا وما اکرهتنا علیہ من السحر واللہ خیر و ابقی انہ من ینات ربہ مجرمافان له جہنم لا یموت فیہا ولا یحی ومن یناتہ مؤمنافان عمل الصلحت فاولئک لہم الدرجات العلی یعنی ہم کو سولی یا پھانسی کا ڈر نہیں ہم تجھے خدا تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے تجھ سے جو ہو سکے کر لے اور تو کر ہی کیا سکتا ہے صرف اس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ ہمارے گناہ معاف فرمادیں خصوصاً گناہ سحر جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا تھا (اور اس ایمان و مغفرت سے حیات جاوید ہم کو حاصل ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے (اس کی عطا بے زوال ہے) جو شخص مجرم ہو کر اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا سو اس کے لئے دوزخ ہے اس میں نہ مرے ہی گا نہ جی ہی گا اور جو شخص اس کے پاس مومن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں تو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں اور دوسری جگہ ساحران موسیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے قالو الاضیر انا الی ربنا منقلبون (انہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے) اس میں اہل لطائف نے کہا کہ انا الی ربنا منقلبون (ہم اپنے رب کے پاس پہنچ جائیں گے) علت ہے لاضیر کی مطلب یہ ہے کہ ہم کو سولی وغیرہ سے کچھ ضرر نہیں کیونکہ ہم (اس کے بعد) اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائیں گے جس کے پاس جانے کے ہم مشتاق ہیں مگر خود کشی حرام ہے اس لئے ہم خود تو جلدی سے خدا تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچ

سکتے اچھا ہے تو ہی قتل کر کے ہمیں جلدی پہنچا دے سبحان اللہ ان لوگوں کا کیسا کامل ایمان تھا کہ مسلمان ہوتے ہی لقاء حق کے ایسے مشتاق ہو گئے اور حیات دنیا کی قدر ان کی نگاہ سے فوراً تر گئی صاحبو! یہ محبت اور شوق پیدا کرو اس سے ساری پریشانیاں دفع ہو جائیں گی۔ اس وقت میں اسی کا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہتا نہ میں طاعات کو کہوں نہ ترک معاصی کو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک دن میں جنید بغدادی نہیں ہو سکتے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ أَعْمَى ﴿۱۷﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ﴿۱۸﴾

تَنْجِئُنِي: اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے۔ وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا۔

تفسیری نکات

دنیا کی تمام اشیاء کا مقصود

اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے معیشتہ ضنکاً سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیات اخروی تنگ ہوگی لیکن معیشتہ کے لفظ سے متبادریہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن و حدیث کے ضرورت نہیں ہے لیکن ہم تبرعاً واقعات سے دکھلاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا شے مطلوب ہے۔ جائیداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے۔ ڈھیلے تو مطلوب ہیں نہیں۔ مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر کہو کہ مطلوب جائیداد سے روٹی کپڑا اور مکان سے اس میں رہنا ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہوتا تو عاریت کے کپڑے اور عاریت کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں آتا جیسا اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے معلوم ہوا کہ نفیس پہننا کھانا رہنا مقصود نہیں کوئی اور شے مطلوب ہے وہ کیا ہے وہ ہے لذت، راحت، حلاوت۔ چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے اس لئے وہ مطلوب ہے۔

غرض دنیا کی تمام چیزوں سے مقصود جمعیت و سکون قلب ہے اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت کسی ایسی شے میں نہیں جس کو راحت و سکون لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ سب عین پریشان ہے۔ چنانچہ اہل دنیا کو دیکھ لو کہ

رات دن ان کی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کسی وقت بھی آرام میسر نہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت و سکون حقیقی صرف حق تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے اگر شک ہو تو تین دن ہی فرمانبرداری کر کے دیکھ لو یہ التزام کرو کہ تمام منہیات سے تین دن تک مجتنب رہیں گے پھر قلب کی پہلی حالت میں یقیناً فرق محسوس ہوگا۔

مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ : کیا یہ صورتیں ہیں جن پر تم جے بیٹھے ہو

تفسیری نکات

تصور شیخ کا مقصود

(۱) فرمایا کہ حضرت مولانا شہید تصور شیخ (۱) سے منع فرماتے تھے اور اس آیت سے استدلال فرماتے تھے۔
ما هذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ (کیا یہ صورتیں ہیں جن پر تم جے بیٹھے ہو) (الانبیاء آیت ۵۲)
اس طرح سے کہ تماثیل ذہنیہ صورت خارجیہ سے زیادہ موجب اکتنان ہیں۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مستقل شغل قرار دیا ہے۔ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے ہاں تو اس کا خاص اہتمام ہے۔ اس وقت اس میں مفاسد پیدا نہ ہوئے اس پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالمعنی نقل فرمایا کہ مانعین (۲) نے اعتماد ”اعلیٰ القرائن“ (منع کرنے والے) (۳) تفصیل نہیں کی (قرآن پر اعتماد کرے) اس لئے شبہ ہوا کہ جائز ذریعہ کیسے فرمادیا۔ تفصیل یہ ہے کہ اصل مقصود تصور حق تعالیٰ کا ہے۔
اللہ تعالیٰ چونکہ مربی نہیں ہیں اس لئے جن لوگوں کی قوت فکر یہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصور جتنا نہیں۔
اس میں ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے واسطے تصور تجویز کیا گیا کیونکہ علاج بالفصد ہوتا ہے یعنی خیال کے دفع کرنے کے لئے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائے گا خواہ وہ کوئی خیال ہو پس اگر خیالات مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہو سکے جی خیال جم سکے لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جے گا۔ اور اس لئے دفع خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا تو وہ مقصود بالذات نہ ہو مقصود بالغیر ہوا۔ اس لئے جب یہ غرض حاصل ہو جاوے تو شیخ کا تصور بھی دل سے نکال دے۔ اور صرف ذات حق کی طرف متوجہ ہو جاوے پھر احیاناً اگر خیالات آ جاویں تو پھر شیخ کا تصور کر لے۔ جب خیالات دفع ہو جاویں پھر ذات حق کی طرف متوجہ ہو جاوے کیونکہ مقصود حقیقت یہی ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۹-۳۰)

سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا

وَكَانُوا النََّاخِشِينَ^④

ترجمہ: وہ لوگ نیک کاموں میں مستعدی کرتے تھے اور ہم کو نہایت ہی شوق اور خوف سے پکارتے تھے اور ہم سے ڈرتے تھے۔

تفسیری نکات

علماء انبیاء کے وارث ہیں

اس کے قبل سے حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر اور حسب ضرورت مقام کے خاص خاص اغراض کے لئے ان کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں ان حالات کے بعد ان حضرات کے مشترکہ اوصاف کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

پس بیان آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کو بیان کیا گیا ہے جس کے برابر کسی کا علم بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے علم کامل کے لئے نبوت لازم ہے یا یوں کہئے کہ ایسا علم کامل نبوت کے لئے لازم ہے یا دونوں طرف سے تلازم مانا جائے بہر حال جو کچھ بھی کہا جائے اتنا قدر مشترک ماننا پڑتا ہے کہ نبوت اور کمال علم میں انفاک نہیں ہوتا تو باوجود علم کے اس کامل مرتبہ پر ہوں گے پھر بھی ان کی مدح کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیا۔

صرف کمال علمی مدح نہیں

بلکہ اس کے ساتھ انہم کانوا یسرعون فی الخیرات (یہ سب نیک کاموں میں دوڑتے ہیں) مجموعہ جزئین پر مدح کو ختم فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کمال علمی بھی اگرچہ کمال ہے لیکن وہ کمال تمام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عمل بھی مقرون ہو کیونکہ اگر عمل کو مدح میں داخل نہ مانا جائے اور صرف صفت علم پر مدح کو مقصود مانا جائے تو صفت علم کو معرض مدح میں ذکر کرنا ایک امر زائد ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ باعث مدح صرف کمال علمی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کمال بھی ہے اور وہ کمال کمال عملی ہے جس کو اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس آیت میں کئی قسم کے حکم بیان کئے گئے ہیں اور سب کا حاصل مشترک یہ ہے کہ اس میں شان عملی کو ذکر کیا گیا ہے۔

جس میں سے مختلف انواع کو ایک ایک جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں انہم کانوا یسرعون فی الخیرات کہ وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں یہ ایک جملہ ہے جس میں ایک نوع عمل کو ذکر کیا ہے آگے ارشاد ہے ویدعوننا رغباً ورهباً یعنی ہم کو پکارتے تھے شوق سے اور خوف سے یہ دوسرا جملہ ہے جس میں دوسری نوع کا ذکر کیا گیا تیسرا جملہ ہے وکانوا لنا خشعین جس میں ایک خاص نوع عمل کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر جملہ میں تینوں قسم عمل کے مجموعے کو مراد لیا جائے لیکن پھر بھی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ کو کسی ایک نوع سے زیادہ تعلق ہے یعنی عمل تین قسم کے ہوتے ہیں اعمال جوارح اعمال لسان۔ اعمال قلب مثلاً نماز ہاتھ پاؤں کے متعلق ہے ذکر اللہ زبان کے متعلق ہے خشوع قلب کے متعلق ہے تو ان انواع اعمال میں اگرچہ ہر جملہ کو سب ہی اقسام کے ساتھ ایک طرح کا تعلق ہے لیکن زیادہ تعلق ایک ایک جملہ کو ایک ہی عمل کے ساتھ ہے چنانچہ پہلا جملہ اور اعمال جوارح کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا جملہ عمل لسان کے ساتھ اور دوسرے جملے یعنی ویدعوننا میں جو رغباً ورهباً کی قید ہے وہ تابع ہے لہذا اصل مقصود بالذکر ویدعوننا ہی ہوا اگرچہ اس جملہ میں دوسرا احتمال بھی ہے کہ قید زیادہ مقصود ہو اور اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ہر جملہ کو ہر نوع عمل کر کے بھی کہا جاسکتا ہے تیسرا جملہ اعمال قلب کے ساتھ متعلق ہے اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے پس اس جمع کرنے سے لازم آیا کہ عمل کی تینوں قسموں کے جمع کرنے سے عمل کا کمال ہوتا ہے اور اگر ایک جزو کی بھی کمی رہی تو عمل ناقص رہے گا۔

آج کل ہماری حالت تو یہ ہے کہ جوارح اور زبان و قلب اعمال صالحہ کی بجائے عاصی میں مبتلا ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں نوعوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ انبیاء جوارح کو بھی بچاتے تھے کہ یسارعون فی الخیرات ان کی حالت تھی اور زبان کو بھی معاصی سے روک کر اس کو طاعت میں لگاتے تھے۔ ویدعوننا ان کی

شان تھی اور پھر ان کی دعاء بھی رغبت اور رہبت کے ساتھ تھی یعنی ظاہر یہ ہے کہ رغبت اور رہبت کو بطور شرط فرمایا اور مقصود بدعوٰی معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری تفسیر بھی اس کی ممکن ہے جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مجھے اختیار ہے کہ میں اس تفسیر کو اختیار کر لوں اور قلب کو معاصی سے پاک رکھتے تھے کہ ان میں خشوع پایا جاتا تھا۔

خشوع عمل قلب ہے

مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسرا جزو یعنی خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری طاعت کا اس ہے مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدان خشوع کی شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی ہے فرماتے ہیں اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ یعنی کیا مسلمانوں کے لئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو۔ تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت ہے چنانچہ ارشاد ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ الْخ (بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے سو وہ اچالے پر ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے قاسی ہیں) اور آگے فرماتے ہیں اَللَّهُ نَزَلَ احْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانًى تَقْشَعِرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی بہتر بات) (یعنی کتاب جو کہ آپس میں ملتی جلتی ہے دہرائی ہوئی ہے اس سے ان لوگوں کے روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں) تو اس آیت میں قساوت کا مقابل لین ہونا فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے۔

إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا
وَارِدُونَ ۝ لَوْ كَانَ هَؤُلَاءِ إِلَهًا مَا وَرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا
خَالِدُونَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ تم (اے مشرکین) اور جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجھ رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے اور تم سب اس میں داخل ہو گے (اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر یہ (تمہارے معبود) واقعی معبود ہوتے تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور سب (عابدین و معبودین) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کورہیں گے۔

تفسیری نکات

شمس و قمر وغیرہ کے جہنم میں ڈالنے کا سبب

حدیث ہے ان الشمس والقمر یکور ان یوم القیمة فی جہنم (او کمال قال) آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزوں کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے جیسے اصنام اور شمس و قمر وغیرہ وہ سب جہنم میں ڈالے جائیں گے اور حدیث میں شمس و قمر کی تصریح ہے اس پر بھی وہی سوال ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے کیا قصور کیا جب میں بچہ تھا دیوبند میں پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ اس مسئلہ میں دو مولویوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک بحث رہی ایک کہتے تھے کہ ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ یہ جمادات ہیں دوسرے کہتے تھے کہ نہیں ان کو بھی عذاب ہوگا کیونکہ یہ سبب شرک تھے۔

اس وقت تو میں کچھ نہ بولا کیونکہ بزرگوں کی بات میں دخل دینا خلاف ادب تھا۔ مگر اب بولتا ہوں کیونکہ شاید اس وقت میری ڈاڑھی کچھ ان سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے (یہ بطور لطیفہ کے فرمایا ۱۲) جواب وہی ہے کہ ان اشیاء کا دخول جہنم قصور کی وجہ سے نہ ہوگا اور سبیت بلا قصد کوئی قصور نہیں ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی بلکہ ان کو کفار کی حسرت بڑھانے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا تا کہ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا اور جہنم میں کسی کا ہونا ان کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں۔

انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم انتم لہا واردون لو کان ہؤلاء الہة
ماور دوھا و کل فیھا خلدون (سورہ الانبیاء آیت ۹۸)

اور حدیث میں ہے ان الشمس والقمر یکور ان یوم القیمة فی جہنم (او کما قال) پر وارد ہوتا ہے کہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزوں کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے جیسے اصنام

اور شمس و قمر وغیرہ وہ سب جہنم میں ڈالے جائیں اور حدیث میں شمس و قمر کی تصریح ہے۔ اس پر بھی وہی سوال ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے کیا قصور کیا۔ جب میں بچہ تھا دیوبند میں پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ اس مسئلہ میں دو مولویوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک بحث رہی۔ ایک کہتے تھے کہ ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ یہ جمادات ہیں اور دوسرے کہتے تھے کہ نہیں ان کو بھی عذاب ہوگا کیونکہ یہ سب شرک تھے۔

اس وقت تو میں کچھ نہ بولا کیونکہ بزرگوں کی بات میں دخل دینا خلاف ادب تھا۔ مگر اب بولتا ہوں کیونکہ شاید اس وقت میری ڈاڑھی کچھ ان سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے (یہ بطور لطیفہ کے فرمایا ۱۲) جواب وہی ہے کہ ان اشیاء کا دخول جہنم قصور کی وجہ سے نہ ہوگا اور سمیت بلا قصد کوئی قصور نہیں ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی۔ بلکہ ان کو کفار کی حسرت بڑھانے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا تا کہ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا اور جہنم میں کسی کا ہونا اس کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ غرض عشاق اگر جہنم میں بھیج بھی دیئے جائیں تو ان کا دوزخ میں جانا اس طرح کا ہو گا۔ معذبین کی طرح نہ ہوگا۔ دیکھو جیل خانہ میں جانا ایک تو مجرم کا ہے اور ایک جیلر کا اور ایک ڈاکٹر کا جانا ہے جو مجرموں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے۔ کیا سب کا جانا برابر ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حیثیات کا فرق موجود ہے۔ گو بظاہر سب جیل خانہ ہی میں ہیں۔ مگر ڈاکٹر اور جیلر گورنمنٹ کے مقرب ہیں اور مجرم معتب ہیں یہی فرق حیثیات دخول جہنم میں بھی کیوں نہیں مانتے۔ آخر معقول کس لئے پڑھی تھی کیا ماکول بنانے کے لئے پڑھی تھی۔ صاحب اس سے کام لو تو پھر کچھ بھی اشکال نہیں۔ اسی فرق حیثیات سے ایک اور اشکال رفع ہوتا وہ یہ کہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ رضا بالقضاء واجب ہے اور دوسرا مسئلہ ہے کہ خیر و شب سب قضاء و قدر کے تابع ہیں تو کفر بھی قضاء سے ہے اور تیسرا مسئلہ ہے کہ رضا بالکفر کفر ہے تو اب رضا بالقضاء کیونکر ہوا اگر ہر قضاء کے ساتھ رضا لازم ہے تو پھر کفر سے رضا لازم ہوگی حالانکہ رضا بالکفر کفر ہے اس کا ایک جواب تو علماء ظاہر نے دیا ہے کہ قضاء کے ساتھ تو رضا لازم ہے مگر مقضی کے ساتھ لازم نہیں اور کفر مقضی ہے قضاء نہیں تو رضا بالکفر اس لئے کفر ہے کہ اس میں رضا بالمقضی ہے اور رضا بالمقضی مطلقاً واجب بلکہ جائز بھی نہیں بلکہ اگر مقضی خیر ہے تو رضا واجب ہے اور اگر شر ہے تو جائز نہیں مگر اس جواب میں بہت تکلف ہے۔ عارفین نے اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ رضا بالکفر میں حیثیات کا فرق ہے یعنی ایک حیثیت تو کفر میں صدور عن العبد کی ہے اور اس درجہ میں یہ شرمخص ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا کفر ہے اور ایک حیثیت مخلوقیہ الحق کی ہے یعنی وہ حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس درجہ میں وہ حکمتوں کو متضمن ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا واجب ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مکسوب للعبد ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا جائز نہیں اور مخلوق للحق ہونے کی حیثیت

سے اس پر رضا واجب ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست
گر بما نسبت کنی کفر آفت است

کفر اس کی مخلوق ہونے کی بناء پر سراسر حکمت ہے اور کفر بندے سے سرزد ہونے کی بناء پر سراسر آفت ہے۔
اور عارف فرماتے ہیں

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرہ بسوزد گر بولہب نباشد
دنیا میں کفر کا ہونا بھی ضروری ہے اگر کوڑا کرکٹ نہ ہو تو آگ کس طرح روشن ہو؟ اگر بولہب جیسے کافر نہ
ہوتے تو آگ کسے جلاتی۔

یعنی حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں بھی حکمتیں ہیں کہ اس سے صفت قہر و جلال
اسم منتقم کا ظہور ہوتا ہے۔ نیز اس سے مسلمان اور مؤمنین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اضمحلال ہی سے اشیاء کا
ظہور کامل ہوتا ہے نیز اس سے کارخانہ دنیا کی رونق اور ترقی ہے کیونکہ دنیا میں پوری ترقی کافر ہی کر سکتا ہے
جس کو آخرت کی تجھ کو بھی فکر نہیں۔ مسلمان چونکہ آخرت کی فکر میں رہتا ہے وہ دنیا میں پوری طرح منہمک نہیں
ہو سکتا۔ پھر یہ ریل کار، قسم قسم کی نئی ایجادیں کیونکر ظاہر ہوتیں تو خدا تعالیٰ نے جو کفر کو پیدا کیا اس میں بہت
حکمتیں ہوئیں اور بندہ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں کوئی حکمت نہیں کیونکہ جو شخص کفر کر رہا
ہے اس کا اپنے کفر سے کیا نفع ہے کچھ بھی نہیں بلکہ اس کا تو ضرر ہی ضرر ہے گو اس کے ضرر سے مجموعہ عالم کا نفع
ہے مگر خاص اس کا تو سراپا ضرر ہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا باغی ہو گیا۔ پس کفر اس حیثیت سے کہ خدا کا پیدا کیا ہوا
ہے اس کے ساتھ رضا لازم چنانچہ اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو کیوں پیدا کیا یہ پیدا کرنا برا ہوا یہ کفر
ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ بندہ کا فعل ہے اس کے ساتھ رضا کفر ہے مثلاً کوئی یہ کہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں
کافر ہو گیا تو یہ کفر ہے خوب سمجھ لو۔ (الوصل والفصل ماحقہ مواعظ تسلیم و رضا ص ۳۲۳-۳۲۴)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا

عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: اور ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین
(جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہیں۔

تفسیری نکات

ارض جنت

یہ وہ بات ہے جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی اور یہ وہ وقت تھا کہ
یونان نے ترکی حکومت کو شکست دے کر اڈریانوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں

کے دلوں میں اضطراب اور ترنزل آ گیا تھا اور ملاحدہ تو برملا کہنے لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے اسلام اور مسلمانوں کا حامی نہیں۔ اس پر دہلی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس قسم کے شبہات کا ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اس موضوع پر بیان ہوا جس میں اسی قسم کے شکوک و شبہات کا بہت خوبی کے ساتھ بحمد اللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ بیان پر بطور اتمام حجت کے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور وسوسہ ہو تو ظاہر کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد یوں کہا جائے کہ یہ بات من جانب اللہ اتمام حجت کے لئے میری زبان سے نکل گئی تھی۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کے ساتھ اعلان کرتا۔ اس پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہوں گے) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے مالک کفار ہو گئے ہیں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ ہے چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس بس میں سمجھ گیا۔ اب کچھ شبہ نہیں رہا حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے کفار کبھی مالک نہ ہوں گے بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہ روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق و سباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے۔ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے۔ اس پر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو۔

فرمایا کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ سے جو نصرت عباد صالحین معلوم ہوتی ہے وہ کسی دلیل سے دوامی نہیں ہے بلکہ اگر ایک بار بھی اس کا وقوع ہو گیا پیشین گوئی صادر ہو گئی اور یہ پیشین گوئی زبور میں امت محمدیہ کی نسبت ہے۔

جاہ کیلئے خواہش سلطنت مذموم ہے

احکام کی پابندی کے اختیار کئے ہوئے حکومت یا سلطنت کا حاصل کرنا ایسا ہے جیسے بلا وضو کے نماز پڑھنا یا بدوں منتر جانے ہوئے سانپ پکڑنا جس کا انجام ہلاکت ہے اور اگر بالفرض چندے یہاں حکومت کر بھی لی تو آخرت کی زندگی تو برباد ہو جائے گی اصل چیز تو وہی ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی اور وہ ایمان اور اعمال صالحہ ہیں ایمان کی حفاظت کرو اور اعمال صالحہ اختیار کرو پھر اس پر خوشخبری ہے بشارت ہے جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان الارض یرثها عباد الصالحون (اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے) یہ بیان تو ان کے لئے تھا جو جاہ کے لئے حکومت اور سلطنت کے خواہاں اور جو یاں ہیں باقی اہل اللہ اور

خاصان حق جن کو تم نظر تحقیر سے دیکھتے ہو کہ وہ خستہ حالت میں ہیں میلے کچیلے ہیں بے سرو سامانی ان کی رفیق ہے وہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے گو بضرورت سلطنت بھی حاصل کر لیں اور ان میں بھی کوشش کریں کہ اپنے کو اس سے علیحدہ رکھ کر دوسرے کے سپرد کر دیں اور اگر بادل نخواستہ ان کے ذمہ پڑ جاوے تو پھر اس کے پورے حقوق ادا کریں۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ یہی حضرات کچھ ساتھ لیجانے والے ہیں تم نے جن سامانوں کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے وہ تم ہی کو مبارک ہوں وہ تو ان سامانوں کو حجاب اور وبال جان خیال کرتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب باہان ارمنی کے دربار میں اپنے اسیروں کو چھڑانے کیلئے تشریف لے گئے تو آپ نے دربار کا فرش دیا اور حریر کا اٹھا کر پھینک دیا اور اس کے سوال پر جواب میں فرمایا کہ تیرے فرش سے ہمارے اللہ کا فرش افضل ہے۔ حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ جب آپ نے یہ آیت قرآن پاک کی سنی ”والارض فرشنہا“ (اور ہم نے زمین کو فرش بنایا ہے) اسی وقت اپنے پاؤں سے جوتے نکال کر پھینک دیئے کہ خدا کے فرش پر جوتے پہن کر چلنا خلاف ادب ہے (یہ غلبہ ہے حال کا جو خوبی ہے مگر حجت نہیں) اب سنئے کہ تمام چرند پرند کو حکم ہو گیا جس جس طرف بشرحانی کا گزر ہو کوئی بیٹ نہ کرنے پاویں۔ غرض ہماری عزت اس ظاہری سامان سے تھوڑا ہی ہے۔ اگر عزت ہے تو بے سرو سامانی ہی میں ہے جو عبدیت سے مسبب ہو اسی کو فرماتے ہیں۔

زیر بارند درخشاں کہ ثمر ہا دارند اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد
دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

(پھل دار درخت زیر بار رہتے ہیں مبارک ہو سرو کہ وہ تمام غموں سے آزاد ہے حسینان جہاں کو بناؤ سنگھار کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے محبوب کو جس خداداد حاصل ہے)

حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بادشاہ سخر نے ایک مرتبہ لکھ کر بھیجا معلوم ہوا کہ حضرت کے خدمت میں اکثر مجمع خدام کا رہتا ہے اگر اجازت ہو تو ایک ملک کا خدام کے لئے حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں حضرت نے جواب میں بھیجا۔

چوں چتر سخری رخ ختم سیاہ باد دردل اگر بود ہوس ملک سخرم
زانگہ کہ یافتہ خبر از ملک نیم شب من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

(اگر میرے دل میں ملک سخر کی ہوس ہو تو جس طرح سخر کا چتر سیاہ ہے میرا نصیب بھی سیاہ ہو اور جس وقت سے ملک نیم شب (یعنی عبادت نیم شبی) کی مجھے خبر ہوئی ہے میں تو ملک نیم روز کو ایک جو کے بدلے میں بھی نہ خریدوں)

ایک بزرگ کو کسی بادشاہ نے لکھا تھا کہ ہم مرغ کھاتے ہیں اور تم خشک روٹی ہم دیا اور حریر پہنتے ہیں اور تم گدڑی اوڑھتے ہو تم بڑی مصیبت میں اور تکلیف میں ہو تم ہمارے پاس آ جاؤ ہم تمہاری خدمت کریں گے

اور یہاں پر تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی ان بزرگ نے جواب میں لکھا۔

خوردن تو مرغ مسمی دے طعمہ مانا تک جوین ما
پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقة پشلمین سا
اور آخر میں فرمایا:

نیک ہمیں است کہ مے بگذرد راحت تو محنت دوشین ما
باش کہ تا طبل قیامت زند آن تو نیک آید و یارین ما

(الافاضات الیومیہ ص ۲۸ ج ۵)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں کے لئے (مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لئے

تفسیری نکات

شان رحمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید و توقیت نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ کفار کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں سبب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے جواب دیا کہ اگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو کفار کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگتا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ میں سب سے زیادہ عذاب میں ہوں۔ تو اس قلت سے ان کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں۔ مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص

ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین و کفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت و ایضاح حق ہے چنانچہ قرینہ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے۔

ان فی هذا البلاغاً اس میں کافی مضمون ہیں

لقوم عابدين ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت ایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رحمۃ للعالمین کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین سے مراد تمام مکلفین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین کے لئے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وما ارسلناک الا رحمة للعالمین یعنی نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر جہانوں کی رحمت کے واسطے۔ دیکھئے عالمین میں کوئی تخصیص انسان یا غیر انسان یا مسلمان یا غیر مسلمان کی نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہر شے کے لئے بار رحمت ہے۔ خواہ وہ جنس بشر سے ہو یا غیر جنس بشر سے اور خواہ حضور سیزمانہ متاخر ہو یا مقدم۔

متاخرین کے لئے رحمت ہونا تو بعید نہیں لیکن پہلوں پر رحمت ہونے کے لئے بھی حضور کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا اور وہ وجود نور کا ہے کہ حضور اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل و تربیت ہوتی رہی آخر زمانہ میں اس امت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گروتا باں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا۔ پس حضور اولاً آخراً تمام عالم کے لئے باعث رحمت ہیں۔ پس حضور کا وجود تمام نعمتوں کی اصل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہوا تو ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جو حضور کے وجود باوجود پر خوش نہ ہو یا شکر نہ کرے۔

سُورَةُ الْحَكِّ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمُتَرَانَّ اللَّهُ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ
وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ

ترجمہ: اے مخاطب کیا تجھ کو عقل سے یا مشاہدہ سے یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اپنی حالت کے مناسب سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کہ زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے (تو) آدمی بھی۔

تفسیری نکات

ارض وسموات، شمس و قمر وغیرہ سب مطیع ہیں

الم تر ان الله يسجد له من في السموات و من في الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب وكثير من الناس اگر ان سے عصیان ہوتا بوجہ اس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی نسبت ہے اور یہ مکلف ہیں اس لئے ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصیان نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے سموات وارض وشمس وقمر ودواب سب کے متعلق بلا استثناء کے يسجد له فرمایا ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس میں تو بعض مطیع اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس و جن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ جن کو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے

کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ میں لوگ صرف انس و جن کو کہتے ہیں غرض انس و جن میں تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار بعض نافرمان اور جو ان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں لہذا شمس و قمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اس کے خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہا تھا کہ یہ بھی معذب ہوں گے اور سبب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوئی ہیں وہ بھی معذب ہونی چاہئیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بلا اختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تسبب بلا اختیار معصیت نہیں ہے۔ فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے اسرار کو خوب سمجھا ہے گو بعض فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت و طریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جس میں تین وصف ہوں۔ فقیہ ہو محدث ہو صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوئی ہاں غیر محققین میں ہوئی ہے۔

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

غرض فقہاء نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بننا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوئی ہیں وہ معذب نہ ہوں گی۔

صورة تعذیب

البتہ اس میں کلام ہے کہ شمس و قمر آیا اپنی جگہ رہ کر جہنم میں ہوں گے یا ان کی اپنی جگہ سے ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جاوے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمس و قمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہے شمس زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہیے بایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینک دیئے جاویں گے مگر شیخ اکبر کا کشف ہے کہ شمس و قمر اپنی جگہ رہیں گے اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بٹ دیا جاوے گا یعنی جہنم کی آگ میں بٹ ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاوے گا تو اس کی حرارت پھیل جاوے گی جس سے سمندر و ہوا سب آگ بن جاویں گے حتیٰ کہ آسمان تک حرارت پہنچے گی جو آفتاب و قمر کو بھی محیط ہو جاوے گی اور آفتاب و قمر دونوں اس میں داخل ہوں گے یہ صورت ہوگی شمس و قمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ متجاوز ہو کر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہنچے گی اور وہاں بہت ہی لطیف ہو جائے گی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے میوے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن و حدیث نہ تائید ہی کرتا ہے اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے

کشفیات میں ہم شیخ اکبر کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزا نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ کے طور پر بیان کر دیا۔ بہر حال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ کوئی جہنم میں ہو اور معذب نہ ہو تو اس بناء پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں بھیج دیئے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہو چکیں گے پھر اس میں جگہ باقی رہ جاوے گی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اس میں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے ہل من مزید کہتی رہے گی اس کے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں ہونے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلا وجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کر کے اس میں صورۃ بھی داخل فرمائیں یہ عین رحمت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھ دیں گے تو وہ کہے گی بس بس اس حدیث کے معنی اول تو واللہ اعلم کہلائیں گے اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں کہنے کے قابل نہیں اسلم طریق یہی ہے۔

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابِ الْيَمِّ

ترجمہ: اور جو شخص اس میں (یعنی حرم میں) کوئی خلاف دین کام (قصداً کفر و شرک) کرے گا تو ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

تفسیری نکات

جس طرح مکہ میں طاعات کا ثواب اور مقامات سے زیادہ ہوتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی اور جگہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

مفسرین نے ومن یرد فیہ بالحد بظلم نذقہ من عذاب الیم

مکہ میں معاصی کا گناہ اور مقامات سے زیادہ ہے

کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ مکہ میں نیت معصیت پر بھی کامل مواخذہ ہوتا ہے اس لئے حاجی صاحب ہر شخص کو ہجرت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ دو قسم کے لوگوں کو ہجرت سے منع کرتے تھے ایک تو کئے دنیا داروں کو۔ کیونکہ یہ لوگ مکہ کے حقوق کیا ادا کریں گے۔

دوسرے علماء اور مقتداؤں کو علماء کو اس لئے روکتے تھے کہ ان کی ہجرت سے ہندوستان تو بم پللیس ہو جائے گا۔ اگر سارے علماء مکہ چلے جائیں گے تو ہندوستان میں فیض کون پہنچائے گا۔ اس لئے گوان کا دل مکہ

جانے کو کتنا ہی چاہے اور یہ وہاں کے حقوق بھی ادا کر سکیں۔ مگر ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ضروری ہے بس قید خانہ ہی میں رہیں اور تڑپتے رہیں۔ ان کی یہی ہجرت ہے ان کو ہجرت کر کے مکہ جانا جائز نہیں جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ ہمارے جانے سے یہاں دین کا کام مختل ہو جائے گا۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کسی وقت جہاد کا موقع ہو تو عالم بلد کو جس کے سوا شہر میں کوئی عالم محقق نہ ہو۔ جہاد میں شرکت جائز نہیں اس کو اپنے گھر ہی پر رہنا چاہیے۔ آج کل لوگ تحریکات کو لئے پھرتے ہیں اور حدود کو نہیں دیکھتے۔

صاحبو! یہاں تو ہر کام کے لئے حدود ہیں۔ چنانچہ جہاد ہجرت کی ہر ایک کو اجازت نہیں۔ بلکہ اس کے لئے بھی حدود ہیں اگر یہ حدود نہ ہوتے اور ان اہل تحریکات کی طرح شریعت بھی بے اصولی سے کام لیتی تو نہ معلوم یہ دین کب کا فنا ہو گیا ہوتا۔ مگر شریعت کے قربان جائیے کہ اس نے ہر کام کے لئے حدود مقرر کر دی ہیں۔

وَإِذْ نَفَخْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَرَفَعْنَا فِيهَا ذُرُجًا مَّعْلُومَاتٍ ۖ

وَيَذْكُرُوا لِلَّهِ فِي الْأَيَّامِ الْمَعْلُومَاتِ ۖ

وَيَذْكُرُوا لِلَّهِ فِي الْأَيَّامِ الْمَعْلُومَاتِ ۖ

بُحَيْرَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَمْرَ الْفَقِيرِ ۚ

ترجمہ: اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیدل بھی دہلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے دینی و دنیوی فوائد کے آ موجود ہوں اور اس لئے آئیں گے تاکہ ایام مقررہ (ایام قربانی) میں ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں پس ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور محتاج کو بھی کھلایا کرو۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کا ایک بڑا انعام

اول ترجمہ و تفسیر کیا جاتا ہے اس کے بعد عام اجراء فضیلت پر اس کا انطباق بیان کر دیا جاوے گا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِذْ نَفَخْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَرَفَعْنَا فِيهَا ذُرُجًا مَّعْلُومَاتٍ ۖ

لوگوں میں پکار و حج کے واسطے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فرمان کی اس طرح تعمیل کی کہ پہاڑ پر کھڑے ہو کر پکارا کہ اے لوگو تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اس کا حج کرو حدیث میں آیا ہے کہ اس آواز کو تمام آسمان کے لوگوں نے سنا۔ بزرگوں نے کہا کہ جس نے خود یا اس کی روح نے لبیک کہا اس کو حج نصیب ہوتا اور جس نے نہیں کہا وہ نہیں جاتا آگے ارشاد ہے یا توک رجلاً و علی کل ضامر یعنی اس آواز دینے اور پکارنے کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ تمہارے پاس پیادہ اور ہر دہلی سواری پر آویں گے مطلب یہ ہے کہ بڑی بڑی دور سے آویں گے کہ آتے آتے جانور سواری کے دبلے ہو جاویں گے یا تین من کل فج عمیق آویں گی وہ سواریاں ہر راستہ دور دراز سے ایک حکایت یاد آئی کہ بوستان میں جو ہے حوالیہ من کل فج عمیق ایک میانجی نے اس کا ترجمہ یہ بتلایا تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد بڑی بڑی کھائیاں ہیں لیشہد و امنافع لہم تاکہ حاضر ہوں وہ اپنے منافع پر یعنی یہاں آکر ان کو کچھ منافع ہوں گے اور وہ منافع عام ہیں خواہ اخروی ہوں کہ ثواب ہوتا ہے اور یا دنیوی کہ حج کے اندر لوگ جمع ہوتے ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور بہت سے منافع دنیویہ اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی مارزقہم من بہیمۃ الانعام یعنی یہاں آنے پر دو غایتیں مرتب ہوں گی ایک تو منافع اخرویہ اور دنیویہ جس کا بیان لیشہد و امنافع لہم میں ہے اور دوسری یہ کہ اللہ کا نام ذکر کریں۔ چند ایام معلومہ میں ان اہلی جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر پس ان سے تم بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ ہر چند کہ یہاں ذکر حج کا ہے لیکن قربانی جس کے متعلق یہ آیتیں ہیں یہ تو عمل مشترک ہے اس لئے ان آیتوں سے مطلق قربانی کی فضیلت بھی مستنبط ہو سکتی ہے بہر حال یہ تو تفسیر تھی ان آیتوں کی اب وجوہ فضیلت کا استنباط سنئے علی مارزقہم من بہیمۃ الانعام میں اشارہ ہے اس عمل کی حقیقت جنسیہ و نوعیہ کی طرف اس لئے کہ جانور بدوں مال کے خرچ کئے ہوئے نہیں آتا اور ان پر اللہ کا نام لینے سے مراد ذبح کرنا ہے کہ جو اشارہ ہے حقیقت نوعیہ کی طرف فی ایام معلومات سے اس زمانہ کی فضیلت ثابت ہوئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جانے پہچانے دن فرمایا لیشہد و امنافع لہم سے مکان کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ حاضر ہونا مکان میں ہوتا ہے مشہود مکان ہونا اور شاہد زمان اس میں مشہور مکان کو شہود منافع سے تعبیر فرمایا ہے رہا بانی کا ذکر وہ اذن فی الناس میں ہے غایت کا ذکر لیشہد و امنافع لہم میں ہے کہ جو متضمن ہے نفع دنیوی و نفع اخروی کو اور علی مارزقہم سے اشارہ اس طرف ہے کہ باوجود ذبح ہونے کی بھی نسبت اس کو ہم سے یعنی ذاکسین سے قطع نہیں ہوئی چنانچہ آگے فکلوا منها واطعموا اس پر صاف دلیل ہے کہ وہ جانور ملک سے نکلتا نہیں ہے اور یہ اس واسطے فرمادیا تاکہ نفس اس بات پر مچلے نہیں اور اس کو سہولت نظر آتی رہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا شکر اگر اپنے انتفاع پر موقوف ہو تو آدمی کو

چاہیے کہ کھایا پیا کرے اور یذکروا اسم اللہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اللہ کا نام لینا نفع اخروی ہے مگر اس میں ایک نفع دنیوی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کا نام لینے سے جانور کے اندر حلت آ جاتی ہے اور وہ قربانی کے لائق ہو جاتا ہے اور یہاں سے ایک شبہ بھی دفعہ ہوتا ہے تقریر شبہ کی یہ ہے کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے کہ اس کی کیا وجہ ہے تمہارا مارا ہوا جانور تو حلال ہو اور اللہ کا مارا ہوا حرام ہو یعنی ذبیحہ حلال ہو اور مردار حرام اس کا جواب یہاں سے نکل آیا کہ ذبیحہ جو کھانے کے قابل ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہی کے نام کی برکت ہے پس دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے مارے ہوئے ہیں ہمارا مارا ہوا نہیں کیونکہ جان تو وہی نکالتا ہے باقی یہ فرق کہ ایک حلال اور ایک حرام تو وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا گیا ہے اس کی برکت سے اس میں حلت آ گئی اور وہاں نہیں لیا گیا اس لئے حرام رہی اور دوسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ ذبیحہ میں سے دم مسفوح جو منجس ہے نکل جاتا ہے اور مردار میں وہ خون تمام بدن میں سما جاتا ہے پس حلت دونوں باتوں کے مجموعہ کا یعنی ذکر اسم اللہ اور خروج دم مسفوح کا اثر ہے اور کلو ا سے یہ مسئلہ مستبط ہوتا ہے کہ غنی کو بھی کھانا جائز ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا انعام ہے جو بہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم کو عطا ہوا ہے ورنہ امم سابقہ میں یہ ہوتا تھا کہ قربانی کو ایک پہاڑ پر رکھ دیتے تھے ایک آگ آتی تھی جس کی قربانی کو اس نے جلا دیا وہ مقبول ہوتی تھی ورنہ مردود الحمد للہ کہ پانچوں وجہ فضائل کے قرآن مجید سے بھی صاف طور پر ثابت ہو گئیں میرا مقصود فضائل بیان کرنے سے یہ ہے کہ لوگوں کو قربانی کی حقیقت معلوم ہو جاوے اور اس کی طرف رغبت ہو باقی احکام اگر کسی کو دریافت کرنا ہو تو مدرسہ میں آ کر دریافت کر لے اب اس سننے کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ جن کے ذمہ واجب ہے وہ تو ضرور ہی کریں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کریں گے باقی جن کے ذمہ واجب نہیں لیکن وسعت اس قدر ہے کہ اگر ایک حصہ قربانی کا کر لیں تو اس زائد خرچ کی وجہ سے کسی حق واجب میں فرق نہ آوے وہ لوگ بھی مناسب ہے کہ کریں اس کی فضیلت ایسی ہے کہ اس کا چھوڑنا بہت بڑے نفع سے محروم رہنا ہے اور جس کو بالکل ہی وسعت نہ ہو وہ مجبور ہو اور غریب کو قربانی کرنے کا مناسب اور مستحب ہونا بھی اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ارشاد ہے کہ یا تو کرجالا کہ وہ تیرے پاس پیادہ آئیں گے اور ظاہر ہے کہ جو پیادہ آئے گا وہ غریب ہی ہوگا۔

اسلام کا حاصل

لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی مارزقہم من بہیمۃ الانعام تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے پاس یہ عام ہے خواہ منافع دینی ہوں یا دنیوی اور دینی منافع میں تو بہت بڑا نفع یہ ہے کہ وہاں طاعت کرنے کی کتنی بڑی فضیلت ہے اور دنیوی نفع یہ کہ بہت سی آبادی ہوگی اس میں تجارت کریں گے زراعت کریں گے اور بہت سے فائدے اٹھائیں گے مگر فرق اس مقام کی تجارت میں

اور یہاں کی تجارت میں یہ ہے کہ یہ الاعانة علی الدین (دین کی اعانت کی وجہ سے) ہونا چاہیے یعنی حج میں تجارت کا مال ساتھ لے جانے میں نیت یہ ہو کہ اگر مال ہوگا اطمینان رہے گا ورنہ پریشانی ہوگی۔ اور بھلا حج تو عبادت ہے اس میں دنیا کیا مقصود ہوتی جہاں کسب دنیا کا بھی ذکر ہے وہاں بھی اس کو مقصود نہیں ہونے دیا اس کے ساتھ ہی دین کے مقصود بنانے کا حکم دیا چنانچہ جمعہ کے باب میں جہاں فرما دیا۔

فاذا قضیت الصلوة فانشتر وافی الارض وابتغوا من فضل اللہ (پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے تو تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو)

اسی کے ساتھ یہ بھی فرما دیا۔

واذکروا اللہ كثيراً ”خوب کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔“

غرض دنیا محض کی کہیں بھی اجازت نہیں اور جب اسلام کا یہ حاصل ہے کہ اس میں دنیا محض ہے ہی نہیں تو مسلمان کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ ہم دنیا دار ہیں اصل دنیا دار تو صرف کافر ہی ہیں تم شرائع کا التزام کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو جب تم شرائع کا التزام کرتے ہو تو پھر دیندار ہو دنیا دار کہاں سے آئے۔

فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر پھر کھاؤ ان میں سے یہاں سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

تین بڑے اعمال

اب تک ابراہیم کو خطاب تھا مگر چونکہ وہ بھی بلا انکار تھا۔ اس لئے ہمیں بھی تھا یعنی ان میں سے تم بھی کھاؤ واطعموا البائس الفقیر اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھاؤ۔

یہ مطلب نہیں کہ اغنیاء کو مت کھاؤ و غنیاء کو بھی کھاؤ چنانچہ کلو سے یہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اگر کسی غنی نے قربانی کی تو وہ بھی کلو میں داخل ہے تو غنی کو بھی کھانا جائز ہوا تو اس کو کھانا بھی جائز ہوا بلکہ چاہے سب کھا لو کسب کو بھی مت کھاؤ نہ فقیر کو نہ غنی کو مگر مستحب وہی ہے۔

ثم لیقضوا تفثہم پھر اپنا میل کچیل دور کریں یعنی بال منڈائیں ناخن کٹائیں نہائیں دھوئیں بدن کو صاف کریں ولیوفوا نذرہم اور چاہیے کہ اپنی منتوں کو پورا کریں نذر سے مراد مطلق واجبات کہ وجوب میں مثل منذور کے ہیں ولیطوفوا بالبيت العتیق اس کو عتیق اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ معنق و محفوظ ہے جابرہ سے حق تعالیٰ نے اسے آزاد رکھا ہے یعنی اور چاہیے کہ بیت عتیق کا طواف کریں۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں تینوں عمل مذکور ہیں حج بھی قربانی بھی انفاق مال بھی۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعْظِمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوٰی الْقُلُوْبِ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: جو شخص دین خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

تفسیری نکات

علامات دین کی تعظیم کا سبب

خلاصہ پوری آیت کا یہ ہے کہ جو شخص علامات دینی یعنی اعمال کی تعظیم کرے گا یعنی ان کو موافق شریعت کے ادا کرے گا فانیہا یعنی یہ ان اعمال کی تعظیم من تقوی القلوب قلوب کے تقویٰ سے ناشی ہونے والی ہے یعنی یہ علامت ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف اس شخص کے دل میں ہے کیونکہ خوف خدا ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تعظیم شعائر اللہ کا باعث ہے۔ اگر کوئی کہے کہ حکومت سے بھی تعظیم شعائر کی متصور ہو سکتی ہے جواب یہ ہے کہ حکومت سے جو تعظیم ہوگی وہ صورت تعظیم ہوگی۔ تعظیم کی جو حقیقت ہے وہ نہ ہوگی۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نماز پڑھتے تھے لیکن اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ خدا ہم سے راضی ہو بلکہ یہ غرض تھی کہ مسلمان ہم سے راضی ہو جائیں۔ بتلائے کہ حکومت سے حقیقت کہاں پائی گئی پس جو کوئی تعظیم شعائر اللہ کرے گا وہ قلوب کے تقویٰ ہی سے ہوگی یعنی خوف خدا ہی اس کا منشا ہوگا کسی قاعدہ اور قانون اور ضابطے سے نہ ہوگی اور جملہ فانیہا من تقوی القلوب (یعنی ان کی تعظیم قلوب کے تقویٰ سے ہوتی ہے) قائم مقام جزا کے ہے اور اس جزاء کی علت ہے جزاء محذوف ہے اور جزا یہ ہے فانیہ متق قلبہ (اس کا قلب متقی ہے) یعنی جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے اس کا قلب متقی ہے کیونکہ یہ تعظیم تقویٰ ہی سے ہوتی ہے اور قلوب کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے ایک مسئلہ واضح ہو گیا وہ یہ کہ تقویٰ قلب کی صفت ہے چنانچہ حدیث شریف بھی ہے التقویٰ ہہنا و اشار الی صدرہ (یعنی تقویٰ اس جگہ سے اور آپ نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا) اور یہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض اپنے کو متقی جاننے سے متقی نہیں ہوتا جب تک قلب اضداد تقویٰ سے پاک نہ ہو۔ البتہ دوسروں کی نسبت تو یہ عمل چاہیے کہ

ہر کرا جامہ پارسا بنی پارسا بین و نیک مرد انگار

(جس شخص کو پارسائی لباس میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک مرد سمجھو لیکن اپنے کو متقی جاننا جیسا آج کل

مرض ہے یہ آفت ہے)

قاعدہ کلیہ

حق تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ جس میں قربانی وغیرہ کے تمام احکام داخل ہو گئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ذالک یہ مبتداء ہے خبر اس کی محذوف ہے یا خبر ہے مبتداء اس کا محذوف ہے مطلب اس جملہ کا قریب قریب اس کے ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بات گزشتہ تو ختم ہو گئی اب ایک اور بات سنو اس سے کلام سابق اور کلام لاحق میں فضل ہو جاتا ہے عربی میں اس غرض کے لئے مفید لفظ ذالک ہے اور دوسری کتب مؤلفہ و مصنفہ میں گویا ایسے الفاظ کم وارد ہوتے ہوں لیکن قرآن مجید کا طرز تصنیف و تالیف کا نہیں بلکہ محاورات و عادات کے موافق ہے مصنفین کا طرز دوسرا ہے۔ پس ارشاد ہے کہ دوسری بات سنو کہ جو شخص اللہ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کرے گا جزا آگے ہے۔

مفہوم شعائر

اول دو چیزیں سمجھنا چاہئیں اول یہ کہ شعائر کیا ہیں اور ان کی تعظیم کیا ہے شعائر بمعنی علامات اعمال ہیں دین کے۔ اس لئے کہ ان اعمال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دیندار ہے جیسے نماز حج وغیرہ۔ اگر کوئی کہے کہ صلوٰۃ تو خود دین ہے علامت دین کے کیا معنی؟ بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک صورت ہوا کرتی ہے اور ایک حقیقت اور وہ صورت علامت ہوتی ہے وجوہ حقیقت پر اسی طرح دین کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ مثلاً صلوٰۃ ارکان مخصوصہ اس کی صورت ہے اور حقیقت صلوٰۃ جدائش ہے جس کا تعلق زیادہ قلب سے ہے چنانچہ اگر ایمان و نیت نہ ہو۔ حقیقت نماز کی نہ پائی جائے گی اور ان دونوں کا تعلق ظاہر ہے کہ قلب سے ہے اسی طرح ہر عمل کو سمجھنا چاہیے۔ پس صورت دین اور شے ہے اور حقیقت دین سے آخر۔ اور یہ صورتیں اعمال کی علامات ہیں دین کی ان کو ہی شعائر فرمایا ہے پس مفہوم شعائر کا متعین ہو گیا۔

تعظیم شعائر

اب تعظیم شعائر کی حقیقت معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کیا ہے تعظیم شعائر یہ ہے کہ ان اعمال کا حق جس طرح شریعت مطہرہ نے حکم فرمایا ہے ادا کیا جائے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جو شخص اعمال دین موافق احکام الہیہ ادا کرے اب اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون عام ہے قربانی اور غیر قربانی سب اس میں داخل ہیں میں نے جو اول اس مضمون کے عموم کا دعویٰ کیا تھا وہ ثابت ہو گیا

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لَحْوْمُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ انکا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)

اہل ظاہر کی غلطی

صوفیوں کی یہاں بھی رعایت فرمائی کہ پہلے لن ینال اللہ میں اہل ظاہر کی غلطی بیان فرمائی اور غلطی بھی ایسی بلاغت سے بیان کی کہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

پھر دوسرے جملہ میں ولکن ینالہ التقویٰ قربانی کی حکمت واللہ کیا بیان کی اور اس تقویٰ کا مصداق اس سے اوپر ارشاد فرمایا ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقویٰ القلوب (جو شخص تعظیم کرے شعائر اللہ و احکام الہیہ کی تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے)

یعنی یہ تقویٰ تعظیم ہے شعائر اللہ و احکام الہیہ کی اس حکمت تعظیم شعائر اللہ۔

کی جامعیت پر نظر کر کے مجھے تو وہ شعر شریعت کی شان میں یاد آ جاتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد بہ رنگ اصحاب صورت را ابو ارباب معنی را
(اسکی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

قربانی کرنے والوں کی اقسام

یعنی عالمین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو قربانی کی حکمت سمجھ گئے ہیں دوسرے وہ جو حکمت نہیں سمجھے جو حکمت سمجھ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حکمت معلوم ہو جانے سے وقعت بڑھتی ہے حکم کی تو وہ یوں حکم کی تعظیم کریں گے اور جو حکمت نہیں سمجھے انہوں نے اتنی تعظیم کی کہ حکمت بھی نہ سمجھے اور پھر بھی کر ڈالا وہاں تو کسی درجہ میں رائے کا بھی دخل تھا یہاں کچھ بھی نہیں اگر کسی نے کہا کیوں کرتے ہو کہا حکم خدا کا۔

پس آیت ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقویٰ القلوب (جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر اور اس کے احکام کی تعظیم کرے تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے) میں روح بتلادی قربانی کی۔

روح قربانی

آگے اس آیت لن ینال اللہ میں فرماتے ہیں کہ اس روح یعنی تقویٰ خاص کی کہ تعظیم شعائر ہے بہت حفاظت کرو اور سمجھو کہ ذبح بالذات مقصود نہیں دیکھو وہاں نہ خون پہنچتا ہے نہ گوشت جو چیز مقصود ہے وہ البتہ پہنچتی ہے یعنی تقویٰ چنانچہ اگر یہ لحم و دم (گوشت و خون) مقصود ہوتا تو سارا جانور اٹھ کر چلا جایا کرتا۔ پس صرف ذبح کو مقصود

مت سمجھو خدا کے یہاں تقویٰ پہنچتا ہے اس کو دیکھو کہ اس ذبح کے ساتھ تقویٰ بھی مقترن (شامل) ہے جو کہ تعظیم شعائر اللہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح سے کہ تعظیم شعائر منجملہ تقویٰ ہے جب تعظیم بجالائے تقویٰ متحقق ہو گیا یا تقویٰ سے تعظیم شعائر اللہ پیدا ہوتی ہے ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح کہ تعظیم پیدا ہوتی ہے تقویٰ سے غرض جو چاہو کہو بقول حافظ۔

بخت اگر مدد کندا منش آدم بکف گر بکشد زہے طرب و ربکشم زہے شرف
(خوش قسمتی ہے اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہم کھینچ لیں تب بھی) سو تقویٰ ہر حال میں مقصود بالذبح ہوا۔

اور حضور فرماتے ہیں سینہ کی طرف اشارہ کر کے کہ یہاں ہے تقویٰ اور مافی الصدر (اندرون سینہ) باطن ہے پس معلوم ہوا کہ اس ظاہر کا ایک باطن بھی ہے اس کو حاصل کرو۔

شاید اس کو سن کر اہل باطن پھولتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ باطن ہی ہے جو کچھ ہے لہذا آگے ان کی غلطی بیان کرنے کے لئے ایک ظاہر کو فرماتے ہیں۔ کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ہداکم (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا ہے تاکہ قربانی کر کے اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ تم کو اس طرح قربانی کرنے کی توفیق دی) یعنی نرے تقویٰ کو کوئی نہیں پوچھے گا تقویٰ مطلق مقبول نہ ہوگا تقویٰ وہ قبول ہوگا جس کو قربانی سے تعلق ہو۔

حکمت تکبیر

یہاں نحر کا مفعول بھی ہو جس سے تکبیر کا فعل بھی متعلق ہو پس اس میں اچھی طرح سے ثابت کر دیا گیا کہ روح سے مراد وہی روح ہے جو اس قلب کے ساتھ ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ تم نعمت ہدایت و توفیق للذبح پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اس میں اللہ اکبر کہنے کی بھی حکمت بتلا دی کہ یہ دراصل شکر ہے اللہ کا کہ اللہ بہت بڑا ہے کہ اس نے توفیق دی کہ ہم حکم بجالا سکیں واقعی اگر خدا کی توفیق نہ ہوتی تو ترحم طبعی ہاتھ کو گردن پر نہیں چلنے دیتا جو ملحدین کے شبہ کے بنا تھی یعنی ذبح کا خلاف ترحم ہونے کے سبب مخالف حکم الہی ہونا ارشاد فرمایا کہ بعض جہلاء کے برتاؤ سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب میں جو چیز دی جاتی ہے وہی پہنچتی ہے چنانچہ بچے کے ثواب پہنچانے میں دودھ اور شہداء کربلا کے ثواب بخشنے میں شربت علی ہذا۔ سو کلام مجید میں اس کا رد صریح موجود ہے لن ینال اللہ لحومہا ولا دماءہا ولکن ینالہ التقویٰ منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ہداکم (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے اللہ کی بڑائی بیان کرو)

تکبیر تشریق

اس آیت میں لتکبر واللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب و اخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال و مدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہر چند کہ ظاہراً علی ما ہذا کم مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے علی ما ہذا کم من الذبح اللہ تعالیٰ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکالتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے مگر نیت درست نہ ہوتی تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو۔ پس یہ تفسیر ہے علی ما ہذا کم کی اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے چنانچہ ایک تو عید کا دو گانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائد بھی ہیں جن کا عددائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی ہے جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتمم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد با آواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ عید گاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے ۔

معنی تکبیر ایں ست اے امیم	کای خدا پیش تو ما قربان شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی	ہمچنین در ذبح نفس کشتنی
گوی اللہ اکبر و ایں شوم رام	سریر تادار ہد جاں از عنا
تن چو اسمعیل و جاں ہمچوں خلیل	کرد جاں تکبیر بر جسم بنیل

ہیچو اسمعیل پیشیش سربہ شادو و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

اور اگر تکبر اللہ کو جو کہ آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوٰتیہ وغیرہ صلوٰتیہ کیلئے عام لے لیا جاوے جیسا کہ واذکروا اللہ فی ایام معلودات میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالا جماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہوگی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہم کو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوٰتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی آیت شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن الخ میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ہدکم واقع ہے اس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس اذہر دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور اذہر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر جملہ سورہ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملہ سورہ حج کے مشتمل لصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے۔

پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی یہ تعبیریں ہیں نیت تقرب و اخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی یہ تعبیریں ہیں صلوٰۃ تکبیرات۔ تسمیہ علی الذبیحہ پس سامعین کو ان ایام میں دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کر لیا اور بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد زری گمراہی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا

عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿١٧﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ (نبوت میں شبہ نہ کرنے کے لئے) ایسے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا۔ اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کا دن امتداد میں) برابر ایک ہزار سال کے ہے تم لوگوں کے شمار کے موافق۔

تفسیری نکات

کذب اخبار میں ہوتا ہے

ایک مولوی صاحب کے جواب میں فرمایا کہ کذب اخبار میں ہوتا ہے انشاءات میں نہیں ہوتا اور وعید انشاء ہے اگر صیغہ اخبار کا بھی ہو وہ محض صورت ہے معنی انشاء ہی میں داخل ہے اسی سے بعض لوگوں نے کہہ دیا ولو خلافاً للجمہور کہ خلف فی الوعد وقوعاً بھی جائز ہے اور اس پر جو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ

قول بوقوع الکذب ہے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ کذب اخبار میں ہوتا ہے اور وعید صورتہ اخبار ہے ورنہ حقیقت میں انشاء ہے مگر جمہور کے لئے قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ يستعجلونک بالعذاب ولن يخلف الله وعده یہاں وعدہ سے مراد یقیناً ہے بقرینۃ ذکر العذاب تو قرآن کی نص سے خلف فی الوعد کا ممتنع ہونا معلوم ہو گیا۔

مقدار یوم بعث الف وخمسين الف میں تطبیق عجیب

سوال: سورہ حج میں روز حشر کی درازی اس طرح بیان فرمائی گئی ہے ان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون اور سورہ معارج میں ہے فی یوم کان مقداره خمسين الف سنة ان دونوں کی تطبیق بیان القرآن میں اس طرح ہے کہ کچھ امتداد کچھ اشتداد سے کفار اس قدر طول محسوس ہوگا اور چونکہ حسب تفاوت مراتب کفر اشتداد میں تفاوت ہوگا اس لئے ایک آیت میں کالف سنة آیا ہے آیت اولیٰ کیلئے پہلی آیت میں عند ربک یہ بتا رہا ہے کہ اس دن کا طول واقعی اتنا ہے یا کم از کم اللہ کے نزدیک اتنا ہے جتنا تم لوگوں کو شمار میں ایک ہزار برس کا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس دن کی مقدار ہی اتنی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ واقعی مقدار اس کی کچھ اور ہے امتداد و اشتداد حسب تفاوت مراتب کفر کی وجہ سے وہ ہزار برس معلوم ہونگے کیونکہ عند ربک اس کا قرینہ ہے ورنہ عند الکفار یا مثل ذلک کوئی اور لفظ ہوتا اور اس کی تائید حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث کے کلام سے بھی ہوتی ہے وہ ازالۃ الخفاء میں اس حدیث کی شرح میں کہ میری امت کو نصف یوم کی مہلت دی گئی (او کمال قال) تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عباسیوں کی خلافت ہے جو پورے پانچ سو سال رہی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے اور پانچ سو سال اس کے نصف۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ الف سنہ سے واقعی الف سنہ مراد ہیں نہ کہ اعتباری الف سنہ۔ اب میں کہتا ہوں اسی طرح کسان مقدارہ خمسين الف سنة میں فعل ناقص ماضی لایا گیا ہے جو باعتبار زمانہ کے نہیں بلکہ باعتبار تیقن وقوع فی المستقبل کے ہے اور یہاں نفس وقوع کا تیقن نہیں دلایا گیا ہے اس لئے یہاں بھی واقعی خمسين مراد ہیں نہ کہ اعتباری خمسين پھر اگر اعتباری ہوتا اس کے لئے عدد کا ذکر کیوں ہوتا کوئی اور لفظ ہوتا جو اس کے امتداد و طول پر دلالت کرتا مثلاً کان مقدارہ طویلاً او ممتداً او مثل ذلک اور اگر یہ کہا جاوے کہ الف سنہ کے ساتھ مما تعدون کی قید ہے اور یہاں قید نہیں ہے اس لئے تعارض نہیں ہے یعنی وہاں کے ایک ہزار برس سے مراد تمہارے ایک ہزار سال ہیں اور یہاں پچاس ہزار سے کوئی اور حساب مراد ہے جو اسی ایک ہزار کے مساوی ہے مگر جب ایک ہی دن کی مقدار بیان کی جا رہی ہے اور ایک جگہ اس میں مما تعدون کی قید ہے اور دوسری جگہ نہیں کیوں نہ سمجھا جاوے کہ وہی قید یہاں بھی ہے خاص کر اس حالت میں کہ مخاطب بھی ایک ہی ہے پھر کوئی

وجہ نہیں کہ ایک جگہ تو مخاطب کے اعداد کا شمار ہے اور ایک جگہ کسی اور عالم کے اعداد کا اگر خمسين اعتباری مانا جاوے جیسا کہ حضور والا اشارہ ہے تو شاید اس کی تائید اس سے ہو کہ سورہ معارج مکیہ ہے اور وہاں کے لوگوں کا عندا دوسر کسی زائد تھی اس لئے انہیں خمسين معلوم ہوا اور سورہ حج مدنی ہے وہاں اس چیز میں کمی تھی اس لئے انہیں الف سنتہ معلوم ہوا مگر سب نکات ہیں ان سے نہ تسکین ہوتی ہے اور نہ سکوت۔ دل کسی قوی بات کا جو یاں ہے۔ کیونکہ یوں تو تمام عذاب میں یہ شبہ ہوگا کہ واقعی کچھ اور ہے اور امتداد و اشتداد کے تفاوت سے فرق اعتباری پیدا ہو گیا۔

الجواب: عند ربک قید نسبت بین الموضوع والحمول کی نہیں ہے تاکہ اس کا یہ مدلول ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یعنی واقع میں ہزار برس کا ہوگا بلکہ یہ قید یوما کی ہے یعنی وہ دن جو تمہارے رب کے پاس کا ہے یعنی آخرت کا دن محاورہ قرآن میں آخرت کی چیزوں کو عند الرب کہا گیا ہے جیسے لہم اجرہم عند ربہم رہا یہ کہ وہ واقع میں کتنا بڑا ہوگا قرآن اس سے ساکت ہے باقی تشبیہ اس کی الف سنتہ کے ساتھ اس میں خود دو احتمال ہیں کہ وجہ تشبیہ امتداد ہے یا استداد کما اشرت الیہ فی بیان القرآن البتہ حدیث ظاہر اس پر دال ہے کہ اس کی مقدار واقع میں ہزار برس ہوگی مگر بیان القرآن سے اس کو تعارض نہیں کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بعض کو مقدار واقعی کی برابر معلوم ہوگا بعض کو زیادہ رہا یہ کہ جب واقعی مقدار کی برابر معلوم ہوا تو اس میں کفر کا کیا دخل۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کفر نہ ہوتا تو حسب حدیث مذکور فی بیان القرآن ایسا خفیف معلوم ہوتا جیسا فرض نماز کا وقت اب رہی دوسری آیت کان مقدارہ خمسين الف سنة سواں میں بھی نصاً کوئی دلالت واقعی مقدار پر نہیں اور جو وجہ دلالت کی سوال میں مذکور ہے وہ مسلم نہیں کیونکہ اگر قرآن کی عبارت یوں ہوتی کان مقدارہ فی اعینہم خمسين الف سنة تو کیا اس وقت یہ کلام صحیح نہ ہوتا اور کیا آیت کے اجزاء میں تعارض ہوتا کہ کان مقدارہ خمسين الف سنة میں فعل ناقص ماضی لایا گیا ہے الی قولہ اس کی مقدار کا تیقن دلایا گیا ہے جس کا مقتضی یہ ہے کہ مقدار واقعی ہے اور فی اعینہم کا مقتضی اس کے خلاف ہے اسی طرح سے آیت کے اجزاء میں تعارض ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ کان کا یہ مقتضا نہیں ہے اور کلام بھی صحیح ہے جیسے آیت فتنۃ تقاتل فی سبیل اللہ واخری کافرة یرونہم مثلہم رای العین۔ علی التفسیر المشہور اور آیت واذ یریکموہم اذا التقیتم فی اعینکم قلیلاً ویقللکم فی اعینہم الا یت البتہ اگر کوئی دلیل معارض نہ ہوتی تو یہ آیت ظاہراً مقدار واقعی پر دال ہوتی مگر جب دوسری آیت معارض ہے تو ظاہر کو ترک کر کے خلاف ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوگا جب کہ اس حمل سے کوئی امر مانع بھی نہیں رہا یہ کہ سب نصوص میں ایسا ہی شبہ خیالی ہونے کا ہو جاوے گا سو ظاہر کو بدوں دلیل چھوڑنا جائز نہیں یہاں دلیل ہے اور نصوص میں دلیل نہیں فہستان مابینہا ایسے ہی ظاہر کو دلیل سے چھوڑنے کی اور بھی نظائر ہیں کقولہ تعالیٰ فی

قصہ ذی القرنین و جدھا تغرب فی عین حمئة و وجدھا قوما. وجدان کا مادہ دو جگہ آیا ہے مگر اول وجد کو خیال پر محمول کیا جاتا ہے دوسرے کو واقعہ پر اول سے دوسرے میں شبہ واقعی نہیں ہوتا اور یہاں تک ضابطہ کا جواب ہو گیا اب تبرعاً ایک دوسرا جواب دیتا ہے جس میں دونوں آیتوں میں واقعیت محفوظ رہے وہ یہ کہ دنیا میں جس طرح معدل النہار کی حرکت یومیہ کسی مقام پر دو لابی ہے کہیں جمالی کہیں روحی اور اس اختلاف سے کہیں دن رات کا مجموعہ چوبیس گھنٹہ کا ہوتا ہے کہیں برس روز کا جیسے عرض تسعین میں کہیں ان کے درمیان مختلف مقادیر پر اور سب واقعی ہیں اور یوم نام ہے مابین الطلوع والغروب کا پس جو شخص استواء پر ہے اس کے افق پر جتنے زمانہ میں تین سو بار سے زیادہ طلوع وغروب ہو چکتا ہے اس زمانہ میں عرض تسعین والے افق پر ایک بار طلوع وغروب ہوتا ہے پس یہ دوسرا شخص برس روز کے زمانہ کو ایک لیل ونہار کہتا ہے اور پہلا شخص چوبیس گھنٹہ کو ایک لیل ونہار کہتا ہے اور دونوں صحیح ہیں مگر یہاں دونوں شخصوں کا دوافق پر ہونا شرط ہے اگر آخرت میں بھی ایسا ہی ہو کہ اس کے طلوع وغروب میں ایک افق پر بوجہ بطور حرکت ایک ہزار برس کا فاصلہ ہو اور اس کے واقعات اسی میں طے ہو جاویں اور ایک افق پر اسی طلوع وغروب میں پچاس ہزار برس کا فاصلہ ہو اور اس کے معاملات میں طے ہوں اور کچھ آفاق پر ان دونوں مدتوں کے درمیان میں وہ طلوع وغروب ہو مگر وہاں ان لوگوں کا جدا جدا افق پر ہونا شرط نہ ہو اس میں کوئی استحالہ نہیں اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ واقع میں وہ طلوع وغروب مختلف آفاق پر ہوگا جیسے دنیا میں اگر بطور خرق عادت کے خط استواء پر دو شخصوں میں سے ایک کو اپنا افق منکشف ہو جاوے دوسرے پر اپنا افق مستور ہو جاوے اور عرض تسعین منکشف ہو جاوے تو ایک کا یوم چوبیس گھنٹہ کا ہو جاوے گا دوسرے کا برس روز کا اور دونوں واقعی ہیں مگر یہاں ایسے خارق کا وقوع کم ہوتا ہے وہاں ہر چیز خارق ہی ہوگی اس لئے یہاں کسی امر کا مستبعد ہونا وہاں بھی اس کے مستبعد ہونے کو مستلزم نہیں خوب سمجھ لو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایک قسم کے لوگوں کے آفاق مختلف ہوں یعنی ایک جماعت کا افق وہ ہو جہاں ایک ہزار برس کا دن ہو اور دوسری جماعت کا وہ افق ہو جہاں پچاس ہزار برس کا دن ہو اور کچھ جماعتیں ان کے درمیان ہوں تو اس میں خرق عادت کی بھی ضرورت نہیں صرف بطور حرکت شمس میں مثلاً خرق عادت ہوگا اور یہ سب اس اشکال کا جواب ہے جو کسی خاص تفسیر پر واقع ہوتا ہے اگر دوسری تفسیر اختیار کر لی جاوے تو اصل سے یہ اشکال ہی واقع نہیں ہوتا چنانچہ درمنثور میں دوسری تفاسیر بھی منقول ہیں پس قرآن پر اشکال کے وقوع کا شبہ نہ کیا جاوے۔ واللہ اعلم (ماخوذ از بوادر النوار)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى

أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ

ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ لَيْتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ ڈالا پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جوابات قاطعہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب علم والا حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ قرآن شریف کی آیت اذاتمنی القی الشیطان فی امنیته سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شیطان کے وسوسہ کا اثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے وسوسہ کی وجہ سے آپ نے قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو پڑھ دیا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوا کہ حضور کے وحی سنانے کے وقت شیطان نے کچھ اپنی طرف سے القا کیا۔ باقی یہ بات کہ یہ القاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ہوا۔ یا سامعین کے کانوں پر اس آیت سے نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ القاء لوگوں کے کانوں پر ہوا ہو۔ یعنی لوگوں نے یہ کلمات سنے ہوں۔ اگرچہ حضور کی زبان سے نہ نکلے ہوں اور پھر خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں سے مٹا دیا ہو۔ جیسا ارشاد ہے فینسخ اللہ ما یلقى الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا نَسَكَاهُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُكَ فِي الْأَمْرِ

وَأَدْعُ إِلَى رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٧﴾

ترجمہ: جتنی امتیں (اہل شرائع گزری ہیں) ہم نے (ان میں) ہر امت کے واسطے ذبح کرنے کا طریقہ مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریق پر ذبح کیا کرتے تھے سو ان معترض لوگوں کو چاہیے کہ آپ سے اس امر (ذبح) میں جھگڑانہ کیا کریں اور آپ (ان کو) اپنے رب (یعنی اس کے دین) کی طرف بلاتے رہیے (کیونکہ) آپ یقیناً صحیح راستے پر ہیں۔

تفسیری نکات صلح کا حاصل

فرمایا کہ ایک درویش سے میری گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس آیت کا ترجمہ کیا جاوے لکل امة جعلنا منسكاہم ناسكوه فلا ينازعنك في الامر مقصود یہ تھا کہ اس آیت میں کسی سے نزاع کرنے کی ممانعت ہے یعنی کوئی کسی سے تعرض نہ کرے جو صلح کا حاصل ہے میں نے کہا کہ لاینازعنك فرمایا ہے لاتنازعہم نہیں فرمایا تو اہل باطل کو اہل حق سے جھگڑا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ جھگڑنے سے منع نہیں فرمایا اس پر شاہ صاحب خاموش رہ گئے۔

فلا ينازعنك في الامر (الحج آیت نمبر ۶۷)
سوان لوگوں کو چاہیے کہ اس امر میں آپ سے جھگڑانہ کریں

اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کی اجازت نہیں

فرمایا چنانچہ میں ایک دفعہ آلہ آباد گیا تھا والد صاحب کی بیمار پرسی کے لئے وہاں ایک درویش تھے والد صاحب ان کے پاس مجھے لے گئے۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتاؤ لکل امة جعلنا منسكاہم ناسكوه فلا ينازعنك في الامر میں نے ترجمہ کر دیا تو کہنے لگے دیکھو حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں۔ موسیٰ بدیں عیسیٰ بدیں جو جس کے جی میں آوے کرے ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی یہ تفسیر کی۔ انہوں نے ان کو جواب دیا میں نے کہا حق تعالیٰ نے لاینازعہم فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لاتنازعہم نہیں کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں بلکہ آپ کے لئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں وادع الی ربك انك لعلی ہدی مستقیم یعنی

دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو باطل پر تھے حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراطِ مستقیم پر تھے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعات کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیت کا یہ ہے کہ آپ صراطِ مستقیم پر ہیں آپ کو تو حق ہے منازعتِ صوری یعنی دعوت کا مگر ان کا حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں میں نے کہا کہ اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گزریں لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لایناز عنک کا مطلب لامناز ہم لکھ دیا کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں۔ یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ تھی۔ ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا کہ منازعت دعوت اور ہے اگر منازعتِ حقیقیہ سے ممانعت ہے تو دعوت سے ممانعت نہیں پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کر دیا کرو مگر غضب تو ہے کہ آجکل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے بلکہ سب کے ساتھ صلح وکل ہو کر رہے وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں (آداب التلبیغ ص ۲۶۶)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ

إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمُّكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۚ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى

النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ

مَوْلَاكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۚ

ترجمہ: اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی تم اپنے باپ ابراہیم کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو۔ اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے (نزول قرآن سے) پہلے ہی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں اور (اس شہادت رسول کے قبل) تم لوگوں کے مقابلے میں گواہ (تجويز) ہو سو تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمہارا کارساز ہے (کسی کی مخالفت تم کو حقیقتاً ضرر نہ کرے گی) سو کیا اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار ہے۔

تفسیری نکات

دین اور دشواری

سوا یک جواب تو معروض ہو چکا کہ اگر دشواری بھی ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہیے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ **ما جعل علیکم فی الدین من حرج** (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی) اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں۔ آخر خدا ہیں نا۔ اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا یہاں ایک دم سے نہایت پر زور لہجہ میں حرج کی نفی فرمادی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجینئر جو ثقیل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لا پرواہی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جائے گا اور خدا کی بڑی شان ہے ان کو وجہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے اسرار و نکات اور وجوہ نہیں لایا کرتے ہاں کبھی اس کے پرزے بھی بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے بھی کہیں کہیں بیان کئے ہیں اس لئے محققین نے کہا ہے کہ

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔ بخلاف غیر محقق کے کہ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہنچتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا۔ پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو جواب سے نیچے ہو کہ جواب تک نہ پہنچا ہو یا اوپر ہو کہ اس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے پس خدا تعالیٰ کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے۔

جیسے ایک تو طبیب کہے کہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خبردار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکومت بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے۔ تو حق تعالیٰ حاکمانہ فرماتے ہیں **ما جعل علیکم فی الدین من حرج** (نہیں کی تم پر دین کی تنگی) تو اصل میں مجھے اس کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک

ایسا جملہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے۔

اسرار شریعت

وہ جملہ یہ ہے ہوا اجتباکم کہ اس نے تم کو مخصوص بنالیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے۔ دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہاں پہنچنے لگتا ہے جہاں پہنچانا مقصود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ بنو اگر کہو کہ خدا نے مجتبیٰ بنالیا۔ چنانچہ ہو اجتباکم کا یہی ترجمہ ہے۔ ہم کو کیا ضرر ہے تو سبحان اللہ! اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت کی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا۔ اس نے تو تمہارے لئے سامان کیا ہے۔ باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجتباء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی تم اس کو حاصل کرو۔

ملت ابراہیمی دراصل ملت محمدیہ ہی ہے

واتبع ملتہ ابراہیم یعنی وہ ملت جو ہم نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے اور جو موافق ہے ملت ابراہیمی کے وہ دراصل ملت محمدیہ ﷺ ہی ہے معنی یہ ہیں کہ اس ملت کا اتباع کیجیو! جو ہم نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے۔ جو دراصل تو ہے ملت محمدیہ ﷺ ہی لیکن اس کا لقب بوجہ موافق کے ملت ابراہیم ہے ورنہ بظاہر اس میں یہ اشکال تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا حکم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ واتبع ابراہیم حنیفا نہیں فرمایا جیسے فاتبعونی یحببکم اللہ میں فاتبعوا طریقہ نہیں فرمایا۔ یہاں طریق کا لفظ نہیں بڑھایا گیا۔ دیکھئے! ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں فہداهم اقتدہ یہ نہیں فرمایا فہدم اقتدہ کیونکہ ایک تو ان کا اقتدا ہے اور ان کے ہدایا کا اقتداء ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ جو ہدایت حضور کو عطا ہوئی اتباع اسی کا ہے اس کو ہدایہم سے تعبیر فرمایا۔

مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر ایک آزادی کی شان۔ ناز کی شان، جوش و خروش کی حمیت غیرت یہ مضمون بہت ہے اور نسبت عیسویہ میں زہد اور ترک دنیا کا غلبہ۔ تعلقات کی کمی وغیرہ کا مضمون بہت ہے اور حضور ﷺ میں سب شیون کامل ہیں۔

سورة المؤمنون

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝

ترجمہ: متحقق مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں ۱۲

تفسیری نکات

خشوع لوازم ایمان سے ہے

پس جب ایمان کے لوازم سے خشوع ہے تو نبوت کے لوازم سے بدرجہ اولیٰ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق تھا نہیں۔ معلوم ہوا کہ خشوع اور حضور قلب اور شے ہے اور استغراق اور شے ہے اور اگر دونوں ایک ہی ہوں تو اجتماع نقیضین (دو ضدوں کا جمع ہو جانا ۱۲) لازم آئے گا۔ کیونکہ باقتضائے آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں خشوع ہے اور بدالالت حدیث استغراق نہیں اگر یہ دونوں ایک ہی شے سے ہوتے تو ایک ہی شے کا ہونا اور نہ ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے جو لوگ غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ خشوع و استغراق ایک ہی شے ہے اور خشوع ہے روح صلوة تو استغراق بھی روح صلوة ہے اور جب استغراق نہیں تو روح نہیں جب روح نہیں تو بے روح کی نماز کس کام کی تو یہ سمجھے کہ ہماری نماز بے قدر ہے کہ اس میں استغراق نہیں۔ حالانکہ ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ استغراق اور شے ہے اور وہ روح صلوة نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز بھی بے روح ہو۔

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور باوجود دینے کے ان کے دل سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔ یہ لوگ (البتہ) اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

پابندی صوم و صلوٰۃ کے باوجود خشیت خداوندی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو گناہ کر کے ڈرتے ہیں؟

فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تصدق اور صلوٰۃ و صیام بجالا کر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہوں اور خدا کے سامنے جا کر ہم کو شرمندگی ہو (وہاں یہ کہا جائے کہ تم نے کیا عمل ہمارے ہاں بھیجا)

حضرت عائشہ کے سوال سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطاء مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جیسی تو انہوں نے اس کو اعمال گناہ پر محمول کیا۔ اور بعض لوگوں نے اس میں یوں کہا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ سوال یاتون کی قراءت کے متعلق کیا ہے جو بمعنی یفعلون ہے اس صورت میں ایفاء سے استدلال ثابت نہ ہوگا کیونکہ ترمذی کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ یؤتون کے متعلق سوال کیا اور قراءت شاذہ بوجہ شذوذ کے ثابت نہیں اور یہ حدیث صحیح ہے پس صحیح کو غیر صحیح پر محمول نہیں کر سکتے اور ان کو مان بھی لیا جاوے۔ تب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر عام ہونا ضروری ہے ورنہ شاذ کا مفسر اور متواتر کا غیر مفسر رہنا لازم آوے گا تو اس تفسیر کا تعلق ایفاء سے بھی ہوگا۔ پس یہ استدلال باقی رہا۔ جب یہ ہے تو آیت میں ایفاء بمعنی ایفاء مال نہیں ہے بلکہ بمعنی ایفاء الوجود ہے جس کا حاصل ایجاد ہے۔

معنی یہ ہوئے کہ وہ جس عمل صالح کو وجود دیتے ہیں اس کو کر کے ڈرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے قبول ہوایا نہیں بے فکر نہیں ہو جاتے تو یہاں لفظ ایفاء بمعنی اعطاء ہے جو تجارت کے مناسب ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۚ لَعَلِّي

أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ

وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۚ

ترجمہ: اے میرے رب مجھ کو (دنیا میں) واپس بھیج دیجئے تاکہ (جس دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں (پھر جا کر) نیک کام کروں ہرگز (ایسا) نہیں ہوگا۔ یہ اس کی ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جا رہا ہے اور ان لوگوں کے آگے ایک چیز آڑ کی آنے والی ہے (مراد اس سے موت ہے) قیامت کے دن تک۔

تفسیری نکات

قیامت کے دن تک

کسی مردہ روح کا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کسی پر آنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گو بعض آثار سے ایسا شبہ ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن میں ہے کافر بعد موت کہتا ہے رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلانہا کلمۃ ہو قائلہا و من ورائہم برزخ الی یوم یبعثون اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آنے کی تمنا ہوتی ہے۔ لیکن برزخ یعنی حائل دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تنعم میں مردہ ہے تو اسے یہاں یہاں آ کر لینے پھرنے کی ضرورت کیا ہے اور اگر معذب ہے تو فرشتگان عذاب کیونکر چھوڑ سکتے ہیں کہ دوسروں کو لپٹتا پھرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہو جس کا لوگوں پر اثر ہوتا ہو اور جس شخص پر مسلط تھا اسی کا نام لے دیتا ہو اور ممکن ہے کہ دوسرا کوئی شیطان ہو اور شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے یجری من الانسان مجری الدم اور کما قال غریکہ جنوں اور شیطین کا اثر کہ وہ بھی شریر جن میں ہیں ہوتا ہے اور مردہ روحوں کا اثر جیسا کہ مشہور ہے صحیح نہیں اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لئے ارواح کا آنا ضروری نہیں دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے۔ جواب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے لیکن جب تک اس کی قوی دلیل نہ ہو اس احتمال کو قبول نہیں کیا جاسکتا محض امکان کافی نہیں۔

حق سبحانہ و تعالیٰ کیلئے صیغہ واحد کا استعمال خلاف ادب نہیں

حق تعالیٰ کا ادب سب سے زیادہ ضروری ہے مگر پھر بھی صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کی جناب میں خلاف ادب نہیں کیونکہ عرف ہو گیا ہے اور عرف میں اللہ تعالیٰ کے لئے صیغہ واحد غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں توحید پر زیادہ دلالت ہے اور صیغہ جمع میں توحید کی صراحت نہیں۔

مگر مجھے اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے صیغہ جمع کے استعمال کی عادت ہو گئی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ یونہی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں کیونکہ صیغہ جمع میں تعظیم زیادہ ہے۔ رہا یہ کہ اس میں توحید کی رعایت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ توحید اس میں بھی محفوظ ہے کیونکہ علماء بلاغت نے لکھا ہے کہ مواحد انبت الربیع البقل کہے تو اسناد مجازی ہوگی۔ اس طرح یہاں سمجھ لو۔

رہا یہ کہ قرآن میں بھی کہیں اس کی اصل موجود ہے یا نہیں۔ سو صیغہ تکلم میں تو بکثرت صیغہ جمع اللہ تعالیٰ

نے اپنے لئے اختیار فرمایا ہے اور خطاب کی صورت میں بھی ایک جگہ صیغہ جمع آیا ہے۔ قال رب ارجعون (پ ۱۸) اس میں اللہ کو صیغہ جمع کے ساتھ خطاب ہے اور گو اس میں دوسرا احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ جمع سے مراد تکرار فعل ہے رب ارجع رب ارجع مگر تکرار فعل کے لئے صیغہ جمع کا لانا خلاف ظاہر ہے اس لئے یہ احتمال بعید ہے اور اگر بعید بھی نہ ہو تو دوسرا احتمال بھی امت کے نزدیک متعلق بالقبول ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار و اتباع بھی جائز ہے بہر حال اس کی اصل بھی موجود ہے اور اس لئے یہ بھی جائز ہے مگر پھر بھی میں کسی ایک شق کو دوسری پر ترجیح نہیں دیتا کیونکہ ممکن ہے کہ اپنے استاد کی محبت کی وجہ سے اس شق کو پسند کرتا ہوں۔

فَاتَّخَذَ تَمَوْهُمْ سَخِرِيًّا حَتَّىٰ أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ

تَضْحَكُونَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: سو تم نے اُن کا مذاق مقرر کیا تھا یہاں تک کہ انکے مشغلہ دو تم کو ہماری یاد بھی بھلا دی اور تم ان سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

عباد مقبولین کا کام صبر ہے

غرض یہ احتیاط تھی کہ کسی کی تکفیر کرتے تھے نہ اپنی تکفیر سے برا مانتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جتنا رتبہ بڑھتا جاتا ہے جہلاء انکار کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ کتابوں میں لکھا ہے لَا يَكُونُ الرَّجُلُ صَدِيقًا حَتَّىٰ يَشْهَدَ عَلَيْهِ سَبْعُونَ صَدِيقًا أَنَّهُ زَانٍ. یعنی آدمی صدیق نہیں بنتا تا وقتیکہ ستر صدیق اس کو زندیق نہ کہنے لگیں۔ یعنی ایسے مرتبہ کو پہنچ جائے کہ مدعی صدق بھی نہ کہ حقیقی صدیق اس کی بات کو نہ پہنچیں اور اس وجہ سے اس کو زندیق کہنے لگیں۔ ایک صاحب نے حضرت حاجی صاحبؒ کی تکفیر کی تھی۔ حالانکہ حضرت حاجی صاحبؒ ایسے مغلوب الحال بھی نہ تھے جو یہ احتمال ہو کہ غلبہ حال میں کوئی بات خلاف شرع منہ سے نکل گئی ہوگی۔ آپ نے بیساختہ فرمایا کہ اگر میں عند اللہ مومن ہوں تو سارے جہان کی تکفیر مضر نہیں اور اگر عند اللہ کافر ہوں تو سارے جہان کا مومن کہنا مفید نہیں۔ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا۔ میں نے کہا کہ ہاں اس شخص کو جائز ہے جس کو یہ یقین ہو جائے کہ میں اس سے بہتر ہو کر مروں گا۔ اس نے کہا کہ یہ مرنے کے قبل کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا تو بس مرنے کے بعد جائز ہوگا ورنہ جب تک خاتمہ نہ ہو لے اس وقت تک تو یہ حالت ہے۔

گہہ رشک بروفرشتہ برپا کی ما گہہ خندہ زند دیوزنا پاکی
ایماں چوسلامت بہ لب گور بریم احسنت بریں چشتی وچالا کی ما
ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی کا مقدمہ پیش ہو رہا ہے اور کچھ خبر نہیں کہ انجام کیا ہوگا۔ وہ شخص اپنے زعم
میں سمجھ رہا ہے کہ ہم پر جرم عائد نہیں ہوتا کیا خبر ہے کہ وہ زعم حاکم کے روبرو صحیح ثابت ہوگا۔ یا غلط چنانچہ اللہ
تعالیٰ خود مجرمین کو جتلائیں گے۔

فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سُخْرِيَا حَتَّىٰ اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ اِنِّىْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا
صَبَرُوا اِنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ۔

اور اس سے اور بات بھی معلوم ہوئی کہ اس میں عباد مقبولین کا فعل صبر فرمایا انتقموا۔ نہیں فرمایا اس سے
معلوم ہوا کہ کسی کی ایذا پر صبر کرنا چاہیے نہ کہ انتقام۔

ایک شخص نے میرے پاس لکھا تھا کہ ایک شخص نے آپ کو گالیاں دیں میں نے اس کو خوب برا بھلا کہا۔
آپ دعا کیجئے کہ اس شخص کو اصلاح ہو جائے میں نے جواب میں لکھا کہ آپ پہلے اپنی اصلاح کیجئے کہ آپ
نے برا بھلا کہا میں نہیں چاہتا کہ میرے بارہ میں دو فرقے ہوں اس عمل سے تو دو فرقے ہو جائیں گے۔ ایک
برا کہنے والا۔ اور ایک بھلا کہنے والا۔ پھر دونوں میں خوب لڑائی ہوگی۔ فرقہ بندی ہوگی۔ اس سے تو ہم توبہ توبہ
ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درجہ میں ہو گئے کہ ان کے بارہ میں دو فرقے ہیں نبی کا انکار تو بیشک کفر ہے اور
صحابہ وغیرہم کا انکار فسق ہے۔ باقی جس کی کشتی خود ہی ڈانواں ڈول ہے اس کیلئے مجلس بنانا کتنی حماقت ہے۔

سُورَةُ النُّورِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

ترجمہ: زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد سو ان میں ہر ایک کے سو دسے مارو

تفسیری نکات

آیت سرقہ السارق کی اور آیت زنا میں الزانیۃ کی تقدیم میں حکمت

اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے ادیب مشہور نہ تھے مگر مولانا کی تقاریر سے جو بہت سے مقامات مجھ کو منضبط بھی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عربیت سے اس قدر مناسبت تھی کہ دیکھنے والا پھڑک جاتا ہے چنانچہ اس وقت ایک مقام یاد آ گیا آیت الزانیۃ والزانی اور آیت ہے یح کا اب مولانا کی توجیہ سنئے فرماتے تھے کہ سرقہ کا صدور مرد سے زیادہ عجیب اور قبیح ہے کہ وہ کما کر کھا سکتا ہے اور عورت میں عفت و شرم و حیا زیادہ ہوتی ہے اس سے زنا کا صدور زیادہ عجیب و قبیح ہے میں نے کسی تفسیر میں بات نہیں دیکھی جو حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔

والسارق والسارقة کے متعلق (پہلی آیت میں) الزانیۃ کی تقدیم اور (دوسری آیت میں) السارق کی تقدیم کے بارہ میں مشہور سوال ہے جس کا سب سے لطیف جواب منقول ہے کہ سرقہ کی بنا جرات ہے اور وہ مرد میں زیادہ ہے اور زنا کی بناء پر شہوت ہے جو عورت میں زیادہ ہے مگر اس جواب میں یہ خدشہ ہے کہ اس فرق کو بنا کہتے ہیں تو مجرم کی ایک قسم کی معذوری کا اظہار ہے اور یہ مقام

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ

فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَذِبُونَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: واقعہ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

تفسیری نکات

واقعہ افک پر منطقی اشکال کا جواب

اسی واقعہ افک میں یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ اس دعوے پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں شاید کسی قاضی مبارک پڑھنے والے کو شبہ ہو کہ یہ آیت تو منطق کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو اور اس وقت کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو تو اب یہ شخص اگر اس واقعہ کی حکایت کرے گا تو واقع میں صادق ہوگا اور جب واقع میں صادق ہے تو عند اللہ بھی صادق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا علم مطابق واقع کے ہے۔ حالانکہ اس آیت کی بنا پر عند اللہ وہ کاذب ہے کیونکہ چار گواہ وہ نہیں لاسکا مگر ان معقولی صاحب سے کہا جائے گا کہ تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یہاں عند اللہ کے معنی فی علم اللہ (اللہ کے علم میں) نہیں بلکہ فی دین اللہ (اللہ کے دین میں) یعنی فی قانون اللہ (اللہ کے قانون میں) مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ زنا میں چار گواہ نہ پیش کر سکے تو وہ قانون خدا میں جھوٹا ہے گو واقع میں سچا ہو یعنی اس کے ساتھ معاملہ کاذب کا سا کیا جائے گا تو اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کا گو واقع میں کاذب ہونا متحقق نہ ہو مگر وہ قانون روایت کے موافق کاذب ہو تو اسے کاذب کہنا جائز ہے۔ خواہ عند اللہ بمعنی فی علم اللہ و فی الواقع (عند اللہ معنی فی اللہ کے ہے واقع میں) صادق ہی ہو۔

چنانچہ شریعت نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے۔

الولد للفراش جس کے فراش اور جس کے نکاح میں عورت ہے اولاد اسی کی ہے۔

اور یہی مطلب ہے اس مسئلہ فقیہ کا کہ جس عورت کا خاوند برسوں پردیس میں غائب رہے اور اس کے اولاد ہو جائے تو وہ ثابت النسب ہے معنی یہ ہیں کہ قانون شرعی سے وہ لڑکا اس کا ہے یعنی اس کو حرامی کہنا اور اس عورت کو بدکار کہنا حرام ہے اگر وہ شخص پردیس میں مرجائے تو یہ لڑکا اس کا وارث ہوگا ۱۲۔

سُوْنِ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاذلّم یاتوا بالشہداء فاولئک عند اللہ ہم الکذبون عند اللہ سے مراد ہے یہاں پر فی الدین اللہ فی قانون اللہ یعنی شریعت کے قانون کی رو سے تم جھوٹے ہو تمہارا کہنا سب غلط ہے پس اس تقریر کے بعد یہ شبہ نہ رہا کہ محتمل الصدق کو جزا کیسے کاذب فرما دیتے تھے حکیم محمد مصطفیٰ صاحب نے اس آیت سے ایک عجیب مسئلہ استنباط کیا ہے کہ حسن ظن کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں سُوْنِ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

بے تحقیق کوئی بات کرنا بڑا جرم ہے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک افتراء و بہتان باندھا تھا جس کا لوگوں میں چرچا ہوا تو چند مسلمان بھی اس تذکرہ میں ملوث ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے سخت تکلیف پہنچی اور آپ وحی کے منتظر رہے مہینہ بھر کے بعد وحی نازل ہوئی اور حضرت صدیقہ کی برأت نہایت شہود کے ساتھ ظاہر کی گئی اور جن مسلمانوں نے اس بہتان کا تذکرہ اپنی زبان سے کیا تھا ان کو بہت دھمکایا گیا ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مسلمانوں پر حد قذف جاری فرمائی انہی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے (یعنی زبان سے بے تحقیق کے بات نکالنا) پس تقولون بافواہکم مالیس لکم بہ علم الخ (اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی الخ) یہ ایک عمل کلی ہے جو مورد نزول کے علاوہ بھی بہت سے موارد کو عام ہے اس وقت میں عمل کلی ہی پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے متعلق ایک قانون کلی ہے واقعہ جزئیہ کا بیان اس وقت مقصود نہیں۔ حاصل اس قانون کلی کا یہ ہے کہ زبان سے بدوں تحقیق کے کوئی بات منہ سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا جرم ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زبان کی احتیاط نہایت ضروری ہے بدوں تحقیق کے زبان سے بات نکالنا ہرگز نہیں چاہیے۔

بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے

اذتلقونہ بالسنتکم وتقولون بافواہکم مالیس لکم بہ علم (جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی) کیونکہ وہاں بھی تو ایک روای

اول تھا جس نے یہ بہتان تراشا تھا اور اس سے یہ بات مدینہ میں پھیلی تھی کیونکہ اول منافقین نے اس بات کا چرچا کیا تھا پھر کچھ مسلمانوں نے بھی منافقین سے سن کر تذکرہ شروع کیا تھا جس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ نہیں کہا گیا کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ پہلے راوی کی گردن پر ہے) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے ان الذین جاوا بالافک عصبۃ منکم لا تحسبوا شر الکم بل هو خیر لکم لکل امرء منہم ما اکتسب من الاثم کہ جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا ہے وہ تمہارے ہی میں سے ایک جماعت ہے تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا مت سمجھو بلکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہے (ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ ہے جو گناہ حاصل کیا ہے) کیونکہ ایک تو اس سے افتراء (یعنی حد قذف ۱۲) کا حکم معلوم ہو جائے گا دوسرے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سنی سنائی بات کا نقل کرنا اور اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں تیسرے آئندہ اگر کسی متقی پر اس قسم کا بہتان باندھا جائے گا تو حضرت صدیقہ کا واقعہ اس کے لئے تسلی کا باعث ہوگا کہ مجھ سے پہلے بھی بے گناہ آدمیوں کو مہتم کیا گیا ہے وغیرہ ذلک من الفوائد ۱۲ (اس کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں) اس کے بعد ارشاد ہے کہ ان میں سے ہر شخص کے لئے گناہ کا حصہ ہے اس میں حق تعالیٰ نے سب کو گناہ کا قرار دیا راوی کو بھی اور ناقلین کو بھی اس کے بعد فرماتے ہیں والذی تولی کبرہ منہم لہ عذاب عظیم کہ جس شخص نے اس میں بڑا حصہ لیا یہ راوی اول ہے اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے پس یاد رکھو کہ اس معاملہ میں حق تعالیٰ تمہارے قانون پر عمل نہ کریں گے کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ راوی پر ہے) بلکہ اپنے قانون پر عمل فرمائیں گے جس کا بیان اگلی آیت میں ہے اذاتلقونہ بالسنتکم و تقولون بافواہکم ما لیس لکم بہ علم ان میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم زبان سے اس بہتان کا تذکرہ اور چرچا کرتے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی۔ اس میں بتلادیا کہ بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے اور یہ بھی بتلادیا کہ تحقیق بھی ہو جائے تو اس کا چرچا کرنا اور خواہ مخواہ پھیلانا دوسرا جرم ہے اگر کسی بات کی تحقیق بھی ہو جائے تو اس کو زبان سے نکالنا اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ضرورت ہو اور ضرورت سے زیادہ پھیلانا اور اس کا بے فائدہ چرچا کرنا پھر بھی جائز نہیں۔ مثلاً کسی کو کسی کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ یہ فلاں جرم کا مرتکب ہے تو امر بالمعروف کے طور پر خود اس شخص سے کہے کہ میں نے تیرے متعلق ایسا سنا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو تم کو توبہ کرنا اور اس سے باز رہنا چاہیے اگر اس سے نہ کہہ سکے تو اس کے کسی مربی سے کہہ دے جو اس کو روک سکتا ہو اور یہ بھی اس وقت ہے جب تحقیق ہو جائے اور تحقیق نہ ہو تو پھر کسی سے بھی کہنا جائز نہیں نہ خود اس شخص سے نہ اس کے مربی وغیرہ سے پھر تحقیق کا طریقہ ہر کام کے لئے جدا ہے بعض امور میں دو عادل گواہ ضروری ہیں بعض میں چار پھر ان گواہوں میں بھی مشاہدہ سے گواہی ضروری ہے یہ نہیں کہ سب تمہاری طرح سنی سنائی کہتے ہوں پس جو بات منہ سے نکالنا ہو اس کے متعلق اول نفس سے سوال کیجئے کہ اس

کامنہ سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟ دو حال سے خالی نہیں یا تو آپ عالم ہیں یا جاہل ہیں اگر عالم ہیں تو قواعد شرعیہ سے جواب معلوم ہو جائے گا ورنہ کتابوں سے مراجعت کیجئے اور اگر جاہل ہیں تو آپ کو پہلے کسی عالم سے دریافت کرنا چاہیے یا بقدر ضرورت علم حاصل کرنا چاہیے۔ بہر حال اگر آپ نفس سے یہ سوال کریں گے تو اکثر واقعات میں یہی جواب ملے گا کہ یہ جائز نہیں اور کمتر یہ جواب آئے گا کہ جائز ہے اس پر دوبارہ نفس سے سوال کیجئے کہ اس کے منہ سے نکالنے میں کوئی فائدہ اور مصلحت بھی ہے اس کا جواب بھی اکثر یہی آئے گا کہ کوئی نہیں تو پھر اس بات کو ہرگز منہ سے نہ نکالو اور جس کے متعلق یہ جواب آئے کہ اس کا منہ سے نکالنا جائز ہی نہیں اس کے تو پاس بھی نہ جاؤ مگر یاد رکھو کہ ناجائز باتوں سے اسی وقت بچ سکتے ہو جب اس کی عادت ہو جائے کہ مباح اور ناجائز باتیں بھی بے ضرورت نہ کرو بس زیادہ تر سکوت اختیار کرنا چاہیے حدیث میں ہے من سکت سلم و من سلم نجی (جس نے خاموشی اختیار کی سلامت رہا اور جو سلامت رہا اس نے نجات پائی) اور ایک فارسی مصرعہ ہے۔

خاموشی معنی دار کہ در گفتن نمی آید
(خاموشی ایسے معنی رکھتی ہے جو کہنے میں نہیں آسکتے)

بلا تحقیق بات کرنا بہتان ہے

غرض دینی ضرورت سے اگر کسی کی غیبت کرے تو جائز ہے مگر ضروری ہونے کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ بات محقق ہوگئی ہو جو تم بیان کرنا چاہتے ہو اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی جائز نہیں کہ یہ غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے اسی کی نسبت حق تعالیٰ فرماتے ہیں اذ تلقونہ بالسنتکم وتقولون بافواہکم مالیس لکم بہ علم وتحسبونہ ہیناً وھو عند اللہ عظیم (جبکہ تم اپنی زبان سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑا جرم ہے) یہ مختصر آداب ہیں کسی کے متعلق کوئی بات نقل کرنے کے۔ اب دیکھ لیا جائے کہ ہم لوگ ان کی کہاں تک رعایت کرتے ہیں عوام تو عوام بخدا اہل علم اور خواص بھی بہت باتیں بے ضرورت کہتے ہیں اور ان میں زیادہ تر بے تحقیق باتیں ہوتی ہیں اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہوتا تو آج کل کے اکثر ثقہ سقے ثابت ہوتے عموماً عادت یہ ہے کہ جہاں کسی سے کوئی بات سنی اور اس کو نقل کرنے لگے اور جوان سے پوچھا جائے کہ میاں اس کی تحقیق بھی کی تو کہتے ہیں تانا بانہ چیز کے مردم گویند چیز ہا (جب تک کچھ اصل ہی نہ ہو لوگ اس کا چرچا نہیں کرتے)

اذ تلقونہ بالسنتکم وتقولون بافواہکم مالیس لکم بہ علم وتحسبونہ ہیناً وھو عند اللہ عظیم
(جب تم اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے ایک دوسرے سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو

کسی دلیل سے مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے) یہ سورہ نور کی آیتیں ہیں جن میں ایک خاص گناہ کو ہلکا سمجھنے کی مذمت کی گئی ہے و تحسبونه هيناً و هو عند الله عظيم (اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری بات ہے)

گناہ کو صغیرہ سمجھنا

اس میں نص ہے یہ قصہ افک کا ہے اس میں قذف اور بہتان کا بیان ہے اور اس کو ہلکا سمجھنے پر توبیخ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا خاص اسی گناہ کو جیسا کہ مقتضای سبب نزول کا ہے یا ہر گناہ کا خواہ وہ کبیرہ ہو ہلکا سمجھنا برا اور مذموم ہے سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تخصیص کسی گناہ کی نہیں کیونکہ سبب نزول سے تو جگہ کی تخصیص ہوا ہی نہیں کرتی۔ رہا شبہ تخصیص کا عظیم سے سو ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی اور ظاہر ہے نافرمانی گو کسی قسم سے ہو زیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں چو چھٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امراضانی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور یہ دوسرا اس سے چھوٹا اور نہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ ہی ہیں کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیے اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آسمان دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر درحقیقت کوئی چھوٹی چیز نہیں دوسری مثال ناپا کی اور پلیدی کی ہے کہ پلیدی ناپا کی سے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضی کے اعتبار سے تقسیم ہی ہوگی اور اس کا مقتضایہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جاتا۔

چونکہ اس کی تحقیق اہل علم کے سمجھنے کے قابل ہے اس لئے اس کو بھی بیان کرتا ہوں اس معنی میں عند اس آیت میں ہے فاذلم ياتوا بالشهداء فاولئك عند الله هم الكاذبون یہ آیت حضرت عائشہ کے افک کے قصہ میں ہے قصہ طویل ہے اس کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں جتنا جزو اس قصہ کا یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو منافقین نے مہتم کیا کئی دن تک اس کا بہت چرچا ہوا آخر ان کی براءت حق تعالیٰ نے قرآن میں اتاری اور منافقین کے بکواس کو رد کیا اس رد میں یہ آیت بھی ہے۔ فاذلم ياتوا بالشهداء فاولئك عند الله هم الكاذبون اس کا ترجمہ یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ گواہ نہیں لاسکے لہذا یہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں اس کا مدلول یہ ہوا کہ ان کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ چار گواہ نہ لاسکے اب یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کذب کس کو کہتے ہیں سب جانتے ہیں کہ کذب کے معنی حکایت خلاف واقع کے ہیں یعنی ایک کام واقع میں نہیں ہوا اور بیان کیا کہ ہوا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ

شہادت نہ لاسکنا مستلزم کذب ہے اب فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کسی کو حرام کرتے دیکھا اور اس کی حکایت بیان کی مگر گواہ نہ لاسکا تو اس آیت کی بموجب تو وہ کاذب ہے لیکن یہ حکایت مطابق واقع کے ہے اس پر تعریف کذب کی صادق نہیں آتی اور آیت اس کو کاذب کہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ آیت میں عند اللہ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اور بلفظ دیگر حق تعالیٰ کے علم میں اور یہ مقدمہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے نہ علم صحیح نہ ہوگا تو عند اللہ کے مفہوم پر آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص جس نے حرام کو دیکھ کر حکایت بیان کی واقع میں بھی جھوٹا ہے یعنی اس نے واقع میں حرام نہیں کیا کیونکہ علم الہی میں اس کو کاذب قرار دیا گیا ہے اور علم الہی مطابق واقع کے ہوتا ہے تو اب یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ علم الہی خلاف واقع ہے یہ ایک سخت اشکال ہے قرآن پر مگر الحمد للہ حق تعالیٰ نے اس کا بہت سہل جواب دل میں ڈال دیا جس کو سننے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ اشکال کچھ بھی نہ تھا اس کی بنا اسی پر ہے کہ قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجمے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کر دی جائے تو بالکل اطمینان ہو جاتا ہے اور سننے والا پھڑک اٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔ وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عند اللہ کے معنی یہاں فی علم اللہ کے نہیں ہیں بلکہ فی قانون اللہ کے اور فی دین اللہ کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی تہمت لگانے والوں کے لئے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ کاذب کا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ اشکال تو یہی تھا کہ علم الہی کا خلاف واقع ہونا لازم آتا ہے اور یہاں علم الہی مراد ہی نہیں صرف یہ معنی ہو گئے کہ قانون ان کو جھوٹا کہے گا قانون ایک ایسی چیز ہے جس میں ضابطہ دیکھا جاتا ہے جس کے کچھ قواعد مقرر ہوتے ہیں کہ جب تک ان کی موافق کام نہ ہو اس کو معتبر نہیں مانا جاتا۔

قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت

چنانچہ تمام زمانہ کے عقلا کا قانون ہے کہ کوئی بات بے ثبوت نہیں مانی جاتی خواہ واقع میں وہ بات بالکل صحیح ہی ہو اگر یہ قانون نہ ہو تو دنیا کا نظام ہی بگڑ جائے ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کر دے کہ اس نے میرا مال چہایا ہے بس قاضی کو چاہیے کہ اس پر چوری کا جرم قائم کر دے اور سزا دے دے دوسرا دعویٰ کر دے کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے بس قاضی فوراً اس کو قصاص میں مار ڈالے تو اس طرح تو ایک دن میں دنیا تہ وبالا ہو جائے دنیا کا نظام قانون الہی قواعد کی پابندی ہی سے رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص پر چار آدمیوں نے زنا کی شہادت دی اور یہاں تک کہا کہ ہم نے مرد اور عورتوں دونوں کو ننگے اور اوپر نیچے دیکھا مگر

یہ نہیں کہا کہ دخول ہوتے دیکھا تو حضرت عمر نے اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور مدعا علیہ پر زنا کو ثابت نہیں کیا بلکہ ان گواہوں کو جھوٹا قرار دیا اور ان پر قذف جاری کی اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ضابطہ پورا نہ ہوا اور شہادت کی جو شرائط تھیں ایک جزو اس کا رہ گیا وہ یہ ہے کہ کامل فی الکلیہ دیکھا ہو حالانکہ ظاہر تو یہی ہے کہ جب مراد اور عورت ننگے ہو چکے تھے تو زنا بھی ضرور واقع ہوا جب ایسا موقع تھا کہ ننگے ہو سکے تو زنا سے کون مانع موجود تھا یہ بات بظاہر قریب یقین ہی کی تھی لیکن اس پر بھی جب کہ آنکھ سے دخول ہوتے نہ دیکھا گواہوں کے لئے زبان سے ان دونوں کو زانی کہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ چاروں گواہوں پر حد قذف لگائی گئی آج کل لوگ صرف وہم و گمان پر حکم لگا دیتے ہیں اور جو سمجھ میں آتا ہے کسی کی نسبت خیال پختہ کر لیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہ بلا علماء اور مشائخ کے یہاں بہت ہے۔ آج کل حضرت عمرؓ ہوتے تو بکثرت علماء اور مشائخ کے درے لگتے سب کی کرکری ہو جاتی اور یہ جو بڑے بڑے جہوں اور قلوں میں عیب چھپائے بیٹھے ہیں سب کی حقیقت کھل جاتی اس بات میں بڑی احتیاط چاہیے کہ دوسرے کی نسبت کوئی برا خیال قائم کیا جائے اور زیادہ اہتمام کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ عادت اور طبعی بات ہے کہ اپنی طرف برا گمان کم ہوتا ہے اور دوسرے کی طرف اچھا گمان کم ہوتا ہے اکثر کوئی شخص جب اپنی طرف دیکھتا ہے تو نظر اپنے ہنروں اور محامد ہی پر پڑتی ہے اور جب دوسرے کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے عیبوں اور برائیوں پر ہی پڑتی ہے جب یہ طبعی بات ہے تو ان دونوں میں غلطی ہو جانے کا بہت قوی احتمال ہے لہذا سخت اہتمام کی ضرورت ہے کوشش کر کے صحیح طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ اپنے ہنروں کو کبھی نہ دیکھے صرف عیبوں ہی کو دیکھے اور دوسرے کے عیبوں کو کبھی نہ دیکھے صرف ہنروں ہی کو دیکھے جتکلف اس کی نگاہ داشت بہت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کرنے سے کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ آدمی کی اصلاح ہو جاوے غرض بے ثبوت بات کہنے سے گناہ بھی ہوگا اور قانون شرعی تا وقتیکہ کہ کافی ثبوت باقاعدہ نہ ہو اس کو جھوٹا ہی کہے گا خواہ وہ بات واقع میں جھوٹی نہ بھی ہو یہ معنی ہیں عند اللہ کے یعنی فی قانون اللہ تو آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ تہمت لگانے والے چونکہ اپنے دعویٰ پر باقاعدہ شہادت نہ لاسکے لہذا وہ قانون الہی میں جھوٹے کہے جاویں گے اور کذب کے احکام ان پر جاری ہوں گے چنانچہ تین صحافی کو جو بھولے پن سے اس قصہ میں شریک ہو گئے تھے حد قذف لگائی گئی اور منافقین چونکہ چالاکی سے اس شرارت میں حصہ لے رہے تھے بقول مشہور ثبوت نہ ہونے سے دنیا میں حد سے بچ گئے اور آخرت میں تو مزہ چکھیں ہی گئے۔ غرض اس تقریر کے بعد آیت پر کوئی اشکال نہیں رہا اور فقہ کے بہت سے احکام کا یہی منی ہے کہ بسا اوقات ضابطہ کے درجہ میں ایک حکم کو ثابت مانا جاتا ہے خواہ واقع میں کچھ بھی ہو مثلاً دو عادل آدمی گواہی دیں کہ ہم نے 29 کو چاند دیکھا ہے تو اب رمضان یا عید کو ثابت مانا جاوے گا اگرچہ انہوں نے جھوٹی ہی گواہی دی ہو اسی طرح بسا اوقات ایک حکم کو منافی مانا جاتا ہے خواہ واقع میں ثابت ہی ہو مثلاً ایک شخص کا ایک بچہ ہونے پر تہمت لگانے سے لعان ہوا تو اس بچہ کے نسب کی اس شخص سے نفی کی جاوے گی خواہ

واقع میں اسی کا ہو اس کی صدہا نظیریں موجود ہیں تمام کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں لیکن اس کا علاج کیا کیا جائے۔ بہشتی زیور میں کوئی ایسا مسئلہ لکھ دینا جرم قرار پاوے اور وہی مسئلہ اس کے صدہا نظیریں عربی کی کتابوں میں لکھی ہوں بلکہ ان کے اردو ترجمے میں بھی لکھے ہوں تو جرم نہیں۔

شکایت سے متاثر نہ ہونا

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل عدل کا نام و نشان نہیں رہا اس کو تو دین کی فہرست سے خارج ہی سمجھ رکھا ہے۔ الحمد للہ میں ہمیشہ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ بھائی مرحوم کے یہاں حاجی عبدالرحیم ملازم تھے۔ بڑے گھر میں سے مجھ سے ان کی کچھ شکایت کی میں نے ان کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے نفی کی۔ میں نے گھر میں سے کہا کہ شرعی ثبوت لاؤ تو انکار کرتے ہیں۔ وہ ثبوت پیش نہیں کر سکیں۔ تب میں نے کہا کہ بدو شرعی کے کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔ انہوں نے توبہ کی ایسے موقع پر بڑی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں دونوں طرف تعلق ہو مگر شریعت کے اصول پر عمل کرنے کی صورت میں کچھ بھی مشکل یا دشواری نہیں ہوتی اور گود و شخص سے جو تعلق ہوتا ہے۔ اس میں فرق ضرور ہوتا ہے مگر عدل کے وقت دونوں کے مساوات ہونا چاہیے۔ میں نے خاص یہ صفت یعنی شکایت سے متاثر نہ ہوتا۔ دو بزرگوں میں ایک خاص شان کی دیکھی ہے۔ یوں تو سب ہی بزرگوں میں اچھی صفات ہوتی ہیں مگر پھر بھی تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ ایک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور ایک حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں سو حضرت مولانا صاحب تو شکایت سنتے ہی نہیں تھے فرمادیتے کہ میں سننا نہیں چاہتا اور حضرت حاجی صاحب سن کر فرمادیتے کہ سب جھوٹ ہے۔ وہ شخص ایسا نہیں حضرت حاجی صاحب کی اس عادت کی دلیل قرآن میں ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگائی۔ حق تعالیٰ اس باب میں فرمادیتے ہیں لَوْلَا جَاؤَا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَلَوْلَكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ (یہ لوگ اپنے قول پر چار گواہ نہ لائے۔ سو اس صورت میں یہ لوگ موافق قاعدہ کے گواہ نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

اور ”عند اللہ سے مراد ہے فی دین اللہ فی قانون اللہ“ اللہ کے دین میں اللہ کے قانون میں) آگے ارشاد ہے وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (اور تم نے جب اس بات کو اول سنا تھا تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے بھی نکالیں معاذ اللہ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ حسن ظن کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔ سون ظن کی دلیل کا نہ ہونا یہی ہی کافی دلیل ہے۔ حسن ظن کی پس حضرت حاجی صاحب پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ بلا دلیل شاک کی کو کیسے کاذب فرمادیا۔ البتہ باوجود غلط سمجھنے کے اگر کسی دوسری بناء پر عمل کیا جاوے تو دوسری بات ہے جیسا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص کے متعلق شکایت کو جھوٹ سمجھا مگر انتظامی مصلحت کی بناء پر ان کو معزول کر دیا۔ (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۹۹)

کشف بلا تلپیس بھی حجت نہیں

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ سے منصوص ہے کہ بعض کشف میں تلپیس بالکل نہیں ہوتی۔ مگر یہ تلپیس نہ ہونا مستلزم حجت کو نہیں یعنی اگر کشف بلا تلپیس بھی ہو تب بھی حجت نہیں جیسا اگر کوئی شخص ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لے مگر تفریق کی وجہ سے اس کی شہادت مقبول نہ ہو تو خود اس کو بھی رویت پر عمل جائز نہیں۔ یعنی صبح کو روزہ رکھنا واجب ہوگا۔ دیکھئے یہاں تلپیس نہیں مگر پھر بھی اس پر عمل جائز نہیں اس کی ایک تائید آیت سے ہوتی ہے قرآن پاک میں ہے لولا اذ سمعتموه ظن المؤمنون والمؤمنات الی قوله تعالیٰ: سبحانک هذا بهتان عظیم تقریر تائید یہ ہے کہ ایمیں یہ فرمایا گیا کہ لولا جاء وا علیہ باربعة شهداء فاذا لم یاتوا بالشهداء فاولئک عنداللہ ہم الکاذبون حالانکہ شہداء کا نہ ہونا مستلزم نہیں کذب واقعی کو مثلاً خود مشاہدہ کر لیا مگر نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔ یہاں تلپیس بالکل نہیں مگر باوجود اس کے یہ مشاہدہ حجت نہیں حتیٰ کہ خود صاحب مشاہدہ کو بھی زبان سے اس کا تکلم کرنا جائز نہیں۔ اور دوسرے پر بھی واجب ہے کہ سنتے ہی کہہ دیں۔ هذا بهتان عظیم (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۲۶۴)

قانون خدا میں جھوٹا

اب ایک آیت بھی سن لیجئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لولا جاء و اعلیہ باربعة شهداء فاذا لم یاتوا بالشهداء فاولئک عنداللہ ہم الکاذبون (یہ لوگ اس واقعہ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں) اسی واقعہ الفک میں یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ اس دعوے پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں شاید کسی قاضی مبارک پڑھنے والے کو شبہ ہو کہ یہ آیت تو منطق کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو اور اس وقت کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو تو اب یہ شخص اگر اس واقعہ کی حکایت کرے گا تو واقع میں صادق ہوگا اور جب واقع میں صادق ہے تو عند اللہ بھی صادق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا علم مطابق واقع کے ہے حالانکہ اس آیت کی بنا پر عند اللہ وہ کاذب ہے کیونکہ چار گواہ وہ نہیں لاسکا مگر ان معقولی صاحب سے کہا جائے گا کہ تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یہاں عند اللہ کے معنی فی علم اللہ (اللہ کے علم میں) نہیں بلکہ فی دین اللہ (اللہ کے دین میں) یعنی فی قانون اللہ (اللہ کے قانون میں) مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ زنا میں چار گواہ نہ پیش کر سکے تو وہ قانون خدا میں جھوٹا ہے گو واقع میں سچا ہو یعنی اس کے ساتھ معاملہ کاذب کا سا کیا جائے تو اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کا گو واقع میں کاذب ہونا متحقق نہ ہو مگر وہ قانون روایت کے موافق کاذب ہو تو اسے کاذب کہنا جائز ہے خواہ وہ عند اللہ بمعنی فی اللہ و فی الواقع (عند اللہ معنی فی علم اللہ کے ہے واقع میں) صادق ہیں (مطاهر الاقوال ملحقہ مؤاعظ اصلاح ظاہر ص ۳۰۲ ص ۳۰۵)

حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا

فرمایا: حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا۔ بلکہ فقدانِ دلیل سوء ظن بعینہ دلیل حسن ظن ہے۔
 دلیل میں آیت: وَلَوْ ظَنَ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَانْفُسِهِمْ خَيْرًا (مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا) ایک مرتبہ مجھ کو اس ملازمہ میں تردد ہوا کہ فاذلم یا تو باربعہ شہداء فأولئك عند الله هم الكاذبون (سو جس صورت میں یہ لوگ (موافق قاعدہ کے) گواہ ہیں تو بس اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں) کس طرح مرتب ہوا۔ جواب یہ سمجھ آیا کہ فأولئك عند الله ای عند دین اللہ اور عند قانون اللہ و عند الشرع (پس وہ اللہ کے نزدیک یعنی اللہ کے دین اور اس کے قانون اور شریعت کے نزدیک) (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۲۵۸، ۲۵۹)

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ^{۱۹}

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

تفسیری نکات

منتہی سلوک کا مقام

فرمایا۔ منتہی سلوک طے کر کے اسی مقام پر پہنچتا ہے کہ واللہ يعلم و انتم لاتعلمون اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے تو پھر شروع میں ہی کیوں نہ یہ عقیدہ رکھا جائے۔ خصوصاً صفات واجب میں کلام کرنا بہت خطرناک ہے سب مقدمات ظنیہ ہیں جن کو متکلمین نے یقینی سمجھا ہوا ہے مثلاً مسئلہ کلام قیاس الغائب علی الشاہد ہے اپنے کلام میں جو تعاقب دیکھا تو یوں سمجھنے لگے کہ وہاں بھی تعاقب ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں تعاقب نہ ہو حضرات صحابہ اور سلف کا سا عقیدہ رکھنا چاہیے بس اتنا کافی ہے کہ عالم جمیع اجزا حادث ہے اسی میں حیولی اور صورت اور جز ولا يتجزی سب آگئے اور یہ اللہ تعالیٰ کے صفات میں کلام اور ارادہ جب موصوف کا ادراک نہیں تو صفت کا ادراک کیسے۔

وَلَا يَأْتِلْ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَىٰ

وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا

أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں اور اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

تفسیری نکات

محبت آمیز نکیر

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح کی امداد بند کرنے کا ارادہ فرمایا تھا کیونکہ قصہ افک میں حضرت عائشہؓ کے متعلق ان کی زبان سے بھی کچھ نکل گیا تھا۔ آج بھی اگر کوئی واقعہ ایسا ہو جائے تو کوئی جنید وقت بھی اپنی زبان کی پوری حفاظت نہ کر سکے گا۔ کچھ نہ کچھ ہر شخص کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے۔ یہ حضرات صحابہ ہی کا کمال ہے کہ منافقین کے اس قدر شور و شغب میں صرف دو تین صحابہ کی زبان سے بے احتیاطی ہوئی باقی سب محفوظ رہے۔ منجملہ ان دو تین کے ایک حضرت مسطح بھی تھے۔ ان کی زبان سے بھی کوئی بات نکل گئی۔ جب وحی سے حضرت عائشہؓ کی براءت ثابت ہو گئی تو حضرت صدیقؓ کو مسطح پر غصہ آیا کیونکہ یہ حضرت صدیقؓ کے قریبی عزیز بھی تھے اور حضرت صدیقؓ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے اس لئے یہ آپؐ نے قسم کھالی کہ اب سے میں مسطح کی امداد نہ کروں گا تو حق تعالیٰ نے آیت ولایاتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمہاجرین فی سبیل اللہ میں حضرت صدیقؓ کو اس ارادہ سے منع فرمایا کہ روزی بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہیے اور گویا ہر اس آیت میں حضرت صدیقؓ پر نکیر ہے مگر محبت آمیز نکیر ہے کیونکہ اس میں حضرت صدیقؓ کی اول تعریف بھی کی گئی ہے کہ اصحاب فضل کو یعنی جن کو فضیلت دیدیہ حاصل ہے اور اصحاب وسعت کو یعنی جن کو خدا نے مالی وسعت دی ہے اپنے قرابت دار اور مہاجر مسکینوں کی امداد بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہیے اس میں حضرت صدیقؓ کی یہ تعریف ہے کہ ان کو خدا نے دینی فضیلت بھی عطا کی ہے اور دنیوی وسعت بھی عنایت کی ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کسب کمال سے منع کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ اس کے مآل سے منع کرتے ہیں اگر کوئی شخص مآل سے محفوظ ہونے کا انتظام کر لے تو اس کے لئے وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ پھر اس میں حضرت مسطح کی بھی تعریف ہے کہ وہ مسکین ہیں، مہاجر ہیں مستحق امداد ہیں۔ اس بلوغ عنوان میں جس قدر ترغیب و تخصیص ہے ظاہر ہے۔

اس کے بعد حضرت صدیق کو ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔ **الَاتَّحِبُّونَ اَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ**۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائیں۔ یعنی اگر تم اپنے خطا کاروں کی خطا معاف نہ کرو گے تو اگر خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرنے لگیں تو کیا ہو؟ آخر تم بھی تو کسی کے خطاوار ہو۔ پس اگر یوں چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہاری خطائیں معاف کر دیں تو تم اپنے خطاواروں کو معاف کر دیا کرو۔ یہ سن کر حضرت صدیقؓ پکھل گئے اور کہا بلی احب ان یغفر اللہ لی۔ بیشک میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری خطا معاف فرمادیں۔ اس کے بعد حضرت مسطح کی امداد بدستور جاری کردی اور مدت العمر کبھی بند نہ کی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنَوا فِی الدُّنْیَا

وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

ترجمہ: جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں اور ایسی باتوں کے کرنے سے (بالکل) بے خبر ہیں اور ایمان والیاں ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا۔

تفسیری نکات

ضروری تعلیم

اس میں یہی ضروری تعلیم مذکور ہے اور یہ آیت خاص واقعہ میں نازل ہوئی اس واقعہ کے تو بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں حکایات بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ ان واقعات میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اور وہ فیصلہ ہے ضرورت عامہ کا اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے غرض آیت گواہ ایک واقعہ خاص میں نازل ہوئی ہے مگر مخصوص نہیں ہے اس واقعہ کے ساتھ کیونکہ ہر واقعہ کے لئے ایک قانون ہوتا ہے سوا اگر قانون اس واقعہ کے قبل بنا ہوا ہے تب تو فہما اور اگر بنا ہوا نہیں ہے تو اس کے لئے قانون بنایا جاتا ہے اور جب تک حکومتی

رہتی ہے وہ قانون جاری رہتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات کا انحصار ہو نہیں سکتا اس لئے قوانین کلیہ بنائے جاتے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت واقعات کو ان قوانین میں داخل کر سکیں اس سے فقہاء کے اس کہنے کا راز معلوم ہو گیا کہ۔ لا عبرة لخصوص المورد بل لعموم الالفاظ

یعنی خصوص مورد کا اعتبار نہیں بلکہ عموم الفاظ کا اعتبار ہے مثلاً کوئی آیت کسی خاص موقع میں نازل ہوئی تو وہ اسی موقع کے ساتھ خاص نہ ہوگی بلکہ جو واقعہ بھی اس کی مثل پیش آئے گا تو وہ اس کو بھی شامل ہوگی جیسے

وَبِلِّ لِلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ.
بعض اہل کیل ووزن کے بارہ میں نازل ہوئی ہے مگر ان ہی کے ساتھ خاص نہ ہوگی بلکہ جو بھی کم ناپے تو لے گا سب کو اس آیت کی وعید شامل ہوگی اسی طرح بہت سی آیات ہیں کہ موارد ان کا خاص ہے مگر حکم عام ہے اور یہ عقلی مسئلہ ہے اس میں زیادہ تفصیل کرنے کی حاجت نہیں اسی طرح یہ آیت باوجود یہ کہ واقعہ خاص میں نازل ہو مگر حکم عام ہے اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کیا فرماتے ہیں حق تعالیٰ اس آیت کے اندر ایک مضمون خاص بیان فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو محفوظ ہیں اور جنہیں خبر نہیں اور ایمان والیاں ہیں ان پر دنیا میں بھی لعنت ہوگی اور آخرت میں بھی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا (آخرت میں) یہ تو ترجمہ کا حاصل ہے کہ پاک عورت کو تہمت لگانے والے پر لعنت ہے۔ اب سمجھئے کہ کسی کلام سے جو مقصود ہوتا ہے اس کو اصطلاح میں عبارة النص کہتے ہیں اور وہ مقصود ہی ہے جو ترجمہ کے حاصل میں بیان کیا گیا مگر مجھ کو اس وقت اس مقصود کا بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کا ایک اور مدلول بھی ہے جو مقصود نہیں مگر آیت اس پر دلالت کرتی ہے جس کو اصطلاح میں اشارة النص کہتے ہیں۔

صفات نسواں

اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی اچھی صفات بیان کی ہیں اور وہ صفات اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ مجھ کو ان صفات میں گفتگو کرنا مقصود ہے تاکہ عورتیں اپنے اندر ان صفات کے پیدا کرنے کی کوشش کریں سو آیت میں غور کرنے سے اور لفظوں کے دیکھنے سے وہ تین صفات ہیں جن سے متصف ہونے والیوں کو تہمت لگانے والے پر لعنوا کو مرتب کیا ہے تو وہ صفات پیدا کرنی چاہئیں پس ایک صفت المحصنات ہے ایک صفت الغفلت ہے اور ایک صفت المومنات ہے حاصل ترجمہ محصنات کا ہے پارسا عورتیں اور لفظی ترجمہ ہے حفاظت کی گئیں یعنی ان کو پارسائی کے خلاف باتوں سے محفوظ رکھا گیا دوسری صفت یہ ہے عافلات یعنی بے خبر بھولی بھالیاں تیسری صفت ہے المومنات یعنی ایمان والی سو آیت میں بظاہر یہ صفات منتشر یعنی غیر مربوط اور غیر مرتب معلوم ہوتی ہیں کیونکہ پہلے المحصنات

ہے پھر الغفلت پھر المومنات حالانکہ ظاہر امتقضاے ترتیب یہ تھا کہ المومنات کو پہلے لاتے کیونکہ ایمان کا درجہ مقدم ہے سب چیزوں سے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ محسنات کو مقدم کیا مومنات پر اس میں ضرور کوئی بڑانکتہ ہے بات یہ ہے کہ کلام حق تعالیٰ کا ضروری رعایتوں کا نہایت جامع ہے اور اس میں اس قدر تہ قیق ہے کہ ضروریات اصلاح کے متعلق جتنے امور ہیں ان کا ضبط اس میں اس قدر کافی ہے کہ کسی کلام میں نہیں ہو سکتا پس نظر غائر کرنے سے یہ صفات آپس میں مربوط بھی ہیں یعنی ان میں باہم علاقہ بھی ہے اور مرتب بھی ہیں۔

کمالات دین دنیا

اس کے لئے پہلے ایک مقدمہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ انسان میں دو کمال پیدا کئے گئے ہیں اور ان ہی کمالات کو بڑھانا انسان کو ضروری ہے ایک کا نام قوت علمیہ اور دوسرے کا قوت عملیہ اور کوئی شخص ایسا نہیں جو اس میں اختلاف رکھتا ہو خواہ وہ دنیا کا طالب ہو یا دین کا طالب ہو وہ دنیا دار ہو یا دیندار وہ جاہل ہو یا عالم وہ منطقی ہو یا فلسفی ہو۔ آخر کوئی نہ کوئی کام تو کرے ہی گا اور کرنے کا تعلق ہے قوت عملیہ سے۔ اگر قوت عملیہ سے نہ ہو تو اس کام کو کر ہی نہ سکے گا اور قوت علمیہ سے اس کی حقیقت جانے گا اور اگر اتفاقی طور پر اس طرح کرے کہ قصد کو اختیار کو اس میں دخل ہی نہ ہو تو وہ بحث سے خارج ہے مثلاً کوئی تجارت کرتا ہے تو اس کو ایک تو تجارت کے اصول جاننا چاہیے اور پھر وہ اصول برتنا چاہیے کوئی شخص کھیتی کرتا ہے تو پہلے طریقہ کھیتی کا معلوم کرے پھر کھیتی کرنا چاہیے اسی طرح نوکری ہے کہ پہلے اس کے اصول جاننا چاہیے اس کے بعد قوت عملیہ سے کام شروع ہوتا ہے میں کہاں تک مثالیں عرض کروں۔ یہ بات اس قدر ظاہر ہے کہ زیادہ مثالوں کا محتاج نہیں۔ غرض انسان میں ایک قوت علمیہ ہے جس سے نفع و ضرر کو پہچانتا ہے دوسری قوت عملیہ ہے اور انسان میں اصل بھی دو کمال ہیں باقی جتنے کمال ہیں وہ سب اسی کی فرع ہیں اور عورتیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں پس ان کے بھی کمالات یہی دو ہوں گے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں اور اسی طرح جتنی کتابیں دین کی ہیں ان میں ان ہی کمالات سے بحث ہوگی جو دین کے متعلق ہوں گودنیا کے کمالات کی تحصیل بھی ناجائز نہیں سو قرآن شریف کے دو کام ہوں گے ایک تو کمالات دینی کا بتلانا دوسری جس عمل میں مضرت آخرت کی ہو اس سے روکنا جیسے طبیب کا کام ایک پرہیز کا اور دوسرے دوا کا بتلانا ہے۔ یہ اس کے ذمہ نہیں کہ لذیذ کھانوں کی ترکیب بتلایا کرے حکیم محمود خاں کے ذمہ یہ ہے کہ دواء اور پرہیز بتلا دیں گلگلہ پکانے کی ترکیب بتلانا یہ کام حکیم محمود خاں کا نہ ہوگا۔ اگر مریض نے اجازت چاہی کسی کھانے کی تو ترکیب اس کھانے کی خوان نعمت میں ملے گی۔ طبیب ہونے کی حیثیت سے ترکیب کھانے کی ان کے مطب میں نہ ملے گی۔ اگر کوئی ان سے کھانے کی ترکیب پوچھنے لگے تو ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمارا کام یہ

نہیں ہے جاؤ کسی باورچی سے سیکھو۔ اگر خوش ہو کر بتلا دیں تو یہ ان کی عنایت ہوگی مگر ان کے ذمہ نہیں ہاں ان کا یہ نصب ہے کہ جو چیز مریض کو مضر نہ ہو اسکی اجازت دے دیں اور اگر مضر دیکھیں تو روک دیں اسی طرح سے علماء کے ذمہ جو کہ قرآن شریف کے نقل کرنے والے ہیں یا یوں کہیے کہ قرآن شریف کے ذمہ دو چیزیں ہیں ایک امراض روحانی کی دوا بتلانا دوسرے پرہیز بتلانا اور یہ اس کے ذمہ نہیں کہ وہ دنیا کے کمالات کے طریقے بتلایا کریں کہ ربیع میں فلاں چیز بڑھتی ہے خریف میں یہ بڑھتی ہے مشین یوں چلتی ہے گھڑی یوں بنتی ہے پتلی گھریوں تیار ہوتا ہے کپڑا یوں بنا جاتا ہے۔ یہ قرآن شریف کے ذمہ نہیں ہے ہاں اگر آپ ان چیزوں کو کمال سمجھیں تو قرآن شریف اجازت دیتا ہے کہ ان کے کرنے میں حرج نہیں مگر یہ اجازت ہی تک ہے کہ آخرت کی مضرت نہ ہو جیسے طبیب جب کسی غذا میں مریض کے لئے مضرت دیکھتا ہے تو اس کو فوراً روک دیتا ہے اسی طرح شریعت جس وقت دیکھے گی کہ فلاں امر میں مضرت ہے آخرت کی اویہ بات مریض روحانی کو مضر ہوگی تو فوراً روکے گی سو قرآن شریف کی تعلیم کافی ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زراعت بھی ہو تجارت بھی ہو مشین چلانے کی ترکیب بھی ہو کپڑا بننے کا طریقہ بھی ہو بلکہ اس میں آخرت کے قوانین ہیں بعض تو مفصل ہیں اور جہاں کلام اللہ مجمل ہے وہاں حدیث سے اس کی تفسیر ہوگئی ہے اور یہ سب قرآن شریف ہے جو مختلف رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے باقی یہ کہ اس میں تجارت بھی ہو زراعت بھی ہو سو یہ عیب ہے کسی فن کی کتاب کے واسطے کہ اس میں مقصود اُردوسرے فن کے مسائل ہوں مثلاً طب اکبر میں امراض کا بیان ہے اس لئے کہ وہ طب کی کتاب ہے ایک شخص نے خیال کیا کہ کبھی ضرورت جوتے سینے کی پڑ جاتی ہے کبھی ضرورت تجارت وزراعت کی بھی واقع ہو جاتی ہے اس لئے اس نے طب اکبر میں یہ تصرف کیا کہ شروع میں دو ورق تو امراض اس کے لکھے پھر جو تیاں سینے کا بیان لکھ دیا۔ پھر دو ورق امراض حق کے لکھ دیئے اس کے بعد تجارت یا زراعت کے متعلق کچھ لکھ دیا یا پھر دو ورق امراض معدہ کے لکھے۔ پھر کچھ مضمون کپڑا سینے کا لکھ دیا بتلائے انصاف سے کہ ایسی کتاب کو دیکھ کر عقلاء کیا کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اب مذاق اڑائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ طب اکبر کا کمال نہ ہوگا اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں طب ہی کے مسائل ہوں اسی طرح قرآن شریف میں اگر ایسا ہوتا تو قرآن شریف کا کمال نہ ہوتا اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں دین کے طریقے بتلائے جائیں ہاں معاش سے ممانعت نہ ہونی چاہیے جبکہ طریقہ مباحہ سے ہو مقصود میرا یہ ہے کہ میں اپنی اس وقت کی تقریر میں جب لفظ کمال کہوں گا تو اس سے کمال دینی مراد ہوگا۔ سو کمال دینی دو چیزیں ہیں ایک قوت علمیہ اور ایک قوت عملیہ اور یہی دو کمال عورتوں کے لئے بھی ہیں پس حق تعالیٰ نے اس مقام پر تین کلمے ارشاد فرمائے ہیں ایک المحصنات یعنی حفاظت رکھی ہوئی بچائی ہوئی عورتیں دوسرا المؤمنات یعنی ایمان والی تصدیق کرنے والی عورتیں۔ میں پہلے ان ہی دو کلموں کو لیتا ہوں (الغفلات کا بیان آئندہ ہے) سو سمجھئے کہ ایمان نام ہے خاص

علوم کا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کی اطلاع رسول کی معرفت دی ہے اور ان باتوں کو سچا جاننا۔ ان علوم کا نام درجہ یقین میں ایمان ہے پس اس ایک لفظ میں اشارہ ہے قوت علمیہ کی طرف یعنی المومنات میں اور دوسرے میں اشارہ ہے قوت عملیہ کی طرف یعنی المحصنات

اور یہ دونوں کمال جب عورتوں کی طرف منسوب ہیں تو معلوم ہوا کہ جیسے مرد کامل ہو سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں اور جیسے خود مردوں کی نوع میں تفاوت ہے ایسے ہی عورتوں کی نوع میں بھی تفاوت ہے۔

اور عورتوں کے کمال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرد جیسے کامل ہوتے ہیں یہ ویسی ہو جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنی استعداد کے موافق کامل ہو سکتی ہیں خواہ مردوں کے برابر نہ ہوں اور عورتوں کے کمال کے حکم پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ تو بروئے نص ناقص ہیں پھر ان کو کامل کیسے کہا جاسکتا ہے بات یہ ہے کہ عورتوں میں دو قسم کے نقصان ہیں ایک تو مردوں کے نوع کے مقابلہ میں۔ سو اس کا تدارک تو غیر اختیاری ہے اور اکتساب کو اس میں دخل نہیں اور ایک اپنی نوع کے لحاظ سے اس کا تدارک ہو سکتا ہے اور وہ مکتسب اور اختیاری ہے اور یہ نقصان مبدل بکمال ہو سکتا ہے بہر حال عورتوں کو بھی ایک کمال علمی حاصل ہو سکتا ہے جس کو ایمان کہا گیا ہے۔ دوسرا کمال عملی حاصل ہو سکتا ہے جس کو احسان فرمایا ہے اور چونکہ ایمان نام ہے علوم خاصہ کا اور علم مقدم ہوتا ہے عمل پر اس لئے اس کا مقتضایہ تھا کہ المومنات کو مقدم لایا جاتا المحصنات پر المحصنات کو مقدم لانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ علم مطلقاً فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ اس کا زیادہ حصہ ذریعہ ہے عمل کا اور مقصود علم سے عمل ہی ہے۔

علم و عمل

پس چونکہ اس اعتبار خاص سے عمل مقدم ہے علم پر اس لئے المحصنات کو پہلے لائے اور المومنات کو بعد میں یہاں یہ نکتہ ہے مقدم لانے میں اور اعتبار خاص سے میں نے اس لئے کہا کہ دوسرے اعتبار سے علم مقدم ہے عمل پر وہ یہ کہ بدوں علم کے عمل نہیں ہو سکتا۔ مگر ہیں دونوں ضروری علم بھی اور عمل بھی یہ نہیں کہ جو شخص عمل نہ کرتا ہو وہ علم بھی حاصل نہ کرے جیسا بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عمل ہی نہیں ہو سکتا تو احکام جاننے سے وعظ سننے سے کیا فائدہ بات یہ ہے کہ جب دونوں فرض ہیں تو جس نے علم حاصل کیا گو عمل نہ کیا تو وہ ایک ہی جرم کا مجرم ہوا کیونکہ اس نے ایک ہی ضروری چیز کو چھوڑا اور جس نے علم بھی حاصل نہ کیا ہو وہ دو جرم کا مجرم ہوا کیونکہ اس نے دو ضروری چیزوں کو ترک کیا اور اس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ علم اس لئے حاصل نہیں کرتا کہ علم سے پھر عمل کرنا پڑے گا کیونکہ عمل تو پھر بھی فرض ہی رہے گا اس جاہلانہ عقیدہ پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص نے مسئلہ سنا تھا کہ چاند دیکھ کر روزہ فرض ہو جاتا ہے آپ گھر کے اندر گھس کر بیٹھ رہے کو اڑ بند کر لئے کہ نہ چاند دیکھوں گا نہ روزہ فرض ہوگا۔ کئی روز وہیں گزر گئے وہاں ہی کھانا وہاں ہی گھنا۔ بی بی پانچخانہ اٹھاتے اٹھاتے تنگ ہو گئی بس ہاتھ پکڑ

کر نکال باہر کیا جنگل میں آپ پہنچے قضاے حاجت کی ضرورت ہوئی تالاب کے کنارہ پر پہنچے سر جھکائے ہوئے تھے کہ کہیں چاند نظر نہ پڑ جائے بے چارہ اتنا جانتا نہ تھا کہ پانی کے اندر عکس ہوتا ہے تالاب کے کنارہ بیٹھے تو پانی میں چاند نظر پڑا اور روزہ فرض ہو گیا آپ کہتے بھلے ہیں ہم تو تجھے دیکھتے نہیں تو زبردستی آنکھوں میں گھسا جاتا ہے پس جیسے اس نے سمجھا تھا کہ جو چاند نہ دیکھے روزہ فرض نہیں ہوتا ایسے ہی بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر علم حاصل نہ کریں گے تو عمل ہی فرض نہ ہوگا سو یاد رکھئے کہ فرض دونوں چیزیں ہیں علم بھی اور اس اعتبار سے علم کا حاصل کر لینے والا گو اس نے عمل نہ کیا ہو اس سے اچھا ہے جس نے علم و عمل دونوں حاصل نہ کئے ہوں ہاں زیادہ مقصود بے شک عمل ہے اور اسی وجہ سے المحسنات کو مقدم لائے المؤمنات پر گویا اس میں عمل کی مقصودیت کی طرف اشارہ کر دیا کہ ہم یہاں اس کو اس لئے مقدم کرتے ہیں کہ عمل کو زیادہ مقصود سمجھو اور اس میں رد ہو گیا ان لوگوں کا جو محض تعلیم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے چنانچہ بعض لوگ علم دین حاصل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کمال حاصل کر لیا میں نے اس مذاق کے علماء کو دیکھے ہیں کہ بس علم حاصل کر کے اپنے کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور سارے مسلمانوں کو ہیچ در ہیچ سمجھتے ہیں اور ان کو ناز ہوتا ہے اپنے علم پر حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرماتے ہیں فرحوا بما عندہم من العلم کہ جو علم ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

صفات نسواں

ایک تو یہ کہ یہاں تین صفتیں بیان ہوئیں المحصنت، الغفلت، المؤمنات دو صفت میں توصیفہ اسلم فاعل کا لائے یعنی الغافلات المؤمنات مگر المحصنات صیغہ اسم مفعول کا لایا گیا محصنات صیغہ اسم فاعل کا ارشاد فرمایا گیا بات یہ ہے کہ اس طرح لانے سے ہمیں ایک سبق بھی دیا ہے جس کی ضرورت چودھویں صدی میں آ کر واقع ہوئی وہ یہ کہ اس میں مردوں کو پردہ کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ المحصنات کے معنی ہیں پارسا رکھی ہوئی عورتیں مرد ان کو پارسا رکھیں ان کے ذمہ ہے پارسا رکھنا معلوم ہوا کہ عورت اکیلی کافی نہیں جب تک مرد اس کو محفوظ نہ رکھے اسم فاعل کے صیغے سے یہ بات حاصل نہ ہوتی۔

اس لئے مفعول کا صیغہ لائے دوسری یہ بات کہ بیچ میں غافلات کا لفظ کیوں اس کی کیا ضرورت تھی بات یہ ہے کہ اس کے بیچ میں ہونے سے دونوں صفتوں میں اتصال ہو گیا اشارہ اس طرف ہے کہ قوت علمیہ اور عملیہ کا کمال اس پر موقوف ہے کہ وہ غافلات بھی ہوں یعنی ان کے خیالات محدود ہوں عرفی تبادلہ خیالات نہ ہوں تب ان کا علم و عمل مقصود باقی رہ سکتا ہے مردوں کے لئے تو وسیع خیالات کا ہونا کمال ہے اور عورتوں کے لئے یہ کمال ہے کہ غیر وسیع الخیال ہوں ان کا مکان بھی محدود آنا جانا بھی محدود ہو علم بھی محدود یعنی صرف دین ہی کا علم ہو اس زمانہ میں دونوں نکتوں کے مقتضائے خلاف کیا جا رہا ہے ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا

وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

تفسیری نکات

مسئلہ استیذان

یہ مسئلہ استیذان ان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان ان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہو اور یہ آیت مجمل ہے اس میں استیذان ان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا اور یہ مردانہ اور زنانہ دونوں کے لئے ہے لیکن مردانہ قطعات مختلف قسم کے ہوتے ہیں بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام وہاں استیذان ان کی ضرورت نہیں ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں استیذان ان کی ضرورت ہے بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرآن سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرآن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان ان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رخ بھی کریں کیوں صاحب اگر وہ آزاد نہ ہو تو طلب اجازت کیا ہوئی یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں۔

معاشرت کا ایک علمی نکتہ

معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف میں کئی مقام پر مذکور ہے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو

اور اس آیت کا بھی مدلول ہے جس کو شروع میں تلاوت کیا گیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا کہ اس میں معاشرت کے دو مسئلے بیان فرمائے گئے ہیں اور یہاں ایک علمی نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دو حکم یہاں مذکور ہیں اس میں اول کو ثانی پر کیوں مقدم فرمایا۔

سوجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ان میں دوسرا حکم اول سے اشد و اشق ہے کیونکہ تسبیح میں تو مجلس سے نہیں اٹھنا پڑتا اور انشروا میں مجلس سے ہی اٹھنا دیا ہے۔ اس لئے تفسیحاً کو مقدم کیا تا کہ تعلیم اور عمل میں تدریجی ترقی ہو۔ یعنی اول سہل پر عمل کرنے سے اطاعت کی عادت پڑے پھر اشد کا کرنا بھی آسان ہو اور عجب نہیں کہ حکم ثانی پر رفع درجات کا ترتیب بھی اسی لئے ہوا ہو۔

یعنی چونکہ انشروا کا حکم نفس پر اسی وجہ سے زیادہ شاق تھا کہ اس میں عار آتی ہے تو اس پر عمل کرنا غایت تواضع ہے اور تواضع کی جزا رفعت ہے۔ اس لئے اس پر رفع کو مرتب فرمایا۔

پس آیت میں دونوں حکموں میں عنوان کے اعتبار سے ایک تفاوت تو یہ ہوا کہ پہلے عمل کو فراخی پر مرتب فرمایا جو کہ عادتاً مال کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے اور مال کم درجہ کا مطلوب ہے اور دوسرے عمل پر رفع درجات کو مرتب فرمایا جو کہ جاہ کے ذریعے سے ہوتا ہے اور جاہ بہ نسبت مال کے اعلیٰ درجہ کا مطلوب ہے سو یہ تفاوت تو اسی لئے ہوا کہ عمل اول نفس پر سہل تھا اس لئے جزاء بھی اس کی دوسرے درجہ کی ہوئی اور عمل ثانی نہایت شاق تھا اس لئے جزاء بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوئی۔ تو عمل ثانی کے متعلق جو وعدہ ہے وہ گویا من تواضع اللہ رفعہ اللہ کا ہم مضمون ہوا کہ غایت تواضع کی وجہ سے رفع درجات کا ثمرہ مرتب ہوا۔

دوسرا تفاوت عنوان میں یہ ہے کہ ثمرہ اول میں لکم بتعمیم خطاب فرمایا اور ثمرہ ثانی میں یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم درجات، یہ تخصیص بعد تعمیم فرمایا۔ یعنی ثمرہ اول میں تمام مؤمنین کی درجہ مساوات میں خطاب عام ہے اور ثمرہ ثانی میں اہل علم کو تخصیص بعد تعمیم کے طور پر اہل ایمان میں سے خاص کر کے بھی خطاب فرمایا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ تسبیح کوئی امر شاق نہ تھا۔ اس میں بہت کم احتمال تھا نیت کے صاف اور خاص نہ ہونے کا۔ تو اس کے امتثال میں سب مؤمنین قریب قریب یکساں ہوں گے۔ بخلاف دوسرے عمل کے کہ نفس پر بہت شاق ہے اس میں احتمال ہے کہ بعضے لوگ محض وضع داری سے اٹھ کھڑے ہوں اور اس میں وہ مخلص نہ ہوں اور خلوص میں زیادہ دخل ہے علم کو کیونکہ اس سے اس کے وقائق معلوم ہوتے ہیں اس لئے اس میں علم والوں کی تخصیص بعد تعمیم فرمائی کیونکہ اہل علم میں امتثال بدرجہ اول پایا جائے گا اس لئے وہ خلوص میں دوسرے مؤمنین سے زیادہ ہوں گے۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ

أَرْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

حفاظت شرم گاہ کا بہترین ذریعہ

یہی نکتہ ہے کہ جس آیت میں غرض بصر اور حفاظت فرج دونوں کا حکم ہے اس میں حق تعالیٰ نے امر غرض بصر کو مقدم کیا ہے ارشاد ہے قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ یعنی کہہ دیجئے مؤمنین سے کہ اپنی نگاہیں نیچی کریں یعنی نظر سے بچیں اس حکم کو مقدم کیا دوسرے حکم پر یعنی یَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ پر یعنی اصل فعل سے بچنے پر اس کی وجہ یہی ہے کہ غرض بصر ذریعہ ہے حفاظت شرم گاہ کا اور ذریعہ آسان ہوتا ہے اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے معلوم ہوا کہ اصل فعل یعنی زنا سے بچنا اتنا آسان نہیں جتنا نظر کو بچالینا آسان ہے ثابت ہوا کہ غرض بصر کوئی زیادہ مشکل کام نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت مقدسہ نے آسانی کے واسطے تدبیر بتلائی ہے اور اسی واسطے پردہ کا حکم رکھا ہے لوگ کہتے تو ہیں کہ پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ اصل گناہ یعنی زنا نہ کیا جاوے پردہ ہو یا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ذرائع کو اختیار کرنے کے بعد بھی اگر مقصود میں کامیاب ہو جائے تو بہت ہے چہ جائیکہ ذرائع کو اختیار ہی نہ کیا جاوے اور کامیابی کی امید رکھی جائے میں کہتا ہوں کہ پردہ کے بعد بھی زنا سے بچ جاؤ تو بڑی بات ہے کیونکہ شیطان کے شر سے کہیں بے پردگی ہو جاتی ہے اور پردہ کو توڑ کر امید رکھنا کہ زنا سے حفاظت رہے گی محض حماقت ہے ان لوگوں نے شرعی انتظام کو بالکل لغو سمجھا ہے۔

پردہ کی ضرورت

ذرا بتائیں کہ یہاں یغضوا کو یحفظوا پر مقدم کرنے میں کیا حکمت ہے سوائے اس کے کہ حفاظت فرج کے لئے وہ ذریعہ ہے شریعت کو اتنا اہتمام حفاظت کا منظور ہے کہ اس کے لئے ذرائع کے اختیار کرنے کا حکم دیا نیز

شریعت کے نزدیک حفاظت فرج اس قدر مشکل ہے جس کے لئے ذریعہ کو ضروری بتلایا اور براہ راست کامیابی کو عادتاً ناممکن قرار دیا مگر یہ شخص جو پردہ کا مخالف ہے شریعت میں صلاح دینا چاہتا ہے کہ وہ تو ایک کام کو اتنا مشکل سمجھتی ہے اور یہ ان کو آسان سمجھیں صاحب تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جہاں پردہ نہیں ہے وہاں زبانی دعوے جو کچھ بھی ہوں لیکن زنا سے حفاظت مطلق نہیں ہے۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارهم ویحفظوا فروجهم ذلک ازکی لهم۔ سب سے اول مقدمہ اس بے ہودگی (یعنی زنا) کا بھی نظر ہے۔ اول نظر ہی پڑتی ہے پھر وسوسے آتے ہیں اس لئے چاہیے کہ ابتدائی مقدمہ کا پورا انسداد کرے۔

یعنی نگاہ کو پست رکھے پھر اور مفاسد اس پر مرتب ہی نہ ہوں گے۔ اسی واسطے ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے النظر سهم من سهام ابلیس کہ نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے۔ یہ ایسا تیر بے کمان ہے کہ نشانہ سے خطا ہی نہیں کرتا۔ اور پھر یہ کہ تیر تو چلایا اس نے مگر لوٹ کر اسی کے چبھ گیا۔ یہ ایسے غضب کی چیز ہے کہ اس کا مارا ہوا بہت کم بچتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اول اسی کا انسداد فرمایا ہے چنانچہ فرمایا قل للمؤمنین یغضوا من ابصارهم۔ آپ مومنین سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں۔

یہ غضب بصر مقدمہ ہے زنا سے محفوظ رہنے کا۔ باقی اگر کوئی شخص کہے کہ اندھے بھی تو زنا میں مبتلا ہوتے ہیں تو میں جواب میں حصر کا دعویٰ کرتا ہوں کہ بدوں نگاہ کے وہ بھی زنا میں مبتلا نہیں ہوتے جہاں کہیں بھی زنا میں ابتداء ہوگا نگاہ ہی کی وجہ سے ہوگا۔ البتہ نگاہ عام ہے خواہ نگاہ حقیقی ہو یا تقدیری۔

اندھوں کی نگاہ تقدیری ہوتی ہے۔ اندھے سوچتے ہیں تصور کرتے ہیں صورت کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ یعنی نگاہ قلب سے اس کو دیکھتے ہیں اور تصور سے مزے لیتے ہیں پھر زنا پر اقدام کرتے ہیں۔ عادتاً یہ ممکن نہیں کہ صورت کی طرف بالکل التفات نہ ہو اور پھر ایسی بے ہودگی سرزد ہو محض توجہ بلا واسطہ صورت سے کسی کی طرف رغبت نہیں ہوتی بلکہ یہ اندھے اپنے تصور میں امور خارجیہ سے استدلال کرتے ہیں اس کی صورت پر کہ وہ ایسی ہے اور ویسی ہے اس طرح دل کو رغبت ہوتی ہے۔

غرض میں حصر کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ شہوت کے متعلق جو خرابی ہوتی ہے نگاہ ہی سے ہوتی ہے اس لئے نگاہ کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ نگاہ تو برائے نام نیچی کر لیتے ہیں مگر ذیہ نظر سے کام کر رہے ہیں بزم خود یغضوا من ابصارهم پر عمل ہے مگر خدا کے خوف سے نہیں بلکہ محض نمائش کے لئے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ نگاہ بازی کرتے ہیں نگاہ تو نیچی کر لی مگر شعاعوں کو نہیں ہٹاتے حالانکہ شعاعوں کے ہٹانے پر قدرت ہے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ خود ادھر ادھر گوشہ چشم سے شعاعوں کو نکالتے ہیں اور ان ہی سے

اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں اسی کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعین خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق کے دکھانے کو نیچی نظر کر لینا کافی نہیں مخلص کو تو بہکالو گے مگر خدا کو کیسے دھوکہ دے سکتے ہو۔

گہہ گہہ آوے ود و غے میزنی	از برائے مسکہ دو غے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تاہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست	با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کاربا اور است باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا چاہیے اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعین و ماتخفی الصدور کہ اللہ تعالیٰ خیانت والی آنکھوں اور دلوں کے بھید کو بھی جانتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے کہ ان کی نگاہ تو ایسی آزاد نہیں نہ دیدہ بازی نہ دزدیدہ نظری ہے مگر ان کا مذہب یہ ہے دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

دل ہی دل میں خیال جما کر مزے لے رہے ہیں اس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں و ماتخفی الصدور کہ جو تمہارے دل میں چھپا ہوا ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

دیکھو! سنہلو! تعجب ہے کہ تم نے آنکھ کی حفاظت تو مخلوق کی وجہ سے کر لی مگر جس کی اطلاع محض خدا تعالیٰ کو ہے اس کی حفاظت نہ کی یعنی دل کی تو ہم کو خدا تعالیٰ کی شرم نہ ہوئی بلکہ لوگوں کی شرم ہوئی۔

یہ امور ہیں پیش نظر کرنے کے قابل۔ ان امور میں ہدی کو ہوس پر ترجیح دینے کا یہ طریقہ ہے کہ ایسے مواقع میں شریعت کے حکم پر عمل کرے محض اپنی خواہش و ہوی پر عمل نہ کرے۔ اس طرح انتظام رکھو گے تو نگاہ پست ہو جائے گی۔

مراقبہ خشیت

حق تعالیٰ نے اسی جگہ یعنی غرض بصر کی آیت میں قلب کی اصلاح کے لئے ایک طریقہ ارشاد فرمایا ہے یعنی ہم کو ایک مراقبہ سکھلایا ہے اس مراقبہ کو پختہ کرو تو اس مراقبہ سے خشیت پیدا ہوگی اور وہ خشیت ہی امراض قلب کا علاج ہے۔ خشیت کا ملکہ راسخ ہو جائے تو تقاضا معصیت کا نہیں رہتا اس مراقبہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے

قل للمومنین یغضوا من ابصارہم و یحفظوا افروہم ذلک ازکی لہم ان اللہ خبیر بما یصنعون
یہ ان اللہ خبیر بما یصنعون وہ مراقبہ ہے بس معصیت کے وقت اس کا مراقبہ کر لیا کرو کہ اللہ کو سب خبر ہے ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ سب سے خبردار ہیں اس سے خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا پھر معصیت کی ہمت نہ ہوگی کس قدر جامع تعلیم ہے سبحان اللہ! مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض یہ اعتقاد کر لو

اللہ میاں کو سب خبر ہے بلکہ اس کا استحضار و استمرار کرنا چاہیے یعنی دل میں ہر وقت یہ خیال حاضر رکھو کہ خدا تعالیٰ کو سب خبر ہے اس سے خوف پیدا ہوگا۔ ہیبت ہوگی یہ اصلاح قلب جو علم باطن کے متعلق ہے پس علم ظاہری تو محض افعال کا انتظام کرتا ہے اور علم باطن اسباب کا علاج کرتا ہے۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم ویحفظوا فروجہم
دوسری جگہ ارشاد ہے

الذین یمشون علی الارض ہوناً یعنی غاضین ابصارہم

سمت امن

اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بھکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں ثم لاتینہم من بین ایدیہم و من خلفہم و عن ایمانہم و عن شماء لہم۔
اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا یعنی فوق اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں لیکن اوپر سے مراد وہلی کے چاندنی چوک کا کوٹھا نہیں بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا اس لئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام، خلف، یمن، شمال ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نظر بد سے بچنا غیر اختیاری نہیں

ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہو گئے تھے مگر نظر بند میں مبتلا تھے غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس میں کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا کہ سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لئے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی دوسری تدبیر پوچھیں گے۔ اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لئے اور تدبیر پوچھیں گے۔ اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ بس سہولت کی فکر نہ کیجئے۔ بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے۔ اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہو جائے گا۔ اس کے بدوں زوال ممکن نہیں وہ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں۔ وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے۔

لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا الْاَوْسَعَهَا

کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے

دوسری طرف یہ ارشاد ہے

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ ابْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ

کہ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو اپنے رکھیں اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ پیچی کرنے پر بندہ قادر ہے۔ اس لئے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویل میں نکالتے رہے مگر گھر جا کر جو انہوں نے اس میں غور کیا اور خط بھیجا کہ واقعی میں غلطی پر تھا۔ انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے۔ البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے اس کے بعد یہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر عادت ہو جاتی ہے۔ صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کے ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آ سکتا ہے۔ صاحبو! تمہارے ساتھ دو لشکر ہیں۔ ایک ملائکہ اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے بچائے اور دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان لشکروں کی ہار جیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے۔ جس کی طرف تمہارا ارادہ ہو جائے وہی غالب ہو جائے گا۔ اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کر لیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہو گیا۔ اب وہ غالب نہیں ہو سکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کر لیا تو لشکر شیطان مغلوب ہو گیا۔ اب وہ کبھی غلبہ نہیں کر سکتا۔ افسوس آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں۔

ظلمت معصیت

صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں۔ ہاں یوں کہئے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں۔ گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے اس میں کسی طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی۔ کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کہ صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔ بتلائیے ان گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کر رہے ہیں جو کہ قانون کی رو سے ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے۔ ڈاکہ کوئی نہیں مارتا۔ چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانون ناجرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدوں ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اس کا یہ عذر قبول کر لے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا؟ یا چور یہی عذر کرنے لگے تو کیا اس کو رہا کر دیا جائے گا؟ حاکم صاف کہہ دیتا ہے

کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے۔ تم نے خلاف قانون کام کیا ہے تم کو پھانسی دی جائے گی۔
اے اللہ کے بندو! ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا۔ وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے
کچھ تو شرمانا چاہیے۔ (المراد ملحقہ مواعد دنیا و آخرت ص ۲۹ تا ۴۱)

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ

عَلَى جُيُوبِهِنَّ

ترجمہ: اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی
رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس
(موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا رہتا ہے (جس کے ہر وقت چھپانے میں حرج ہے) اور اپنے
دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔

تفسیری نکات

چہرہ اور بازوؤں کے پردہ میں داخل ہونے کی مدلل بحث

بعض لوگوں نے آیہ نور لایسیدین زینتھن الاما ظہر منها میں ماظہر منها کی تفسیر جو وجہ اور کفین
کے ساتھ منقول ہے اس سے عدم وجوب استتار وجہ کفین پر استدلال کیا ہے آیا یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟
اول ماظہر منها کی تفسیر متعین نہیں۔ یہ قول ابن عباسؓ سے منقول ہے اور حضرت ابن مسعودؓ سے اس کی
تفسیر ثیاب و جلباب کے ساتھ منقول ہے۔ والقولان مع اقوال اخر منقولان فی الدر المنثور۔ جب یہ
تفسیر محتمل ہوئی تو محمل سے استدلال صحیح نہیں کیونکہ قول اخیر پر آیت میں وجہ کفین کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں اور
بعد تسلیم بھی یہ استدلال باطل ہے اور منشاء اس کا جہل ہے پانچ امر سے۔ ۱۔ خود جملہ ظہر منها کے معنی سے بھی
۳۲ اور لایسیدین کے سابق (بالمواحدہ) و سیاق (بالتخانیۃ) سے بھی ۵۴ اور اس آیت سے مقدم فی النزول بعض
آیات سے بھی اور دوسری موخر فی التلادۃ غیر معلوم التقدم والتاخر فی النزول آیت سے بھی چنانچہ سب کے متعلق
عرض کرتا ہوں۔ امر اول۔ ماظہر فرمانا اور ماظہر نہ فرمانا (باوجودیکہ اور سب صیغ مذکورہ فی الآیۃ میں فاعل
نساء کو قرار دیا گیا ہے جیسے یعضضن۔ یحفظن۔ لایسیدین۔ یضربن۔ بخمرھن۔ لایضربن بار جلھن

دال ہے اس پر کہ یہ ظہور من غیر اظہار ہے۔ امر ثانی یغضضن من ابصارهن و یحفظن فروجهن۔
 امر ثالث۔ لا یضربن بارجلھن۔ امر رابع سورۃ احزاب کی (جو کہ سورۃ نور سے نزول میں مقدم ہے کذا فی الاتقان) آیتیں قولہ تعالیٰ و قرن فی بیوتکن و قولہ تعالیٰ و اذا سالتموهن متاعا و قولہ تعالیٰ یدنین علیھن من جلابیھن۔ امر خامس۔ آیہ و القواعد من النساء اللاتی لا یرجون نکاحا اور چونکہ ان امور خمسہ میں کوئی تعارض نہیں۔ کما سیوضح اور اسی لئے کسی نے ان میں مؤخر کو مقدم کا ناخ نہیں کہا اس لئے یہ پانچوں کے پانچوں واجب الاخذ ہونگے پس مجموعہ امور خمسہ پر نظر کر کے تقریر مقام کی یہ ہوگی کہ آیت و قرن فی بیوتکن اور آیت و اذا سالتموهن سے عورتوں پر استتار اشخاص کا واجب کیا گیا اور اصل حکم اور عزیمت یہی ہے لیکن کبھی خروج عن البیت کی بھی حاجت واقع ہوتی ہے ایسی حالت میں یدنین علیھن من جلابیھن سے اظہار اشخاص میں رخصت دی گئی اور استتار ابدان کو واجب فرمایا گیا پھر کبھی گھر سے بعض کوجن کے پاس خادم نہ ہوں بعض اسے کاموں کی ضرورت واقع ہو جاتی ہے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اور اس لئے ہاتھ کا استتار موجب حرج ہوتا ہے اور کام کرنے کے وقت اس کام کے دیکھنے کی بھی حاجت نہیں ہے اور گھونگٹ سے منہ چھپانے میں وہ گھونگٹ ابصار میں حائل ہو جاتا ہے اور اس لئے چہرہ کا استتار بھی موجب حرج ہوتا ہے ایسی حالت میں الا مظهر منها سے بنا بر تفسیر مشہور صرف اظہار وجہ و کفین کی رخصت دی گئی ہے اور بقیہ بدن کے استتار کو واجب فرمایا گیا اور چونکہ یہ ضرورت بوجہ خدمت مولیٰ کی اماء میں زیادہ وسیع تھی اس کی رخصت میں زائد توسیع کی گئی۔

کما ہو مبسوط فی کتب الفقہ۔ پس جواز اظہار وجہ کفین صرف حالت حرج فی الاستتار کے ساتھ مخصوص ہے اور بعض نے قد میں کو بھی کفین کے ساتھ ملحق کیا ہے اور بعض نے لبس خفین کے مانع مشی نہ ہونے کے دونوں میں فارق بتلایا ہے اور اس تقیید بحالۃ الحرج پر دلائل مستقلہ کے علاوہ خود صیغہ ظہر میں بھی دلالت ہے جس کی توجیہ یہ ہے کہ عورت اپنے کسی عضو کو جو کہ تفسیر ہے زینت کی (خواہ بالمطابقۃ گو مجازاً بھی ہو خواہ بالالتزام المعتمر عند اہل العربیۃ اس طرح کہ جب زینت جو کہ ملبس ہے اظہار جائز نہیں۔ تو مواضع زینت کا جو جزو ہے اظہار تو کیسے جائز ہوگا) ہرگز ظاہر نہ کرے (وہذا مدلول قولہ تعالیٰ ولا یدین زینتھن) لیکن اگر ایسی حالت ہو کہ اس میں وجہ و کفین کا استتار کا قصد و اہتمام بھی کرتی ہے تب بھی وہ اضطراراً بقصد اظہار خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں کیونکہ اس ضروری کام کے ساتھ استتار جمع نہیں ہوتا ایسی حالت میں بمعیار الضروری یتقدر بقدر الضرورة اس عارض کے سبب اسی قدر ان کی کشف کی اجازت ہے پس یہ حکم عارض کے سبب ہے اور اصلی حکم وہی استتار ہے۔ پس استثناء کے یہ معنی ہیں نہ یہ کہ اصلی حکم بالقصد وجہ و کفین کا کشف ہو اور استتار کسی عارض سے ہو۔ اور اس کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مقام اپنے سیاق و سباق سے انسداد فتنہ کو مقصود بتلارہا ہے

چنانچہ یغضضن اور یحفظن اور لایحفظن اور لایضر بن بار جلہن سب اس انسداد کی مقصودیت میں نص ہے اور احادیث نے تو فتنہ کے اسباب بعیدہ تک کا انسداد کیا ہے تو ایسی حالت میں وجہ و کفین اور خصوص وجہ کا (جو کہ مبنی ہے تمام فتن کا اور اس کا انکار نہ صرف بصیرت بلکہ بصارت کے فقدان کا بھی اقرار ہے) قصداً انکشاف آیت کا مدلول کس طرح ہو سکتا ہے ورنہ اجزاء آیت میں تعارض ہو جاوے گا کہ ادنیٰ عاقل کے کلام میں بھی ممتنع ہے تو حکیم علی الاطلاق کے کلام میں کیسے جائز ہوگا اور یہ مسئلہ خود مستقل ہے کہ وجوب استتار وجہ و کفین اور وجوب استتار بقیہ بدن یہ دونوں وجوب ایک نوع سے ہیں یا دونوں سے مثل فرض علمی و عملی کے جس کا مشہور عنوان یہ ہے کہ ان میں کوئی عضو عورت فی نفسہ ہے کون نہیں سو یہاں اس سے بحث نہیں۔ جو امر یہاں مقصود ہے یعنی مطلق وجوب استتار اس میں یہ سب برابر ہیں جیسے عورت غلیظہ و غیر عورت غلیظہ نفس وجوب ستر میں برابر ہیں مگر غلظ و عدم غلظ میں متفاوت ہیں اور چونکہ عادتاً ہاتھ سے کام کرنے میں اگر خاص طور پر خیال نہ رکھا جاوے۔ سر اور گلا کھل جاتا ہے اس لئے و لیضر بن بخمرہن سے اس کا انتظام فرما دیا۔ پھر یہ حکم اصلی وجوب استتار وجہ و کفین بنا بر اطلاق الفاظ آیت عام تھا شواہد و عجز کیلئے۔ آیت و القواعد من النساء الخ اس وجوب سے عجز کو مخصوص و مستثنیٰ کر دیا۔ گواستحاب ان کے لئے بھی ثابت ہے بقولہ تعالیٰ وان يستعففن خیر لهن۔ باقی وجہ و کفین کے علاوہ بقیہ بدن کا وجوب استتار اب بھی عام ہے چنانچہ سر وغیرہ کھولنا عجز کیلئے بھی حرام اور آیت و القواعد الخ کو مخصوص کہنے کا مبنی وہ اصولی قاعدہ ہے کہ جب خصوص کی دلیل کلام مستقل موصول ہو تو وہ دلیل عام کیلئے مخصص ہو جاتی ہے اور غیر معلوم التراخی حکم موصول میں ہے۔ پس بعد تخصیص حاصل حکم کا یہ ہوا کہ شواہد کیلئے تو استتار وجہ و کفین بجز موقع حرج کے بحالہ واجب رہا اور عجز کیلئے صرف مستحب ورنہ اگر شواہد کیلئے وجہ و کفین کا کشف جائز ہوتا تو پھر آیت میں و القواعد کی تخصیص بیکار تھی۔ اس تقریر سے استدلال کا سقوط واضح ہو گیا اور یہ سب احکام اجانب کے اعتبار سے تھے اور محارم و امثالہم کا حکم دوسرے جملہ لایسیدین زینتہن الخ میں مذکور ہوا ہے جس کی تقریر بیان القرآن میں ہے اس تقریر کے بعد بفضلہ تعالیٰ نہ کسی محقق پر کوئی اشکال و اعضاء رہا نہ کسی مبطل کیلئے مجال مقال کا احتمال رہا فقط۔

(تنبیہ) اور یہ سب تفصیل جواز یا عدم جواز انکشاف لہا جانب یا لہا قارب عورت کے فعل میں ہے باقی مرد کا جو فعل ہے نظر کرنا اس کا جدا حکم ہے یعنی جواز انکشاف جواز نظر کو مستلزم نہیں پس جس صورت میں عورت کو کسی عضو کا کھولنا جائز ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مرد کو اس کا دیکھنا بھی جائز ہو بلکہ وہ محل محترم میں یا احتمال شہوت میں بحالہ غض بصر کا مامور ہے گا۔ چنانچہ خود آیت میں اس عدم استلزام کی دلیل موجود ہے یعنی مرد کا بدن بجز مابین السره الراکبہ جائز الا انکشاف ہے مگر عورت کو پھر بھی حکم ہے یغضضن من ابصارہن خوب سمجھ لو (بوادرا النواذر)

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ
 الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ
 شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ
 وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ
 وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ فِي
 بُيُوتِ أَذْنِ اللَّهِ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ
 وَالْآصَالِ ۝ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ
 الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ
 وَالْأَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَ هُمُ مَنْ
 فَضَّلَهُ ۝ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے۔ آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور (ہدایت) کی حالت عجیب ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل) ایک طاق میں رکھا ہے (اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت ہے) کو (کسی آڑ کے) نہ پورب رخ ہے ورنہ پچھتم رخ ہے اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نور علی نور ہے (اور) اللہ تعالیٰ (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے رہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے اور ایسے گھروں میں (جا کر) عبادت کرتے ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان

کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔ ان (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں) میں بیان کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور) ایسے دن (کی دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جاویں گی۔ انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار دے دیتا ہے۔

تفسیری نکات

نور چراغ سے تشبیہ

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت۔ مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی کیوں کہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے۔ اس پر اگر یہ سوال ہے کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جمی جتنی اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس (اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ نور قمر کا مستفاد من الشمس ہونا تو اہل علم ہی میں مشہور اور چراغ کا نور مستفاد ہونا دیا سلائی یا چقماق کی آگ سے ہر شخص کو مشاہدہ ہے اور خود نص میں اس کا ذکر ہے یکاد زیتھا یضیی ولولم تمسسہ نار میں۔ پس میرے خیال میں نور قمر سے تشبیہ نہ دینے کی وجہ یہ کی جائے تو اچھا ہے۔ کہ قمر میں محاق کا عیب ہے کہ کبھی ہلال ہے کبھی بدر کامل ہے کمال کے بعد زوال ہے۔ ولیس نور اللہ کذلک۔ نیز اصل سوال کا جواب سہل یہ ہے نور شمس و قمر دونوں میں یہ نقص ہے کہ اسے روشنی حاصل کرنے میں کسی کے کسب و طلب و اختیار کو دخل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے نور سے استفادہ کرنے میں کسب و طلب و عمل کو دخل ہے کہ جو کوئی اپنے قلب کو مثل زجلجہ کو کب دری کے صاف شفاف کرے اور اس میں ذکر اللہ و عشق اور اخلاص کا زیت مبارک بھر لے تو نور کہ نور شمس و قمر گوا قوی ہے مگر اس کی طرف انسان کو احتیاج اس قدر قاصر فی الذہن نہیں ہے جس قدر نور مصباح کی احتیاج قاصر فی الذہن ہے کیونکہ شمس و

قمر کا طلوع و غروب عادت کے موافق خود ہوتا رہتا ہے بہت سے آدمیوں کو اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا اور مصباح کی ضرورت کی طرف ہر ایک کو التفات ہوتا ہے۔ رات کے وقت ہر شخص کو اس کی طلب ہوتی اور اس کی طرف التفات بھی ہوتا ہے۔ **هَذَا مَا عِنْدِي وَ كُلُّ ذَلِكَ مِنْ قَبِيلِ الذِّكَاةِ وَ لَعَلَّ هَذَا احْسَنُ وَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ** از حضرت مرشدی مولانا ظفر احمد صاحب دامت فیوضہم تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے نور میں کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے (اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے۔ واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے) مگر یہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں کہ اس سے کوئی نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ نور حق دوسروں کو منور بھی کرتا ہے اور منور بھی گود دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے۔ شمس و قمر میں نہیں ہے۔ (غایت النجاح فی آیۃ النکاح ص ۲۹)

لفظ نور کا معنی

نور کہتے ہیں اس کو جو ظاہر نفسہ و مظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔ بس حقیقت یہ ہے نور کی اب اللہ نور السموات کی تفسیر میں استغارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سموات اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطہ سے خود بھی ظاہر ہے۔ بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔

ترجمہ: خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں قلوب اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے کام کا بدلہ دیں گے اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

خلاصہ آیت

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں ان خالص لوگوں کی جن میں خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہئے کہ وہ صفات ہم اپنے اندر پیدا کریں مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے کہ فقط

تذکرہ میں تو ان کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر (مال کمانے پر) قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں مگر ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا بتلائیے کہ اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت بھی ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ باتیں بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آ جاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے سب کے منہ تک رہا ہے مگر کھاتا نہیں صرف تعریف کرنے ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ انصاف سے کہیے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل کہے گا ہرگز نہیں مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملہ میں عقلاء اور اہل الرائے اس بات کو تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جس کی اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے۔

اعمال قرب حق سبحانہ و تعالیٰ

غرض یہ آیت رجال لا تلهيهم تجارة الخ جن کو تجارت نہیں غافل کرتی الخ جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے ان ہی اعمال کو شامل ہے جن کو حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔ اب وہ صفات سنئے کیا ہیں۔ بعض ایک ہی میں گرفتار ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ ہمیں جنت و دوزخ درکار نہیں اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے۔ عمل تو وہ کرے جو جنت کو جائیں اس سے مطلب ہی نہیں ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیے۔ جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے۔ قرب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اعمال کی ضرورت ہے۔ اب ان اعمال کو سنئے ارشاد فرماتے ہیں لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله الخ (ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی اپنے اچھے بندوں کو ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے باقی بعضوں کا یہ خیال بالکل ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے کام پورے کر لیں اس کے بعد دین حاصل کر لیں گے کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ کار دنیا کے تمام نہ کرو

انوارات مقصود نہیں

آگے ارشاد ہے يخافون يوما تتقلب فيه القلوب والابصار (وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ اس دن دل اور آنکھ الٹ پلٹ ہو جائیں گی) اس میں عجب کا علاج ہے یعنی ان کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں۔ یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے قلوبهم و جلة انهم الى

ربہم راجعون۔ (ان کے دل ڈرتے ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں) پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اس دن سے کہ الٹ پلٹ ہو جائیں گے اس میں دل اور آنکھیں۔ مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے بھی خوف ہے عجب نہیں۔ وہ اپنے اعمال کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو عمل کو ہیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو جیسے آجکل اکثر کی یہ حالت ہے کہ جہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے حضرت حاجی صاحب ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے۔ کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد ہیں مگر لوگ ان ثمرات مانعہ ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لٹو دے کر یا پیسہ دے کر بہلاتے ہیں اسی طرح مبتدی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے سو مقصود کام ہی ہے اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں تاکہ ذکر اللہ کا چسکہ لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں ان کو مذموم نہ سمجھنا چاہیے اگر خود آئیں آنے دو۔ ان کے دور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں۔ نہیں آتے بلا سے مت آؤ اور اس آیت میں یخافون یوماً (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا اس سے خوف کرتے ہیں حالانکہ بظاہر یخافون زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوی اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کا ڈر نہ یوم آخرت سے خوف صرف خدا ہی سے تعلق محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو یہ عبدیت کے خلاف ہے اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے نہ کہ ان چیزوں کی ذات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غیر مودع ولا مستغنی عنہ رہنا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں ہم تو بندے ہیں ہر حال اور ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں اور اہل طریق کا جو قول

ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاؤ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغنا ہونا چاہیے باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق رکھے تو اس سے استغنا نہ ہونا چاہیے بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے یہ عین عبدیت ہے۔

تفسیری نکات

پس آیت میں لفظ یومالاکر سالک کو علو سے عبدیت کے مقام پر اتارتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے وہ تو خدا کی چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں پس یومالانے میں یہ نکتہ ہے اور بعض مقام پر یخافون ربہم (اپنے رب سے ڈرتے ہیں) فرمایا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے اسی لئے صوفیا کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہیے۔ آگے فرماتے ہیں لیجزیہم اللہ اس میں لام عاقبت ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے ان کا یہ انجام ہوگا ان کو یہ ملے گا احسن ماعملوا میں احسن اور ماعملوا (جو انہوں نے عمل کئے ہیں) ایک ہی چیز ہے لفظ احسن سے یہ بتلادیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے پس یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں۔ جیسے ہم چنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی ہوؤں کے ساتھ کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ نیک عمل کیسا ہی ہو۔ سب احسن ماعملوا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم نا چیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں قرآن میں تذکر کیا جائے تو جا بجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

واللہ یدعوالی دار السلام کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلا تے ہیں۔

واللہ یدعوالی الصلوٰۃ والزکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی طرف بلا تے ہیں۔

اگر ابتداء یوں فرمادیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادت کی طرف بلانے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تا کہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزاء بقدر مجزی بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزاء ہونی چاہیے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں۔ ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جائے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہیے تھی۔ کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے کیونکہ محدود کی

جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔
ويزيلهم من فضله اور زیادہ دیں گے ان کو اپنے فضل سے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں
گے مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف
تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہوتا
کہ ہمارے اعمال شاید بچے جیسے ہوں یعنی ان میں خاصیت ہونشونما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا من فضله
کہ تمہارے اعمال بچے و بچے کچھ نہیں جنت بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ آگے ارشاد ہے۔

والله يرزق من يشاء بغير حساب اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دیتے ہیں۔
یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں۔ ان کو کوئی
روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب
نہیں بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

مؤمن کا مال اصلی

صاحبو! یہ ہے مؤمن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مال میں کام آوے وہ ہے
مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے دونوں جہاں میں اسی کو
ارشاد فرماتے ہیں۔

من عمل صالحاً من ذكراً و انثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم اجرهم
باحسن ما كانوا يعملون۔

کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مؤمن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے یعنی ایسی
زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون و اطمینان ہوگا اور آخرت میں ان کے نیک
اعمال کی کامل اجرت دیں گے۔ ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة ضنكاً ونحشره يوم القيمة اعمى یعنی جس نے
منہ پھر امیری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا
داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت
جس کا نام ہے وہ میسر نہیں۔ بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ
سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصلی مال اس کو کہنا چاہیے۔ دنیوی
مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یمیل الیہ القلب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی

مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔

آیت کی تفسیر

اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے دوسرے دلالت النص کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آگئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو تو ان صفات کو اختیار کرے تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آ جاوے جیسا لا تلہیہم اس میں نص ہے یعنی صفت تو اس کی عبدیت ہو اور تعلق الوہیت سے ہو پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبدیت کو اس طرح جمع کیا جائے اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور شان عبدیت کی ہو۔

رجال ترکیب میں فاعل ہے ایک قراءت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقدر کا جس پر یسبح ماقبل کا فعل دلالت کر رہا ہے کیونکہ اسی جگہ قراءتیں دو ہیں یسبح بصیغہ معروف اور یسبح بصیغہ مجہول ہے۔ اس قراءت پر یہاں یسبح بصیغہ معروف مقدر کیا جائے گا۔

لا تلہیہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ ان کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا رجال لا یتسجرون کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی ذکر اللہ و تجارت کو چھوڑا تا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

لا تلہیہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔ کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا خود مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے لا تلہیہم ذکر اللہ عن التجارة یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں عن ذکر اللہ و اقام الصلوة و ایتاء الزکوۃ۔ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر اللہ اور نماز اور زکوۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل جوارح عبادت بدنی

ہے۔ زکوٰۃ عبادت مالی ہے مطلب یہ ہے کہ تجارت و بیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے اس میں یہ بھی بتلادیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں بلکہ قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں کیونکہ اس میں تعین وقت کی قید نہیں۔ وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے کسی کلام میں اس سے حرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے جیسے نماز ہی ہے مثلاً اس میں وقت کا اس لئے تعین ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات میں بڑی دقت پیش آئے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس کا ضرر ظاہر ہے اور تعین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اس کو کہتے ہیں۔

سلوک کی ابتداء

سبح اسم ربک الاعلیٰ اپنے برتر رب کے نام کی پاکی بیان کرو۔

میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتداء بیان فرمائی ہے سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ اسی واسطے سبح ربک الاعلیٰ (اپنے برتر رب کی پاکی بیان کرو) نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ بھی لائے۔ گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتدا نام ہی سے کرو

لَا تَلْهِیْہُمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ الْخ

ان کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا اور اگر چند دن ایسا کر کے کبھی اعتراض کرو کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا۔ تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو۔ اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر ہوگا۔ آگے ارشاد ہے۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا

ترجمہ: تم لوگ رسول کے بلائے کو ایسا (معمولی بلانا) مت سمجھو جیسا کہ تم میں ایک دوسرے کو بلاتا ہے

تفسیری نکات

ادب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب یہ ہے۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (پ ۱۸) کہ آپس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس طرح نہ لیا کرو جس طرح ایک دوسرے کا نام لیتے ہو۔

نیز ارشاد ہے: ان الذين ينادونك من وراء الحجرة اكثرهم لا يعقلون (پ ۲۶) یعنی جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر کھڑے ہو کر آپ کو نہ بلاؤ بلکہ اس کا انتظار کرو کہ آپ خود باہر تشریف لائیں تو اس وقت ملو اور بات چیت کرو۔

ولو انهم صبروا حتى تخرج اليهم لكان خيرا لهم (پ ۲۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنے اساتذہ کا ایسا ہی ادب کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں بعض دفعہ کسی حدیث کے لئے کسی انصاری صحابی کے گھر پر دوپہر کے وقت پہنچا اور دروازہ بند دیکھا تو وہیں بیٹھ گیا اور ان کو آواز نہیں دی سارا وقت دوپہر کا دروازے پر گزار دیا۔ جب وہ خود ہی نماز کے لئے باہر نکلے اس وقت ان سے ملے اور حدیث سنی۔ حالانکہ عبداللہ بن عباسؓ اہل بیت نبوت سے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں۔ اگر کسی کو باہر سے آواز دے لیا کرتے تو ان کو گراں نہ گزرتا بلکہ وہ خوشی کے ساتھ باہر آتے مگر استاد کا ادب یہی ہے کہ اس کو دروازہ پر کھڑے ہو کر نہ پکارا جائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔ علم اسی طرح آتا ہے (اور جن لوگوں نے استادوں کا ادب نہیں کیا ان کو علم نہیں آیا گو کتابیں ختم ہو گئی ہوں مگر کیا کتابیں ختم کر لینے ہی کا نام علم ہے؟ ہرگز نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو جاہل نہ قرار دیتے اور ان کے لئے مثل الذين حملوا التوراة ثم لم يحملوها كمثل الحمار يحمل اسفارا ارشاد نہ فرماتے۔

جب استاد کا بھی ادب لازم ہے اور اس سے زیادہ باپ کا اور اس سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہے تو اب خود سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ادب کس درجہ کا ہونا چاہیے لیکن آج کل عام طور پر لوگ مخلوق کا تو ادب بہت کرتے ہیں مگر خالق کا ادب نہیں کرتے اور اس مرض میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں۔

ادب کا مدار عرف پر ہے

حق تعالیٰ کی شان میں بعض علماء بھی ایسے الفاظ کہہ جاتے ہیں جو حضور کی شان میں وہ استعمال نہیں کر سکتے۔ البتہ صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کے لئے خلاف ادب نہیں کیونکہ اول تو یہ عرف عام ہو گیا ہے اور ادب کا مدار عرف ہی پر ہے ورنہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے لطیفہ سے سب کو خاموش ہونا پڑے گا۔ جیسا ایک عالم کو آپ نے خاموش کر دیا تھا۔

آپ نے اس سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص فرش پر بیٹھا ہو اور قرآن کو رحل پر رکھے ہوئے پڑھ رہا ہو اور دوسرا آدمی پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاوے یہ جائز ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب نے کہا جائز نہیں کیونکہ اس میں قرآن کی بے ادبی ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ اگر قرآن کے سامنے کوئی کھڑا ہو جائے تو یہ کیسا؟ کہا یہ جائز ہے مولانا نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے چار پائی پر بیٹھنے میں اگر بے ادبی پیروں کی ہے تو پیر تو پلنگ پر بیٹھنے والے کے بھی نیچے ہیں اور اگر بے ادبی سرین کے اونچے ہونے سے ہے تو سرین کھڑے ہونے والے کے بھی اونچی ہیں۔ وہ مولوی صاحب حیران ہو کر خاموش ہو گئے۔ اگر فقیہ ہوتے تو کہہ دیتے کہ ادب کا مدار عرف پر ہے اور عرف میں پہلی صورت کو بے ادبی اور دوسری کو ادب شمار کیا جاتا ہے مولانا اسماعیل شہید کے مزاج میں شوخی یعنی زندہ دلی بہت تھی اس لئے ان کے یہاں ایسے لطیفے اکثر ہوتے رہتے تھے جن کا جواب کوئی ان ہی جیسا دے سکتا تھا۔ ہر شخص نہ دے سکتا تھا۔

اور ہمارے ماموں امداد علی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شوخی مزاج دلیل ہے نفس کے مردہ ہونے اور روح کے زندہ ہونے کی اور متانت دلیل ہے روح کے مردہ ہونے اور نفس کے زندہ ہونے کی۔ اکثر اہل اللہ شوخ مزاج یعنی زندہ دل ہوتے ہیں۔

بہر حال ادب کا مدار عرف پر ہے فقہانے اس کو خوب سمجھا ہے چنانچہ لاسقل لهما اف کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ حقیقت اس نہیں کی ایذاء والدین سے منع کرنا ہے یہاں تافیف موجب ایذاء ہو وہاں حرام ہے اور اگر کسی وقت عرف بدل جائے اور تافیف موجب ایذاء نہ ہو تو حرام نہیں اور فقہانے جو بعض احکام میں تغیر عرف کی وجہ سے بدلنے کا حکم فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام حقائق کے متعلق ہوتے ہیں اور عرف کے بدلنے سے وہ حقیقت نہیں بدلتی جس سے تعلق حکم کا تھا صرف عرف سے اس حقیقت کی صورت تحقق بدل جاتی ہے۔ سو صورت مدار حکم نہیں۔ مثلاً جس حکم کا مدار ایذاء پر تھا وہ ایذاء ہی پر مرتب ہوگا۔ بدوں ایذاء کے حکم ثابت نہ ہوگا پس اگر ایک لفظ کسی قوم کے عرف میں موجب ایذاء ہے وہاں وہ تلفظ حرام ہوگا اور دوسری قوم کے نزدیک موجب ایذاء نہیں وہاں تلفظ حرام نہ ہوگا۔

جیسے سر کا ہلانا ہمارے یہاں ایک ہیئت سے یعنی فوق و تحت کو اقرار کے لئے ہے اور ایک ہیئت سے یعنی یمین و شمال کو انکار کے لئے مگر حیدر آباد میں ہمارے یہاں کی انکاری ہیئت بہت لطیف فرق سے اقرار کے لئے بھی ہے تو وہاں اس فرق کے جاننے والے کی نظر میں اس سے اقرار ہی مفہوم ہوگا انکار مفہوم نہ ہوگا اور جو شخص وہاں کے عرف سے ناواقف ہوگا وہ بڑا پریشان ہوگا۔

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلِيكَةُ

أَوْ نَرَى رَبَّنَا لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ﴿۱﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ اس کے منکر ہیں) وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

تفسیری نکات

یعنی جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد سے بہت دور نکل گئے) اور دوسری آیت میں ارشاد ہے جاہل لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بات کرتے یا ہمارے پاس کوئی (فرمانی) نشانی کیوں نہیں آتی جو لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں وہ بھی ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ ان سب کے دل یکساں ہیں ہم نے آیتیں بیان کر دیں اس قوم کے لئے جو یقین کرتے ہیں یعنی بولنے سے مقصود احکام بتانا ہے سو ہم احکام بتا چکے اب ہم کو ہم کلام ہونے کی ضرورت نہیں پس جو ضرورت تھی کلام کرنے سے وہ رفع ہو چکی ہے اب رہی لذت وہ جب ہو کہ یہ ملذذ صاحب حق تعالیٰ کے بولنے کے وقت باقی بھی رہیں سو ہم کلام ہونا تو بہت دور ہے اگر اپنا کلام بھی کسی شے پر نازل فرمائیں تو وہ فنا ہو جائے چنانچہ فرماتے ہیں لو انزلنا

هذا القرآن على جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہ ہونے میں حکمت اور مصلحت

الحاصل کلام یا رویت کی دنیا میں تمنا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مصلحت بھی نہیں ہے اور جن سے کلام ہوا ہے وہ بھی بلا واسطہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب او يرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشاء انہ علی حکیم۔ یعنی کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بات کرے مگر بطور وحی کے یا پس پردہ یا فرشتہ بھیج دے پس جو چاہے وحی کرے اس لئے کہ وہ اس سے برتر ہے کہ بشر سے کلام فرمائے اور چونکہ حکیم ہے اس لئے مصلحت بھی اسی میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے ہم کلام نہ ہونا عین مصلحت اور حکمت ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کے دیکھنے اور سننے کا مراقبہ

پس ہمت باندھ کر اپنے ہر فعل میں اس کا مراقبہ کرو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ سنتے ہیں پھر دیکھئے کہ اس کا کیا ثمرہ ہوتا ہے تمام کلفتیں اور ادب مشقتیں آپ کو ہل ہو جائیں گی اور لطف دائم آپ کو ملے گا اور اسی کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے واصبر لحکم ربک فانک باعیننا و سبح بحمد ربک (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حکم کے لئے جبر ہے اس لئے کہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کے ساتھ کیجئے یعنی آپ ہم سے باتیں کیجئے) جب محبت کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب مجھ کو دیکھتا ہے تو مصیبت میں بھی اس کو لطف آتا ہے۔

بجرم عشق توام میکشد غوغایست تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا یست

(یعنی اے محبوب! آپ کے عشق کے جرم میں مجھ کو لوگ مارے ڈالتے ہیں اور ایک بھیڑ لگا رکھی ہے آپ بھی سر سر بام آ جائیے اس لئے کہ خوب تماشا ہے)

ایک عاشق کو لکڑیاں مار رہے تھے ننانوے لکڑیاں کھائیں اور اف نہیں کیا اور نناوے کے بعد ایک لگی تو آہ نکلی لوگوں نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہا کہ نناوے تک تو میرا محبوب بھی تماشا یوں میں تھا تو مجھ کو تکلیف نہ ہوئی اور آخر میں چلا گیا اس لئے تکلیف محسوس ہوئی پس معلوم ہوا کہ دنیا میں ہمارا حصہ یہی ہے کہ ہم اس کی یاد میں رہیں اور ہم کو اس کا یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں اور سنتے ہیں۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا یعنی خدا تعالیٰ کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین

پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

تو اس آیت میں تواضع کا ایک اثر بتلایا ہے کیونکہ کبھی کسی شے کو ماہیت سے بتلایا جاتا ہے اور کبھی اثر سے تو نرمی و خشوع سے چلنا حقیقت میں اثر ہے تواضع کا۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے داڑھی سے کھیل رہا تھا جیسے اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ نماز کے اندر کپڑوں سے یا بالوں سے شغل کیا کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو داڑھی سے نہ کھیلتا۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ خوف و خشیت قلب میں ہے اور اس کا یہ اثر ہے کہ نماز میں اہو و لعب نہ ہو۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۖ

كَذَلِكَ ۖ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝

ترجمہ: اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر یہ قرآن دفعہً واحدہ کیوں نہیں نازل کیا گیا اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں۔ اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھیرا ٹھیرا کر اتارا ہے۔

تفسیری نکات

قرآن مجید کے تدریجاً نزول میں حکمت

یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعہً پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ کذلک لنثبت به فؤادک جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعے سے آپ کے دل کی تشبیت اور اس کا محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔

واقعی غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تشبیت فواد اور ضبط و فہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہو سکتا۔ دفعہً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعہً نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے

گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے با آسانی تعلیم ہو جاوے گی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جاوے گا اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں۔

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آوے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا نہ میں وقتاً فوقتاً آ کر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔ جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جاوے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔ پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو اور کتنے ہی غور و خوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہو سکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر و تبدل کمی بیشی کرا لے جاتا ہے اس لئے کہ اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخے لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفر کی ہو اور وہ سودا کا بیجان سمجھ جاوے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جاوے۔

اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ جس قدر عام اور تمام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدیل کرنے میں ہے امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔ اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزاء جزاء نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

سابقہ کتب کا نزول دفعی میں حکمت

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور واقعی نزول میں اس قدر نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعۃً کیوں نازل فرمایا جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں۔ اس لئے کتب سابقہ کا دفعۃً نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔

چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعین مراد کے بعد کی غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بلا تعین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعین ہو جاتی تھی۔ سواول تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا اس میں حکمت تھی تو سبب مسالک کی پس وہ رحمت ہوا پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا اور آیت۔

الْأَمِنْ تَابَ وَأَمِنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ

سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۖ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ

صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۖ

ترجمہ: مگر جو (شرک و معاصی) سے توبہ کر لے اور ایمان بھی لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گزشتہ گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ بھی عذاب سے بچا رہے گا (کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور سے رجوع کر رہا ہے۔

تفسیری نکات

شریعت میں سخت مرض کا بھی آسان علاج ہے

ان دونوں آیتوں میں سے اول ایک آیت میں ایک بہت بڑے مرض کا ایک نہایت ہی سہل علاج فرمایا ہے اور یہ بھی ایک امتیاز ہے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے شرائع اور دیگر طریق اصلاح سے کہ اس شریعت میں سخت امراض کے لئے بھی نہایت سہل علاج بتلائے گئے ہیں ورنہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس درجہ کا مرض ہوتا ہے اسی درجہ کا علاج بھی کیا جاتا ہے حاصل یہ ہے کہ معصیت مرض ہے اور اس میں دو درجے ہیں ایک اس کا حدوث اور ایک اس کا بقاء یعنی صدور کے بعد اس سے رجوع میسر نہ ہو۔

تبدیل سینات کی متعدد تفسیریں

اس آیت کے قبل بعضی وعیدوں اور بعضے گناہ کرنے والوں کی حالت کا بیان ہے اس کے بعد فرماتے ہیں الامن تاب وامن الخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کا علاج توبہ ہے مگر اس کو سن کر آپ سامعین بد اعتقاد نہ ہو جائیں کہ یہ تو معمولی بات نکلی جو پہلے سے موہوم ہے سوا بھی بات تم نے سنی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو ان کے گناہوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا تو خدا تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے باب میں (جبکہ اس کے شرائط بھی پائے جائیں جن میں ایک ایمان ہے کیونکہ کافر کی توبہ مقبول نہیں۔ اور دوسرے عمل صالح ہے) یہ فرمایا ہے کہ اس کی برائیاں مبدل بہ حسنات ہو جائیں گی اور یہ دوسری شرط یعنی عمل صالح قبول توبہ کے لئے تو نہیں ہے کیونکہ بالا جماع خود گناہ معاف ہونے میں اس کی ضرورت نہیں کہ دوسرے نیک عمل بھی کرے صرف توبہ بطریقہ کافی ہے لیکن اولئک یبدل اللہ سیناتہم حسنت یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمادیتے ہیں) میں اس دوسری شرط کی ضرورت ہے اور تفسیر اس تبدل سینات کی مختلف ہے اور یہ مسئلہ اس آیت سے اس تفسیر کی بنا پر ماخوذ ہے جو میں عرض کر رہا ہوں اور دوسری تفسیر کی بناء پر نہیں لیکن اگر کوئی دوسری تفسیر کو بھی اختیار کرے تو ہمارے مقصود میں مضرت نہیں کیونکہ اس علاج کا نافع ہونا تجربہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے تو ایک تفسیر تو اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اول ان کے بعضے گناہ ظاہر کئے جائیں گے اور وہ ڈریں گے کہ اب دوسروں کی نوبت آئے گی مگر رحمت سے ان کو کہا جائے گا کہ اچھا ہم نے گناہوں کو معاف کیا اور ان کے برابر نیکیاں تم کو دیں اس وقت بندہ عرض کرے گا کہ یا اللہ میں نے تو اور بھی گناہ کئے ہیں تو بعض نے اس قصے کی تفسیر کی ہے مگر یہ تفسیر میرے نزدیک اس لئے مرجوح ہے کہ خود اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا اور یہاں ہر تائب کے لئے حکم فرمایا گیا ہے تو رائج تفسیر وہی ہوئی جو میں عرض کرتا ہوں اور وہ بھی سلف سے منقول وہ یہ ہے کہ سینات سے مراد ملکات سینات ہیں اور حسنات سے مراد ملکات حسنات ہیں۔

یعنی ہر عمل کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو تکلف سے کیا جائے یا اتفاقاً صدور ہو جائے دوسرے یہ کہ اس کا ملکہ ہو جائے۔ اول کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ اتفاق سے ایک جیم نہایت اچھی لکھ دے تو یہ ملکہ نہیں بلکہ اتفاق ہے تو جو عمل بے ملکہ کے ہوگا اس کو پائیدار نہیں ہوگی اور جو عمل ملکہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کو دوام ہوتا ہے یعنی توبہ کی بدولت ملکہ معصیت جو کہ منشا گناہ ہے بدل دیا جاتا ہے۔

بعض اہل اللہ نے فاولئک یبدل اللہ سیناتہم حسنت کی تفسیر کی ہے کہ حق تعالیٰ ہماری طاعات کو جو واقع میں سیئات ہیں اپنے کرم سے طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں۔

فاولئک یبدل اللہ سیناتہم حسنات کی تفسیر حضرت مرشدی علیہ الرحمۃ یہ فرماتے تھے کہ سینات سے مراد ہمارا نماز و روزہ ہے کہ درحقیقت یہ عبادت نہیں بلکہ واقع میں گستاخی اور بے ادبی ہے اور ہم

ایسی عبادات کو پیش کر کے بے ادب بنتے ہیں اور ہمارا ایسی عبادات پر اپنے کو مستحق اجر سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی آقا کا گستاخ نو کر پنکھا جھلے اور ہر دفعہ میں ان کے سر پر پنکھا مارتا ہو۔ اور پھر انعام کا طالب ہو۔ اس پر تو اگر وہ آقا سزا ہی نہ دے تو بڑی عنایت ہے۔ اسی طرح ہماری یہ عبادت بے ادبی اور گستاخی ہے اس پر اگر ہم کو سزا بھی نہ ہو تو بڑی رحمت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی وہ رحمت ہے کہ ہمارے اس گمان کے موافق کہ ہم ان کو عبادات سمجھے ہوئے ہیں سچ مچ عبادت کر کے اس پر بھی ثواب دیں گے امراء کے یہاں دیکھا ہوگا کہ غرباء مٹی کے خربوزے تر بوز بنا کر لاتے ہیں ان کو بھی انعام ملتا ہے ایسی ہی یہ ہماری نماز ہے کیا عجب ہے جو اس پر بھی انعام مل جاوے لیکن واقع میں تو ضرورت اسی کی ہے کہ ہماری ایسی نماز ہو۔ جیسی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور جب تک یہ حاصل نہ ہو سچی کرتے رہیں۔

اولئک یبدل اللہ سیناتہم حسنات کہ حق تعالیٰ گناہ کو حسنہ بنادیتے اور جرم کو اطاعت کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں گے کہ تو نے ایسا کیا تھا؟ تو نے فلاں گناہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گناہیں گے بندہ جس کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین جرائم کا تو ذکر ہی نہیں ہوا۔ دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کبار کے ذکر سے پہلے یہ فرمادیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوائے گا کہ الہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے ہیں ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں دلوائیے۔ یہ تو آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں یبدل اللہ سیناتہم حسنات کا مصداق یہ ہے ملکات سیئہ کو مبدل بہ ملکات حسنہ کر دیتے ہیں۔ بخل کو سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں اور حیات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے۔

ترجمہ: مگر جو (شرک و معاصی) سے توبہ کر لے اور ایمان بھی لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (تو وہ بھی عذاب سے بچا رہے گا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف خاص رجوع کر رہا ہے۔

توبہ کا طریق

ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جدا ہے مثلاً اگر نماز نہیں پڑھی تو توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پچھلی نمازیں قضا کرو اور آگے ادا کرتے رہو اگر حج نہیں کیا تو اب کر لو اور پچھلے گناہ سے توبہ کر لو۔ کسی کے مال کا نقصان کیا ہے تو مالک کو ادا کرو یا واپس کرو یا معاف کراؤ اور آئندہ و برابر حق ادا کرتے رہو۔ آئندہ کسی کا حق ضائع نہ کرو اگر غیبت کی ہو معاف کراؤ۔ اگر وہ شخص جس کی غیبت کی تھی مر گیا ہو یا اس سے ملنے کی امید نہ ہو تو یہ بھی طریقہ ہے کہ اس کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتے رہو اس سے بھی غیبت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ قیامت

میں خدا تعالیٰ اس سے معاف کر دے گا۔ بہر حال ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جو معین ہے شریعت والوں سے پوچھ کر عمل کرو اور اس طریقہ کو استعمال کرو توبہ میں خاصیت ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا گناہگار ہو کسی نے کتنے ہی زیادہ گناہ کئے ہوں حق تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے سب معاف فرمادیتے ہیں۔ تو غرض من تاب کے تعلق سے یہ مضمون بھی ضروری تھا اور یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ توبہ عن الشرک کا نام ہے ایمان۔ غرض توبہ ہی میں یہ بھی داخل ہے۔ ایمان بھی توبہ ہی کا ایک فرد ہے۔

نیک اعمال کی تاکید

آگے عمل عمل صالحاً ہے یعنی توبہ کے بعد بے فکر نہ ہو جائے بلکہ آئندہ بھی نیک عمل کرتا رہے۔ اور یہ میں بیان کر ہی چکا ہوں کہ توبہ کے مفہوم میں دو چیزیں ہیں ایک وہ اعمال جن کے کرنے کا حکم ہے ان کو پابندی سے ادا کرتا رہے اور جن سے ممانعت ہے ان کا گویا اہتمام کے ساتھ تارک رہے یہ دونوں عملاً صالحاً میں داخل ہیں اور یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ فعل ترک کو کیسے شامل ہوگا خوب سمجھ لو کہ ظاہر میں گناہوں کا چھوڑنا مفہوم عدمی معلوم ہوتا ہے مگر دراصل مفہوم وجودی ہے اس کا معنوں وجودی ہے گو عنوان عدمی ہے اس کے سمجھنے کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے یوں سمجھئے اس سے بھی آسان تقریر کرتا ہوں انسان جو مکلف کیا گیا ہے تو اعمال اختیار یہ کا مکلف کیا گیا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھئے کہ مثلاً ہم جو اس وقت کھڑے ہیں تو نہ چوری کر رہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں نہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں غرض سینکڑوں گناہ ہیں جن کو ہم اس وقت چھوڑے ہوئے ہیں ایک تو ترک یہ ہے یہ تو ایسا ہے کہ اس ترک کی طرف ہمارا التفات بھی نہیں ہوتا اس کو ترک نہیں کہتے اس واسطے کہ جس ترک کا انسان مکلف بنایا گیا ہے وہ ترک ہے جو اپنے اختیار اور قصد سے ہو اور اختیار اور قصد کا مسبوق بالعلم ہونا ضروری ہے اور یہ ترک مسبوق بالعلم نہیں لہذا یہ وہ ترک ہی نہیں جس کا انسان مکلف بنایا گیا ہے اور یہ ترک مفہوم عدمی ہے جب انسان اس کا مکلف نہیں تو اس ترک کا حکم بھی نہیں۔ ایک ترک تو یہ ہے اور ایک ترک یہ ہے کہ یا تو کوئی فی الحال داعیہ ہو مثلاً کوئی عورت چلی جا رہی ہے جی چاہا کہ لاؤ اسے دیکھیں پھر نگاہ کو روک لیا۔ یہ ہے ترک وجودی اس کے لئے ضرورت ہے علم اور قصد کی مثلاً شراب پینے کا قصد تو نہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال ہے کہ کبھی نہیں پیئیں گے ان شاء اللہ یہ ترک وجودی ہے عدمی نہیں اور اجرا سی پر ملتا ہے۔ ورنہ اگر ترک عدمی پر بھی اجر ملتا تو یہ لازم آتا کہ ہر لمحہ میں کروڑوں طاعتوں کا اجر مل رہا ہے مثلاً اس وقت ہم ہزاروں گناہوں کو نہیں کر رہے ہیں فرض کرو نامحرم پر نظر کرنا ہی ہے ہم اس وقت کسی نامحرم پر نظر نہیں کر رہے ہیں اب نامحرم ہیں لاکھوں۔ نہ ہم زینب کو دیکھ رہے ہیں نہ ہندہ کو دیکھ رہے ہیں نہ خالدہ کو دیکھ رہے ہیں نہ اور کسی کو دیکھ رہے ہیں غرض دنیا میں جتنی نامحرم عورتیں ہیں ان میں سے ہم اس وقت کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے تو چاہیے کیا پرورش فرماتے ہیں اسی سلسلہ میں مجھے اس وقت یہ آیت یاد آگئی اتقوا اللہ و قولوا قولا سدید ایصلح لکم ظاہراً اصلاح فعل ہے بندہ کا تو یہاں سوال ہوتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا اس سے تو متوہم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ اصلاح ہو جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ خود ہی مثلاً نماز پڑھو ادیس گے کہیں ایسا ہوا بھی ہے پھر یصلح

لکم کے کیا معنی۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسناد اس اعتبار سے ہے کہ وہ اصلاح کا سامان پہلے مہیا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ مستلزم ہوتا ہے۔ ترتب اصلاح کو کیونکہ جب ملکات درست ہو گئے تو معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے دشواری نہیں رہتی اس معنی کرو وہ اصلاح حق تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہے اور بندہ کی طرف بھی تو مدد یہ ہوتی ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کہ ملکات کو بدل دیتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ بدوں ملکات کے درست ہوئے انسان سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک ملکات درست نہ ہوں بہت کم توقع ہے کہ افعال شنیعہ کا صدور نہ ہو سکے اور یہ تبدیل کا قصہ طویل الذیل اور وسیع ہے یعنی اس کے تحقق اور ظہور کا سلسلہ آخرت تک جاری رہتا ہے یہاں بھی تبدیل ہوتا ہے مختلف حالتوں میں وہاں بھی یہ ایسا جامع وعدہ ہے سبحان اللہ سالکین ہر قدم پر اس کا تحقق دیکھتے ہیں اور واقعی حق تعالیٰ کے وعدہ کی ایسی ہی شان ہونی چاہیے خود فرما رہے ہیں فلہم اجر غیر ممنون قطع نظر آخرت کے میں دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی میں یہ تبدیل شروع ہو جاتا ہے یہاں سے استمرار اور ثبات اور دوام سب کی توفیق ہوتی ہے اور اس تبدیل کا انقطاع ہی نہیں جو تبدیل ہوتی ہے ہوتی ہی چلی جاتی ہے چونکہ یہ تبدیلی سالکین کو پیش آتی ہے اس لئے ان کو متنبہ کر دینا ضروری معلوم ہوا تا کہ ان کو اس کی بصیرت ہو کتنی بڑی دولت ہم کو حاصل ہوئی ہے۔ اس نے اپنا کام کیا تھا یعنی اعمال صالحہ شروع کئے تھے اور مطلوب ہے اعمال صالحہ کا دوام اس دوام میں وہ خود اس طرح مد فرماتے ہیں کہ اس کے اندر جو ملکات تھے سیدہ ان کو بدل کر ملکات حسنہ کر دیتے مثلاً پہلے بخل غالب تھا اب سخاوت غالب ہو گئی یہیں سے عاقل سمجھ جائیگا کہ ملکات حسنہ کو اور قوی کر دیا جائے اس واسطے کہ جتنا ضعف ملکات حسنہ میں تھا وہ ملکات سیدہ کی آمیزش سے تھا تو ضرور ہوا کہ اب ملکات حسنہ کا حسن اور زیادہ ہو جائے گا کیونکہ حسن کی کمی کی علت قبح کی آمیزش ہی تو ہے غرض اس تبدیلی کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ ملکات حسنہ کو تو پہلے سے بھی زیادہ قوی کر دیتے ہیں اور ملکات سیدہ کو ضعیف اور مضحل کر دیتے ہیں مضحل میں نے اس لئے کہا کہ ملکات سیدہ کا بالکل ازالہ نہیں ہوتا اس واسطے کہ اگر بالکل ازالہ ہو جاوے تو یہ حکمت کے خلاف ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ ثواب ملے کیونکہ ازالہ کی صورت میں تو گناہوں سے بچنے میں کوئی ثواب ہی نہیں اس واسطے کہ جب دل میں گناہ کے صدور کی قدرت ہی نہ رہی اس وقت اختیار طاعت اور ترک معصیت کوئی کمال ہی نہیں اس لئے ملکات سیدہ کا ازالہ تو نہیں ہوتا ہاں ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے یعنی ان کے تقاضے کی کیفیت اتنی مضحل ہو جاتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کہ نہیں ہے اس لئے بعض سالکین کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم میں اب کوئی ملکہ سیدہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب بعد چندے کسی محرک سے وہ ملکات عود کرتے ہیں تو روتے ہیں سالک صاحب بیٹھ کر روتے ہیں کہ میرا سارا مجاہدہ برباد ہو گیا اور پھر معصیت کے تقاضے ہونے لگے۔

تبدیل ملکات کی حقیقت

اس وجہ سے مجھے متنبہ کرنا ضروری ہے کہ تبدیل ملکات کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صورت کیا ہوتی ہے سالک نے غلطی اس لئے کی کہ وہ حقیقت اس تبدیلی کی نہیں سمجھا وہ تبدیلی ایسی سمجھتا ہے کہ ملکات سیدہ بالکل کی جاتے رہتے ہیں حالانکہ ملکات سیدہ زائل نہیں ہوتے بلکہ ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے مگر اس اضمحلال کا اثر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا

زوال کا تو یہ رحمت ہے کہ دوائی خیر کے تو قوی ہو جاتے ہیں اور دوائی شر کے ضعیف ہو جاتے ہیں نیکی کا تو ہر وقت تقاضا ہوتا رہتا ہے اور برائی کا بالکل تقاضا نہیں ہوتا بلکہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت ایسا دشوار ہو جاتا ہے کہ اگر اس کا قصد بھی کرے تو اس قدر جی برا ہو کہ گویا ذبح کر ڈالا اور اس تبدیل کو فنا بھی کہتے ہیں کیونکہ بجائے ملکات سیئہ کے ملکات حسنہ پیدا ہو گئے اور یہ فنا ہی حسی ہے۔ فنا کی دو قسمیں ہیں۔ فنا حسی اور فنا علمی۔ فنا علمی اسے کہتے ہیں کہ غیر اس کے علم سے فنا ہو گیا جیسا کہ حق تعالیٰ کا ذکر ایسا غالب ہوا کہ ذکر کے علم سے غیر حق فانی ہو گیا تو وہ غیر واقع میں فانی تھوڑا ہی ہو گیا بلکہ واقع میں تو وہ موجود ہے لیکن اس کے علم سے غائب ہو گیا ہے اور یہاں واقع میں وہ ملکہ سیئہ جاتا ہی رہتا ہے لیکن جاتے رہنے کی حقیقت یہ ہے کہ مضحمل ہو جاتا ہے یعنی اس میں اضمحلال اس درجہ ہو جاتا ہے کہ گویا وہ جاتا ہی رہتا ہے یہاں یہ نہیں ہے کہ اس ملکہ کی طرف سالک کا التفات نہیں رہا۔ نہیں بلکہ وہ ملکہ واقع میں زائل ہو گیا لیکن اسی تفسیر کے ساتھ اس کو فنا حسی اور فنا ذاتی کہتے ہیں تو بہر حال یہ رحمت ہوتی ہے کہ ملکات سیئہ ملکات حسنہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا بالکل تقاضا ہی نہیں ہوتا اگر کبھی سہواً بھی نسیاناً بھی صدور معصیت کا ہو جاتا ہے تو ایک پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑتا ہے یہ حالت ہوتی ہے۔

بر دل سالک ہزاروں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

روتے روتے جان دیتا ہے تو یہ رحمت ہوتی ہے تو خلاصہ کیا ہوتا ہے اس تبدیلی کا۔ یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مغلوب کرتے ہیں بری خواہشات کو اور غالب کر دتے ہیں اچھی خواہشات کو اس سے انسان راستہ چلتا ہے ایک تو یہ تبدیلی ہوتی ہے اس کو تبدیلی ذات بھی کہتے ہیں یعنی جو پہلی ذات تھی وہ جاتی رہی اس کے بجائے ایک دوسری ذات اس کے قائم مقام ہو گئی۔ یہ تبدیلی ذات ہی تو ہوئی پھر جب ایک زمانہ اس پر گذر گیا اور جو اس میں حکمت تھی خدا کی کہ بندہ خوگر ہو جائے طاعت کا یعنی نفرت ہو جائے معاصی سے اور دلچسپی ہو جائے طاعات سے جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو بعض اوقات اس میں ایک اور تغیر ہوتا ہے وہ یہ کہ جن ملکات سیئہ کو مغلوب و مضحمل کیا گیا تھا جب ان کی مقاومت بوجہ ملکات حسنہ کے راسخ ہو جانے کے آسان ہو گئی تو اب وہ چاہتے ہیں اپنے بندہ کا اجر بڑھانا اس واسطے اس وقت رفتار حکمت کی یہ ہوتی ہے کہ اول امور طبعیہ دب جاتے ہیں مگر چند روز کے بعد وہ پھر ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ ابھرتے ابھرتے غالب ہو جاتے ہوں بلکہ اپنی اصلی فطرت پر آ جاتے ہیں کیونکہ یہ ملکات سیئہ اصل فطرت میں بھی غالب نہ تھے اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بھی یہ ملکات غالب ہوتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے بچپن میں بھی یہ ملکات موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے مشق کر کر ہم نے شہوت کو غضب کو حرص کو طمع کو قوی کر لیا ہے۔

توبہ کا طریق

حق تعالیٰ نے اس سے قبل کی آیت میں بعض اعمال منہی عنہا یعنی بعض معاصی کا بیان کیا ہے اور اس پر وعیدیں فرمائی ہیں کہ جو شرک کرے گایا بدکاری کرے گایا قتل کرے گا اس کو اس طرح عذاب ہوگا پھر اس عذاب

سے استثناء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں جس کا یہ حاصل ہے کہ سب کو عذاب ہوگا مگر ان کو نہ ہوگا جن کی یہ شان ہے کہ انہوں نے جملہ معاصی سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے یعنی کفر سے بھی توبہ کی اور کفر سے توبہ یہ ہے کہ کفر چھوڑ کر ایمان لے آئے اور چونکہ اوپر ذکر کفر و شرک کا بھی تھا اس کے متعلق تو یہ ارشاد فرمایا کہ آمن یعنی ایمان لے آئے اور چونکہ بعض اور معاصی بھی مذکور تھے گوان کا وقوع بھی کافروں ہی سے مذکور ہے مگر فی نفسہ ان کی خصوصیت خاص کفار ہی سے نہیں بلکہ جو بھی بتلاء ہو اسی کے لئے تذکر اور اصلاح کا طریقہ بھی بتلانا ہے اس لئے آمن کے ساتھ تاب کو فرمایا۔ گو تاب کو مقدم فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ توبہ تو جملہ معاصی سے ضروری ہے ہی مگر بالتخصیص کفر سے توبہ نہایت ہی ضروری ہے یعنی ایمان بھی ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جتنے معاصی ہیں ان سے توبہ کرنا چاہیے اور ان میں سے کفر و شرک بھی ہیں اور توبہ کا طریق یہ ہے۔ یعنی بعض معاصی سے توبہ یہ ہے کہ ایمان بھی لاوے گویا یہ تخصیص بعد تعمیم ہے ورنہ ظاہر یہ تھا کہ ایمان مقدم ہوتا مگر اس میں یہ نکتہ ہے جو میں نے بیان کیا اور یہ بات عکس میں حاصل نہ ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں و عمل عملاً صالحاً یہ نہیں کہ توبہ کر کے بیٹھ رہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی اہتمام کرے اور نیک کام کیا کرے نیک کام میں دونوں امر آگئے معاصی کا چھوڑنا بھی اور طاعات کا اختیار کرنا بھی جو شخص ایسا کرے گا وہ البتہ عذاب سے بچے گا۔

گنہگاروں کو بشارت

آگے فرماتے ہیں وکان اللہ غفورا رحیما اس کی دو تقریریں ہیں ایک دو یہ کہ فرما رہے ہیں۔ گنہگاروں کو کہ بشارت سن لو کہ بس تمہاری طرف سے توبہ ہی کی دیر ہے اللہ تعالیٰ غفور ہیں وہ تو توبہ قبول کر ہی لیتے ہیں۔ سب گناہوں کو مٹا ہی دیتے ہیں کیونکہ ہم غفور ہیں اور یہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہیں یعنی توبہ کے بعد جو اعمال کرو گے انہیں بھی ہم قبول کریں گے اس تفسیر کے اعتبار سے تو یہ ارشاد تحقق توبہ کے ساتھ متعلق ہے جو الامن تاب میں مذکور ہے اور جو یسدل اللہ سیناتہم حسنات کے ساتھ متعلق کیا جاوے تو وہ ایک نہایت لطیف تفسیر ہوگی اور یہ دوسری تقریر ہے یعنی ایک تبدیل کا تعلق تو ہے رحمت سے اور دوسری تبدیل کا تعلق ہے مغفرت سے یعنی برے ملکات کو مٹا دیا اور ان کی جگہ اچھے ملکات عطا کر دیئے۔ یہ تو مغفرت ہوئی اور یہ رحمت ہے کہ برے ملکات کو مٹایا تو نہیں مگر ایسا کر دیا کہ ان کی خاصیت بدل دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی تبدیلی کے متعلق غفور کو کہا جاوے اور دوسری تبدیلی کے متعلق رحیم کو کہا جاوے تو یہ نہایت ہی اچھا مطلب ہو جاتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكُ الْاِيْكُونُوا مُؤْمِنِينَ

سو شاید آپ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو غم سے جان دیدیں گے ۱۲

اور فرماتے ہیں

لست علیہم بمصیطر

آپ ان پر مسلط نہیں ہیں ۱۲

اور ارشاد ہے:

فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ

”سو جو شخص راہ پر آویگا وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آویگا۔“

اور انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا

”ہم نے آپ کو ایک سچا دین دیکر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہے اور ڈراتے رہے ۱۲“

اور وقل الحق من ربکم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليکفر

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہو سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے ۱۳

اور یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم ”اے ایمان والو اپنی جان کی فکر کرو“

اور وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ۔ ”اور کسی شخص کو ایمان لانا ممکن نہیں بدو حکم خدا کے“

اس قسم کی آیات کو اگر جمع کیا جاوے تو تقریباً ایک پارہ کی مقدار پر جمع ہو جاویں جن کو حاصل یہ ہے کہ آپ ان کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں۔ آپ کا کام تبلیغ محض ہے اس سے زیادہ اس بوجھ کو اپنے اوپر نہ اٹھایا جاوے کہ جو کام مریض کا ہے وہ بھی آپ ہی کریں کہ انہیں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے جس پر دوام مشکل ہے ہر شخص اپنے عواقب اور انجام کو اچھے طور سے اور سہولت سے سمجھ سکتا ہے لیکن اس میں سخت دشواری ہے کہ دوسرا شخص اس کے بار کو برداشت کرے اور یہ بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاوے۔ البتہ اس درجہ شفقت کرنے کی بھی حق تعالیٰ نے ممانعت نہیں فرمائی۔ یہ صرف مشورہ ہے مطلب یہ ہے کہ مصلح کے لئے مشورہ یہی ہے کہ وہ اس قسم کی فکر خاص میں نہ پڑے کیونکہ اس پر دوام ہو نہیں سکتا اور جب دوام نہیں ہوتا۔ تو لامحالہ اس قسم کی فکر خاص کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ تو اس مشقت سے فائدہ ہی کیا ہوا اور اگر اس وقت بھی ترک نہ کیا تو عمر بھر کی مصیبت خریدی۔ اسی لئے عارفین کا قول ہے کہ

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ برنتا بد کوہ را یک برگ کاہ

نیز حضور کا ارشاد ہے

انک لا تہدی من احببت ولكن الله یهدی من یشاء

حضور ﷺ حضرت ابوطالب کے درپے تھے۔ آیت نازل ہوئی کہ آپ درپے نہ ہو جیئے

انک لا تہدی الایۃ

لعلک باخع نفسک الایکونوا مؤمنین

یعنی آپ شاید جان دے دیں گے اس رنج میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور کو نفع رسانی میں اتنا شغف تھا کہ اپنی جان کی بھی پروا نہ تھی۔

غرض! حضورؐ نے نہ فرمایا کہ چولہے میں جاویں ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ اسی طرح کالمین کو اپنے متوسلین سے عشق ہوتا ہے اور کوئی خیر خواہی ان سے اٹھا نہیں رکھتے۔ (آخر الاعمال ملحقہ مؤاعظم و عمل)

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَى هَارُونَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون علیہ السلام کے پاس بھی جی بھیج دیجئے۔

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کیلئے
رسول بنانے کی دعاء میں حکمت؟

دعا کا جواب یہ ہے کہ عقدہ نکرہ ہے چیز میں اثبات کے تو سب زائل نہیں ہوا۔ کچھ باقی رہا۔ صرف اتنا زائل ہوا کہ مخاطب بات سمجھ سکتا تھا اور دعا پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اولیاء اللہ حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کیوں رضا اختیار نہ کی جواب یہ ہے کہ چونکہ نبی تھے اور جانتے تھے کہ مجھے تبلیغ کا کام کرنا ہے تو اللہ کی رضا اس میں ہے کہ کچھ عقدہ زائل ہو جائے اس واسطے دعائیں لفظ بڑھا دیا کہ یفقهوا قولی یعنی اتنا عقدہ زائل ہو کہ مخاطب بات سمجھ سکے کتنا ادب ملحوظ رکھا کہ جتنی مقدار ضروری تھی اس سے زیادہ کا سوال نہیں فرمایا۔ پھر اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ مخاطب جب بات سمجھ سکتے تھے تو ہارون علیہ السلام کے رسول ہونے کی دعا کیوں کی۔ جواب یہ ہے کہ اس دعاء کی وجہ قرآن شریف سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ تھی کہ میری تصدیق کریں۔ فارسلہ معی رداً یصدقنی ہارون کو میرے ساتھ معاون بنا کر بھیج دیجئے کہ وہ میری تصدیق کریں۔

تو تصدیق کرانا بھی مقصود تھا اور اس میں حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ مدرس دو قسم کے ہوتے ہیں اور وہ کہ تقریر کردی طلباء سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ ان کی روانی تقریر میں فرق نہیں آتا۔ اور ایک وہ ہوتے ہیں کہ اگر طلباء نہ سمجھیں تو طبیعت میں روانی نہیں ہوتی طبیعت میں تنگی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام چونکہ طبیعت کے تیز تھے اور فرعون کا انکار دیکھ کر یہ خطرہ تھا کہ طبیعت میں روانی نہ رہے گی اور یہ مقصد تبلیغ کے منافی ہے اس واسطے فرمایا کہ رسول ہو کر تصدیق کریں گے اور تائید میں سرہلائیں گے تو طبیعت بڑھ جائے گی۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَى الْقَوَامَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ: موسیٰ نے سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہے ڈالو۔

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا

ساحران موسیٰ کو اجازت دینے کا راز

یہی راز ہو سکتا ہے موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا کہ انہوں نے ساحران فرعون سے فرمایا تھا۔ القواما انتم ملقون (جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو) بظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ساحران فرعون کا سحر تو کفر یا معصیت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس سحر کی اجازت کیوں دی۔ جواب یہ ہے کہ یہ اجازت ابقاء کفر کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے احقاق حق اور ابطال باطل مقصود تھا کیونکہ جب وہ لوگ اولاً اپنا سحر ظاہر کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سب کو فنا کر دے گا تو اس طرح اظہار حق کامل طور سے ہوگا۔ اس مصلحت اظہار حق کے لئے انہوں نے فرمایا تھا۔

القواما انتم ملقون و عندی جواب اخرو هو ان الامر هناك للتمجيز القواما انتم ملقون فانی لا اعبا عہ فافعلوا ماشئتم کما فی قوله تعالیٰ فمن شاء فلیکفر۔

(میرے نزدیک ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اجازت دینا ان کو عاجز کرنے کے لئے تھا۔ یعنی تم جو کچھ سحر بندی کر سکتے ہو کرو۔ میں پہلے سے تم کو روکتا نہیں۔ تاکہ ان کی کامل سحر بندی کے بعد اس کو تار عنکبوت کی طرح ختم کر دیں اور وہ عاجز ہو کر اقرار کریں حق کا)

تو یہ اجازت ابقاء سحر کو مٹانے کے لئے تھی کیونکہ اس کے منانے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا کہ اول وہ اپنی کوشش کو ظاہر کریں بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا نہایت سہولت سے دفعہ سب کو مٹا دے یہ آیت صوفیہ

کے اس طرز عمل کی دلیل ہے جس سے بعض اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کہ انہوں نے منکر شرعی کی اجازت دی حالانکہ وہ منکر کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کو جڑ سے مٹانا چاہتے ہیں جس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ (نور النور لمحققہ مؤاعظ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۲۶۵)

فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعُ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ

إِنَّا لَمُدْرِكُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۶۲﴾

ترجمہ: پھر جب دونوں جماعتیں (آپس میں ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو (دریا سے نکلنے کا) ابھی راستہ بتلا دیگا۔

تفسیری نکات

اصحاب موسیٰ بوجہ ضعیف الیقین

معیت حق سے محروم تھے

انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ قال اصحاب موسیٰ انالمدركون جس میں ان اور جملہ اسمیہ اور لام تاکیدتین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے۔ حالانکہ بارہا دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے۔ ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا۔ صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کلا گویا ایک چپٹ لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلا میں ہے۔ پھر چونکہ یہ لوگ بدرجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تقدیم ماحقہ التأخیر یفید الحصر اور اسی وجہ سے معنی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو۔

وَالَّذِي هُوَ يُطْعَمُنِي وَيُسْقِينِي ۖ وَإِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِي ۖ

وَالَّذِي يُبَيِّتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِي ۖ

ترجمہ: اور جو کہ مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ اور جو مجھ کو (وقت پر) موت دیا پھر (قیامت کے روز) مجھ کو زندہ کریگا۔

تفسیری نکات

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں۔ والذی هو یطعمنی و یسقین و اذا مرضت فهو یشفین اطعام و اسقاء و شفاء کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور مرض کو اپنی طرف اس لئے هو الذی یمرضنی و لیشفین نہیں فرمایا بلکہ اذا مرضت فهو یشفین کہا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفا دے دیتے ہیں گویا بیمار تو میں خود اپنی کسی بے اعتدالی کی وجہ سے ہوتا ہوں پھر وہ شفا دے دیتے ہیں چونکہ بیماری طبعاً گوار ہے اس لئے ناگوارشی کو محبوب کی طرف منسوب نہیں کرتے اگرچہ حافظ یوں فرماتے ہیں کہ

درد از یارست و درماں نیز ہم دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

یہ درد اور درماں دونوں کو محبوب کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام حافظ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز ممکن ہے حضرت حافظ کے وارد وقت کا بھی مقتضا ہو اور اصل میں مرض کو اپنی ہی طرف منسوب کرنا زیادہ ادب ہو مگر ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد یوں بھی فرماتے ہیں۔ والذی یمیتنی ثم یحیین یہاں امانت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ موت ایسی ناگوار چیز نہیں جس کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہو گویا موت بیماری سے بھی کم ہے کہ وہ تو ناگوار ہے اور یہ ناگوار نہیں بلکہ موت تو مرغوب شے ہے حدیث میں آتا ہے الموت تحفة المؤمن۔ موت مومن کے لئے ایک تحفہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحفہ مرغوب ہی شے ہو سکتی ہے نا مرغوب کو تحفہ کوئی نہیں کہتا اور جب ہر مومن کے لئے موت تحفہ ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے تو بالخصوص تحفہ ہے کیونکہ وہ توفیق المؤمنین ہیں ان کو موت کیونکر ناگوار ہو سکتی ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ گنہگار مسلمان کے لئے بھی موت تحفہ ہے گو کچھ دنوں کے لئے اس کو عذاب بھی بھگتنا پڑے کیونکہ موت ہی کے ذریعے سے اس کو کسی وقت خدا کا قرب حاصل ہوگا۔ رہا یہ اشکال کہ کیا مقرب کو عذاب بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں ہاں ہوتا ہے جیسے تم بادشاہوں کے پاس کپڑوں میں

گو بر لگا کر جاؤ تو وہ تم کو حمام میں بھیج دیں گے جہاں گرم پانی سے خوب مل دل کر تم کو غسل دیا جائے گا اسی طرح مسلمانوں کے لئے دوزخ جیل خانہ اور حوالات نہیں بلکہ مثل حمام کے ہے دوسرے گنہگار مسلمانوں کو دوزخ کے عذاب کا بہت زیادہ احساس بھی نہ ہوگا کیونکہ حدیث مسلم میں ہے یسمیٰہم اماتۃ کہ حق تعالیٰ جہنم میں مسلمانوں کو ایک قسم کو موت دیں گے اور اگر عذاب بھی ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ جس نعمت کے زوال کی ہر دم توقع ہو وہ اس نعمت سے افضل ہے جس کے زوال کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا ہو پس مسلمان کے لئے موت ہر حال میں اچھی ہے کیونکہ دنیا کی راحت میں زوال کا خطرہ لگا ہوا ہے اور آخرت کی تکلیف کے منقطع ہونے کی ہر دم توقع ہے پس موت ناگوار چیز نہیں اس لئے ابراہیم السلام نے یمتینی ثم یحییٰ میں احیاء کی طرح اماتت کو بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔

سُورَةُ النَّمل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿۱﴾

ترجمہ: آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں)

تفسیری نکات

سماع موتی اور اہل قبور سے فیض کا ثبوت

لکھنؤ سے ایک غیر مقلد عالم یہاں پر آئے تھے غالباً دو تین روز یہاں پر قیام کیا۔ تھے سمجھدار ایک روز انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ سماع موتی کے بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے اس لئے کہ نص انکار کر رہی ہے قرآن پاک میں ہے انک لا تسمع الموتی میں نے کہا کہ یہی آیت سماع حسی مشاہد ہے صرف سماع قبول منفی ہے پس یہی حالت مشبہ بہ کی ہوگی کہ سماع حسی ثابت اور سماع قبول منفی چنانچہ ظاہر ہے کہ مردے سماع مواعظ سے منتفع نہیں ہوتے تو اس آیت سے نفی سماع پر دلالت کہاں ہوئی۔

دوسرا سوال یہ کیا کہ کیا اہل قبور سے فیض ہوتا ہے میں نے کہا کہ ہوتا ہے اور حدیث سے ثابت ہے اس پر بہت چوکنے ہوئے میں نے کہا کہ حدیث شریف میں قصہ ہے کہ ایک صحابی نے قبر پر بھولے سے خیمہ لگا لیا تھا مردہ بیٹھا ہوا قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے سنا اور قرآن سننے سے کہ ثواب ہوتا ہے تو یہ فیض اہل قبور ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَاوِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ

الَّذِي أَنْتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿۸۸﴾

ترجمہ: اور تو (جن) پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے (اور) ان کو خیال کر رہا ہے کہ یہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کریں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑے پھریں گے یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے۔

تفسیری نکات

حضرت عمرؓ بظاہر زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ حواس باختہ ہو گئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر پکارتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔

وصال نبوی کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ

یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر میں جا پہنچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیقؓ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیقؓ سب سے زیادہ مضبوط نکلے ان کی زبان سے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا واخلیلا

حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہ ہلاک ہو گیا اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہو گئی مگر حضرت جنید ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وتروی الجبال تحسبها جامدة وهی تمر مر السحاب (یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آ گئی اور کامل پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہ بہت تیز جا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

سُورَةُ الْقَصَصِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ
فَالْقِيَهُ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۚ إِنَّا رَأَيْنَاهُ إِلَيْنَا
وَجَاعَلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٥﴾

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ تو اندیشہ کرنا اور نہ غم کرنا ہم ضرور ان کو تمہارے ہی پاس واپس پہنچا دیں گے اور ان کو پیغمبر بنادیں گے۔

تفسیری نکات

ازالہ خوف و حزن کی تدبیر

اب صبر کا مضمون جو پہلی بار کے بیان میں زیادہ مقصود تھا وہ ان دو جملوں سے یعنی لا تخافی اور لا تحزنی سے مستنبط ہوتا ہے یعنی والدہ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی یعنی جب تم کو یہ اندیشہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام دشمن کے ہاتھ آ جاویں گے اور وہ ان کو قتل کر دے گا تو ایسے وقت میں ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا یعنی ضبط کرنا اور صبر سے کام لینا۔ ایسے موقع پر دو چیزوں کا احتمال ہو سکتا تھا یعنی خوف کا اور حزن کا حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں دونوں احتمالات کو دفع فرما دیا اور خوف و حزن میں فرق یہ ہے کہ خوف کہتے ہیں اس کو کہ کسی آنے والے مضر

واقعہ کا احتمال ہو اور حزن کہتے ہیں اس کو کہ کسی گزشتہ ناملائم واقعہ پر ناگواری اور افسوس ہو۔ یہاں واقعہ گزشتہ تو یہ تھا کہ ہائے میں نے بچہ کو اپنے ہاتھوں دریا میں ڈال دیا اس کو یاد کر کے حزن ہو سکتا تھا اور واقعہ آئندہ کا خوف یہ تھا کہ دیکھئے کس کے ہاتھ آوے اور وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے غرض یہاں دو چیزوں کا احتمال تھا حق تعالیٰ نے دونوں کے متعلق فرمایا تم نہ تو دریا میں ڈال کر اپنے فعل پر پچھتانا اور نہ ڈالنے کے بعد آئندہ کا اندیشہ کرنا دونوں باتوں سے دور رہنا اور ایسے وقت ضبط اور صبر سے کام لینا۔

ضبط نفس کی تعلیم

صاحبو! اس موقع پر صبر کرنا صبر علی الموت (موت پر صبر کرے) سے بھی اشد ہے کیونکہ موت تو ایسا واقعہ ہے جہاں صرف حزن ہی ہوتا ہے اور خوف نہیں ہوتا اور یہاں دونوں جمع ہیں خوف بھی حزن بھی غرض اکثر واقعات یا موجب حزن ہوتے ہیں یا موجب خوف اور یہ واقعہ خوف اور حزن دونوں کو متضمن ہے اس لئے ایسے واقعہ پر صبر سخت مشکل ہے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایسا واقعہ شدیدہ پیش آنا اور پھر عورت ہو کر اس قدر صبر کرنا تعجب خیز امر ہے ایسے وقت میں مردوں کے بھی قدم ڈگمگاتے ہیں اور صبر کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور چونکہ جب یہ دونوں امر مجتمع ہوں یعنی خوف بھی حزن بھی ہو پھر عورت کا جگر اور اس کا تحمل کرنا اور اصلاً دوسری طرف جنبش نہ کرنا عجیب بات تھی اس لئے حق تعالیٰ نے تسلی کے اس موقع کے مناسب نہایت حکیمانہ مضمون ارشاد فرمایا کہ ہر پہلو سے پوری تسلی فرمادی آدمی کے طبائع اور جذبات اولاد کے متعلق مختلف ہوتے ہیں یہاں سب کی پوری رعایت ہے۔ اس لئے صبر کی تعلیم کے لئے واللہ یہ مضمون کافی ہے۔ کوئی عقلمند آدمی ایسا نہ ہوگا کہ اس قسم کی حکیمانہ تسلی سن کر رنجیدہ رہے بلکہ یہ سن کر کہ بچہ سے پھر ملنا ہوگا قلب سے ملال بالکل رفع ہو کر کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ جاوے گی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قلب میں جو وساوس پیدا ہوتے سب کو علماً و عملاً دونوں طرح رفع فرما کر مضمون کو کامل کر دیا چنانچہ اول انارا دوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین (ہم ان کو ضرور تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے اور ان کو مرسلین میں کریں گے) سے عقلی لم بیان فرمائی کہ تم غمگین نہ ہونا کیونکہ ہم ان کو تمہارے پاس واپس لاویں گے یعنی موسیٰ اس وقت دریا میں بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث غم ہو اور آئندہ بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث خوف ہو بلکہ ان کی عمر اتنی دراز کر دیں گے کہ چالیس سال کے بعد ان کو رسولوں میں سے بنادیں گے۔ غرض مصیبت کے وقت ہی دونوں باتیں پیش آتی ہیں خوف اور حزن یہی دو امر اکثر واقع ہوتے ہیں مثلاً بیٹے کا مر جانا اس وقت ایک تو اپنے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہم سے جدا ہو گیا اور ایک اس کے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے وہ ہمارے پاس کھاتا پیتا تھا اب ان باتوں سے روک دیا گیا اب کی مرتبہ آم سے محروم رہا اور آئندہ کے لئے اپنے اعتبار سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی مفارقت میں ہمارا کیا حشر ہوگا تو

حق تعالیٰ حزن و خوف دونوں کو اس جگہ رفع فرماتے ہیں کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو تمہارے پاس واپس لاویں گے اور ان کو پیغمبر بنا دیں گے تو آئندہ ہلاک بھی نہ ہونے دیں گے عمر دراز ہوگی اس سے خوف کو رفع فرما دیا نیز تم سے پھر ملیں گے لہذا یہ بھی غم نہ کرنا کہ میری آنکھوں سے غائب ہو گئے غرض آیت لاسخافی ولا تحزنی (نہ اندیشہ کرنا اور نہ غم کرنا اس سے دونوں قسم کے واقعوں پر ضبط نفس کی تعلیم معلوم ہوگئی جس کا نام صبر ہے)

قواعد شرعیہ جامع مانع ہوتے ہیں

قواعد شرعیہ اس قدر جامع مانع ہیں کہ دونوں قسم کے اثر کا ازالہ فرما دیا اسی قسم کے مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بیان کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عباس کا جو کچھ غم تھا اس پر کسی کے قول سے اتنی تسلی نہیں ہوئی جتنی ایک گنوار آدمی کے قول سے تسلی ہوئی وہ مضمون تسلی بخش یہ تھا۔

اصبر فکن بک صابرین فانما صبر الرعية بعد صبر الراس
اب صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہے آپ بڑے ہیں پہلے آپ صبر کیجئے۔

خیر من العباس اجرک بعدہ واللہ خیر امنک للعباس
(یعنی اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور ثواب تمہارے لئے حضرت عباس سے بہتر ہے اور نہ حضرت عباس کا کچھ نقصان ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباس کے لئے تم سے بہتر ہیں یعنی تمہارے پاس رہنے سے ان کا اللہ کے پاس رہنا زیادہ بہتر ہے تو کسی کا بھی نقصان اور گھٹا نہ ہو اور دونوں نفع میں رہے پھر غم کیسا کہ مومن ہر حال میں یہاں کی حالت سے وہاں آرام ہی میں ہوں گے کیونکہ ایک دن جنت میں واپس ہونے والے ہیں اور ان کو معلوم بھی کر دیا جاوے گا مفارقت کے بعد وصال کی امید جو وہ بحکم وصال ہی ہے اور اس مضمون کو رادوہ الیک (ہم ضرور ان کو تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے) سے بھی قیاس صحیح ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں بھی واپسی ہی تسلی کی گئی تھی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو پھر تمہارے پاس واپس لوٹا دیں گے تاکہ تم پھر مل لو اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا کر اطمینان قلبی حاصل کر لو اس وجہ سے حزن نہ کرو یہی علت دونوں جگہ مشترک ہے اور کسی تسلی کی وجہ واقعہ غم میں ہمارے لئے بھی ہو سکتی ہے کہ مردہ گو ہمارے پاس دنیا میں واپس نہ ہوگا لیکن جب ہم جاویں گے اور اس سے ملیں گے تو یہ بھی واپسی ہی کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود جو کہ ملاقات ہے وہ اس صورت میں بھی بدرجہ اتم حاصل ہوگی کیونکہ اس ملاقات کے بعد پھر مفارقت کا اندیشہ ہی نہیں اس لئے ہمیں بھی حزن زیبا نہیں کیونکہ سب کا اجتماع خدا کے یہاں ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ اسی کو دوسرے الفاظ میں فرماتے ہیں انا لله وانا الیہ راجعون

کہ ہم سب یعنی مردہ اور اس کے سب متعلقین انہی کے پاس جانے والے ہیں وہاں سب ملیں گے اسی لئے کسی عزیز کی موت کے وقت ہمیں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے کے مضمون کو سوچا کریں خدا تعالیٰ کے یہاں سب کا اجتماع ہوگا اور سب آپس میں ہمیشہ کے لئے ملتے جلتے رہیں گے آخرت تو کسی قدر شائد دور سمجھی جاوے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی سب مل جل لیتے ہیں چنانچہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب کوئی مر کر یہاں سے عالم ارواح میں پہنچتا ہے تو روحیں بہت خوش ہوتی ہیں کہ جیسے کوئی عزیز سفر سے آتا ہے اور اس سے مل کر ہم خوش ہوتے ہیں سب کی خیریت دریافت کرتے ہیں کہ ہمارا بھائی اچھا ہے فلاں شخص اچھا ہے یہاں تک کہ ایک شخص کو دریافت کرتے ہیں کہ وہ اچھا ہے یہ مردہ جواب دیتا ہے کہ وہ تو مر گیا تو وہ کہتی ہیں کہ وہ شاید دوزخ گیا ہو گا وہ یہاں نہیں آتا پھر کہتی ہیں کہ بھائی یہ تھکا ماندہ آیا ہے اسے آرام کر لینے دو پھر پوچھ پاچھ لینا پس جب مردہ سے ایک دن ہم کو ملنا نصیب ہوگا تو یہ مفارقت محض عارضی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص حیدر آباد جا کر ملازم ہو جاوے تو اس کی جدائی پر جبکہ وہ حیدر آباد میں یہاں سے زیادہ آرام میں ہو کون اس قدر روتا اور رنج کرتا ہے بلکہ تمنائیں کرتے ہیں کہ وہ حیدر آباد ہی میں ملازم رہے باقی ہم کسی نہ کسی دن مل بھی لیں گے اس استحضار میں عارفین کی یہی شان ہے ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص روتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے کہ تندرست ہو جاوے حضرت نے فرمایا کہ افسوس ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹا ہے اور دوسرا روتا ہے۔ اور فرمایا تم بھی اسی طرح چھوٹ جاؤ گے۔ پھر وہ بولا کہ حضرت میری روٹی کون پکاوے گا ارشاد فرمایا ہاں بھئی جب تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی تمہارے ساتھ روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی حضرت نے یہ باتیں اس طرح فرمائیں کہ جیسے یہ مشاہدہ وہ استحضار حضرت کا حال ہو وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت ایک شخص مجھے مدینہ طیبہ ہمراہ لے چلنے کو کہتا تھا اب انکار کرتا ہے دعا کیجئے کہ وہ مدینہ طیبہ لے چلے حضرت خفا ہو گئے کہ ہم سے ایسی شرک کی باتیں نہ کرو ظاہر بینوں کے نزدیک تو یہ بات بگڑنے کی نہ تھی مگر جس نے سوئی دیکھی ہو پتلی چمکتی ہے مگر اس کی نوک نہ دیکھی ہو اسے کیا خبر وہ تو سوئی کو یہ سمجھے گا کہ یہ خوبصورت تنکا ہے مگر جس کو سوئی کی نوک کا بھی احساس اور ادراک ہو وہ واقعی معمولی چیز نہ سمجھے گا اس لئے اس واقعہ میں ہمارے نزدیک بگڑنے کی کچھ بھی بات نہیں عارفین کو جن باتوں سے شرک کی بو آتی ہے جیسے اس میں غیر اللہ پر نظر ہونے کا حضرت کو کچھ احساس ہوا وہ تو ان کو نشتر سے بھی زیادہ ایذا دہ سمجھیں گے گو دوسروں کو احساس نہ ہو ایک ایسا ہی۔

کبھی معمولی غلطی پر بھی گرفت ہو جاتی ہے

اور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ بارش ہونے پر ایک بزرگ کے منہ سے نکل گیا کہ بڑے موقع سے بارش ہوئی۔ اسی وقت عتاب ہوا کہ اور بد تمیز بے موقع بارش کب ہوئی تھی جو آج کی بارش کو موقع کی کہتا ہے اور واقع

میں وہ خلاف مصلحت کیا کرتے ہیں اللہ میاں تو حکیم ہیں ان کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں ہوتا بظاہر دیکھنے میں یہ بات معمولی تھی مگر سخت گرفت ہوئی اور صحیح گرفت ہوئی اسی طرح بعض دفعہ طالبین پر معمولی بات پر عتاب کرتے ہیں کیونکہ واقع میں وہ معمولی نہیں ہوتی خدا تعالیٰ کے یہاں بھی جو باتیں ہمارے نزدیک ذرا سی اور چھوٹی ہیں اور ہم ان کو معمولی سمجھتے ہیں بعض اوقات ان پر پکڑ ہو جائے گی کیونکہ وہ واقع میں بڑی باتیں ہیں ایک عالم شخص کا قصہ میں نے اپنے ابتدائی کتابوں کے استاد سے سنا ہے وہ بواسطہ شیخ وہاں کی فرماتے تھے کہ ان کا مکہ میں انتقال ہوا کسی ضرورت سے قبر کھولی گئی تو دیکھا اس کی صورت مسخ ہو گئی اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ یہ ایسا کیا عمل کرتا تھا معلوم ہوا کہ بیوی سے مشغولی کے وقت نہاتا ہوا گھبراتا تھا اور اس مسئلہ میں عیسوی مذہب کی مدح کرتا تھا ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں تو ممکن ہے کہ کسی کی ظاہری نظر میں یہ ذرا سی بات ہو مگر فی الواقع ایسی ذرا سی بات ہے جیسی شیطان کی ذرا سی بات تھی کہو کہ ءاسجد لمن خلقت طینا اور خیر منہ خلقتنی نار و خلقتہ من طین اور یہی بات تھی جو شیطان نے کہی تھی کہ خدا کے حکم کو خلاف حکمت کہا تھا مگر واقع میں کتنی بڑی بات تھی اسی وجہ سے ابد الابد کے لئے جہنمی ہو گیا یہ بیچ کا مضمون تو حضرت حاجی صاحب کے ارشاد کی مناسبت سے کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو استطراد آ گیا اصل مضمون یہ تھا کہ اس دعا کرانے والے سے فرمایا کہ ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا افسوس کر رہا ہے حقیقت میں دنیا جیل خانہ ہی ہے جس کے ختم ہوتے ہی باغ و بہار ہے۔ ہاں جو لوگ یہاں سے پاک صاف ہو کر نہیں گئے وہ کچھ دنوں کے لئے حمام اعظم (دوزخ) میں جاویں گے کوئی ہزار برس کوئی دو ہزار برس مگر ہزاروں برس گو ظاہر نظر میں بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں مگر واقع اور حقیقت میں خلود جنت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں بہت تھوڑی مدت ہے کیونکہ یہ زمانہ مومنین کے دوزخ میں رہنے کا محدود ہے اور جنت کا قیام غیر محدود ہے پس کوئی مسلمان شخص آخرت میں نقصان میں نہیں اسی طرح اس کے مرنے کے بعد دنیا میں بھی کسی کا نقصان نہیں نہ مردہ کا کہ وہ یہاں سے اچھی جگہ چلا گیا نہ زندوں کا ان کو مردہ سے اچھی چیز مل گئی یعنی ثواب اور پھر چند روز میں خود وہ مردہ بھی مل جائے گا جیسا مفصل بیان ہوا اور یہاں جو لا تحزنی ولا تحسبی (نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا) ارشاد ہے اس کے متعلق ایک نہایت اور مفید مضمون قابل بیان ہے۔

اختیاری غم ممنوع ہے اضطراری نہیں

وہ یہ ہے کہ لا تحزنی (نہ غمگین ہونا) کا یہ مقصود نہیں کہ مطلق غم مت کرو وہ تو امر طبعی غیر اختیاری ہے اس کے ساتھ امر ونہی متعلق نہیں ہو سکتا بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے غم نہ کرو باقی جس قدر خود ہوا سے ہونے دو یہاں دو سوال و جواب ضروری ہیں دوسرے سوال کے جواب میں اس کی توضیح ہو جائے گی کہ اختیار سے غم کرنے کی ممانعت ہے اضطراری سے ممانعت نہیں ایک سوال تو یہ ہے کہ اللہ میاں نے غم کو اضطرار اہو پیدا ہی

گیا اور اس سے مقصودیت مذکورہ بدالالت ثابت ہوگئی اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کی بقا کس شے پر موقوف ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ تمام دار و مدار تمدن پر ہے کہ سب آدمی جمع ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں کوئی گھر بنادیں کوئی کھیتی کرے وغیرہ وغیرہ اگر تمدن نہ ہوگی کام اتنے ہیں کہ ایک آدمی سے انصرام سخت دشوار ہے غرض بقاء کا مدار اجتماع پر ہے اجتماع کا تعاون پر اور تعاون کا ترجم پر ترجم کے بغیر کون کسی کی مدد کرتا ہے یہاں پر عبد الرحیم ہے اگر ترجم نہ ہوتا تو انکی کون مدد کرتا اب اہل قصبہ جو اس کی مدد کر رہے ہیں محض ترجم کی بناء پر اور ترجم بدوں کسی کے مصیبت میں پڑے ہوئے پیدا نہیں ہوتا تو ترجم کا سبب غم ہوا اور ایک دوسرے کی اعانت جس کی وجہ سے دنیا کا قیام ہے ترجم پر موقوف ہے تو دنیا کا قیام بھی غم پر ہوا غم ایسی چیز ہے تو اگر خدا کسی کو غم دے تو سمجھو کہ بڑی نعمت دی یہ حکمت ہے غم کی پیدائش میں اب رہا دوسرا سوال کہ پھر شریعت کا یہ حکم کیوں ہے کہ غم نہ کرو اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے متعلق غم سے جس کا ایک درجہ اضطراری ہے ممانعت نہیں کی خود حضور فرماتے ہیں انا بفراقک یا ابراہیم لمحزونون (ہم تمہاری جداء سے اے ابراہیم (علیہ السلام) غمگین ہیں) بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غم خود ہوا اسے ہونے دوا اپنے اختیار سے نہ بڑھاؤ پس ممانعت اختیاری غم سے ہے اس کا پتہ خود قرآن سے چلتا ہے وہ یہ ہے کہ امر و نہی اعمال اختیاریہ پر ہوتی ہے اگر غم بالکل غیر اختیاری شے ہے تو لا تخافوا ولا تحزنوا (تم نہ اندیشہ کرنا اور نہ غمگین ہونا) میں یہ لائیں کہ کیا پس حاصل یہ ہے کہ کچھ غم تو اضطراری ہے اس میں تو حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور کچھ ہم لوگ تدبیروں سے پیدا کر لیتے ہیں بس اس کی ممانعت ہے کیونکہ یہ ضرر رساں ہے وہ تدبیریں غم بڑھانے کی یہ ہیں کہ واقعہ کو قصداً سوچتے ہو اسکا تذکرہ کرتے ہو اس سے غم بڑھتا ہے اور سوچنا اور بلا ضرورت تذکرہ جو کہ سبب ہے غم کا وہ اختیار میں ہے تو جب ان اسباب کو بند کر دو گے اور اس طرف سے توجہ ہٹالو گے تو اتنا غم نہ ہوگا۔ یہی راز ہے اس کا کہ شریعت نے مواقع غم میں ذکر اللہ کی تعلیم کی ہے جس سے توجہ دوسری چیز کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور دوسری چیز بھی ایسی کہ جس کی شان یہ ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (یاد رکھو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) اور جس کی نسبت یہ ارشاد ہے ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا اتنزل علیہم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا یہاں لا تخافوا ولا تحزنوا (تم نہ اندیشہ کرو اور نہ غم کرو) انشاء بمعنی خبر ہے اور دوسری آیت میں لا خوف علیکم فرمانا اس کا قرینہ ہے یہاں لا خوف علیکم (یہاں حقیقت مراد ہے وہاں لا تخافوا ولا تحزنوا میں مجاز الحمد للہ مدلول آیت کے بیان سے فراغت سبحان اللہ اللہ اکبر کیسی جامع تعلیم ہے کہ قلت صبر کے دو سبب جدا جدا بیان فرمائے حزن خوف پھر ان دو سببوں سے نصاً ممانعت فرمائی اور انا راد وہ الیک (ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا دیں گے) میں اپنی اور مرنے والے کی بھلائی کے مراقبہ کی قیاساً تعلیم فرمادی جیسے اس قیاس کی تقریر جس جگہ اعرابی کے اشعار مذکور ہیں اصبر فکن بک صابرین (صبر کرتا کہ تیری وجہ سے ہم بھی صبر کرنے والے ہیں) بیان کی گئی ہے آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی کیسی جامع تعلیم ہے اور یہ کیسے عنوانات ہیں جن سے وہ تعلیم عقلی بھی اس جامعیت پر کسی نے خوب کہا ہے

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بوا ارباب معنی را
 اس کے عالم حسن کو بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جاں کو
 بوسے تازہ رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ یہ مراقبہ یعنی تمام واقعات مصیبت میں بھلائی کا سوچنا بہت ہی نافع
 ہے اس سے غم کا فور ہو جاتا ہے اور وہ بھلائیاں فرضی نہیں بلکہ واقعی ہیں کیونکہ ہر مصیبت میں یقیناً منافع ضرور
 ہوتے ہیں وقت نہیں رہا ورنہ مصیبت کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل دار بیان کرتا ان واقعات کو ان کے منافع کا
 اجمالاً ایک دوسرے موقع پر ذکر فرمایا گیا چنانچہ ان واقعات کا ذکر تو اس آیت میں وَلَنَسْلُوَنَكُم بِشَىْءٍ مِّنَ
 الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ اور ثمرات کا ذکر اس آیت میں سے
 وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَأَنَا لِلَّهِ رَاجِعُونَ اور کافی تعلیم صبر کے متعلق
 اس آیت میں بھی مذکور ہے جس کا بیان اس وقت کیا گیا مگر ضمن میں ایک قصہ کے جو اس کا مصداق ہے۔

خوشر آں باشد کہ سرد لبراں گفتہ آید در حدیث دیگران

(ایسے روز کا دوسرے حکایات اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

حق تعالیٰ نے پہلی امت کا ایک قصہ بیان فرما کر اس کے ضمن میں جو مقصود اور مطلوب عمل تھا وہ ہم پر ظاہر
 فرمایا کہ دیکھو جن لوگوں نے اس عمل کو کیا ہے ان کو کس قدر ثمرے ملے ہیں تم بھی اگر ایسا کرو گے تم کو بھی اسی طرح
 ثمرات ملیں گے۔ قرآن شریف بڑی نعمت ہے اس کی تعلیم کی طرف علماء و عملاً توحید کرو ہمارے ذمہ حق ہے کہ
 قرآن شریف نے جو تعلیم کی ہے اس پر عمل کریں۔ بالخصوص جس چیز کا اس وقت بیان کیا گیا ہے یعنی صبر گو بعض
 وقت بعض عمل اور بعض احکام مثلاً صبر ہی ہے نفس کو ناگوار ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے فہم میں اس کے مصالح نہیں
 آتے مگر واقع میں اس میں مصالح ہوتے ہیں جیسا کہ میرے بچپن کا قصہ ہے کہ مجھے اس وقت کنکڑے کا شوق تھا
 گواڑا نہ آتا تھا اور کتابیں بھی پڑھتا تھا جہاں مدرسہ سے آیا کنکڑے لے کر باہر چل دیا اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہتا
 تھا سر پر بال تھے ان کو سر دھونے کا خیال تھا مگر میں جہاں مدرسہ سے آیا کنکڑے لے کر چل دیا کسی طرح ان کے ہاتھ
 نہ آتا تھا کہ وہ سر دھویں ایک روز انہوں نے کھلی کٹورے میں بھگو کر پہلے سے رکھ دی جب میں مدرسہ سے آیا تو فوراً
 میرے سر میں ڈال دی پھر میں تو مجبور ہو گیا اور سر دھلوانا پڑا گو اس وقت ان کا یہ عمل مجھے ناگوار ہوا مگر انہوں نے یہ
 سب محبت کے مآل کار پر نظر کر کے میرے نفع کے واسطے ایسا کیا۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی بندہ کے ساتھ بھلائی
 کرتے ہیں تو اس پر راضی رہو۔ خصوصاً جب تم کو دعویٰ محبت کا ہے تو راز سے چر کہ سے بھاگنا نہ چاہئے اگر
 بلا اختیار کچھ منافع فوت ہو جاوے خواہ ظاہری یا باطنی حتیٰ کہ اگر باطنی حالات و کیفیات بھی چلے جاویں تو اس میں
 خدا کی حکمت ہے گھبراؤ نہیں وہ حال یا اس کا بدل لوٹے گا ورنہ یہی کہا جاوے گا۔

تو بیک زخمی گریزانی ز عشق تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق
(تم ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتے ہو تو تم بجز عشق کے نام کے اس کی حقیقت سے ناواقف ہو)
بس یوں سمجھ لیا کرو کہ اس وقت اس کے فوت ہی میں تمہارے لئے مصلحت ہے اگر باقی رہنا ہمارے حق میں
مناسب ہوتا تو کبھی بھی نہ زائل ہوتا ہمیں خدا سے محبت کا دعویٰ کر کے اس قدر نازک مزاجی تو بھی مناسب نہیں۔

خوف و حزن کا بقاء اختیاری ہے

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ خوف و حزن تو امر غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ کے ساتھ تکلیف متعلق نہیں ہوتی
کیونکہ نص میں ہے کہ لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا تو پھر یہاں لَا تَخَافُ وَلَا تَحْزَنُ بصیغہ نہی کیوں فرمایا گیا
جس میں خوف و حزن سے ممانعت ہے حالانکہ امر و نہی امور اختیاریہ سے متعلق ہوتی ہے نہ کہ غیر اختیاریہ سے۔
اس کا جواب وہ ہے جو میری تقریر سے ابھی معلوم ہوا حال اس کا یہ ہے کہ خوف و حزن حد و ثبات تو غیر
اختیاری ہے مگر بقاء اختیاری ہے کہ تذکرہ و تذکر سے بڑھتا اور عدم تذکر سے گھٹتا ہے پس یہاں لَا تَخَافُ
وَلَا تَحْزَنُ کا مطلب یہ ہے کہ خوف و حزن کو لے کر نہ بیٹھنا اور اس کا بار بار تذکرہ اور خیال نہ کرنا کہ اس سے
غم بڑھے گا عورتیں اس بات کو خوب جانتی ہیں کیونکہ اس میں تذکرہ بہت ہوتا ہے اسی لئے ان کا غم برسوں رہتا
ہے اور مردوں میں تذکرہ کم ہوتا ہے ان کا غم بہت جلد کم ہو جاتا اور دو چار دن میں گویا مفقود ہو جاتا ہے۔
وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى اِمِّ مُوسٰى اِنْ اَرْضٰیْجَہُ فَاِذَا خَفَتْ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافُ وَلَا تَحْزَنُ (۲۰)
اس میں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال کر
بے فکر ہو جانا۔ خوف و حزن نہ کرنا۔

درجات خوف و حزن

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا عدم خوف و عدم حزن اختیاری ہے ظاہر میں تو غیر اختیاری علوم ہوتا ہے پھر غیر
اختیاری کے ساتھ امر و نہی کا تعلق کیسا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خوف و حزن کا ابتدائی درجہ ہے۔ وہ تو غیر
اختیاری ہے اور ایک وہ درجہ ہے جو اس سوچ بچار سے پیدا ہوتا ہے کہ ہائے وہ بچہ میرے پاس کھیلتا تھا۔ مجھے لپنتا
تھا۔ اب میری گود سے الگ ہو گیا نہ معلوم کس حال میں ہوگا۔ نہ معلوم کس نے پکڑا ہوگا۔ یہ درجہ اختیاری ہے اس
سے ان کو ممانعت کی گئی کہ بس دریا میں ڈال کر بے فکر ہو جاؤ ہمارے سپرد کر کے پھر کچھ نہ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔
اسی سے سمجھ لو کہ بعض لوگوں کو جو خوف خدا نہ ہونے کی شکایت ہے اس میں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں کیونکہ
جو خوف مامور بہ ہے وہ اختیاری ہے جو فکر اور سوچ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے فقدان کی شکایت ہے وہ غیر
اختیاری ہے اور یہ مامور بہ نہیں پس غیر مامور بہ کے فقدان سے غم کیوں ہے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سوچ
اور فکر قطع کرو کہ ہائے وہ بچہ ایسا تھا ویسا تھا۔ اس کے قطع کرنے سے ان شاء اللہ غم کو ترقی نہ ہوگی۔

اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ بعض لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں پھر بھی ان کا غم کم نہیں ہوتا اس کی وجہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں مگر میرے دل میں ابھی اس کی وجہ آئی ہے وہ یہ کہ لوگ جس طرح اس واقعہ کو نہیں سوچتے جس سے غم بڑھتا اسی طرح اسباب تسلی کو بھی نہیں سوچتے جس سے کم ہوتا اس وجہ سے غم میں کمی نہیں ہوتی اور بحالہ رہتا ہے۔ ان کو چاہئے کہ اسباب تسلی کو سوچا کریں مثلاً یہی کہ حق تعالیٰ کے افعال حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ اس میں ضرور حکمت ہے اور یہ کہ موت مسلمان کے لئے باعث راحت ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو لا تحزنی ولا تخافی میں قطع خوف و حزن کا امر فرمایا ہے اس کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ خود مت سوچنا کہ ہائے اب کیا ہوگا۔ اب بچہ کس حال میں ہوگا بلکہ ان کو دریا میں ڈال کر بے فکر ہو جانا ہائے ان کا کیسا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے بچہ کو دریا میں ڈال کر بے فکر ہو گئیں اور کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔

خوف و حزن کے دو درجے

فرمایا ہے ولا تخانی ولا تحزنی اشکال یہ ہے کہ خوف و حزن اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ شق اول تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ رنج و واقعات سے طبعی طور پر رنج ضرور ہوتا ہے وہ بندہ کے اختیار سے باہر ہے پس شق ثانی متعین ہو گئی یعنی خوف و حزن غیر اختیاری ہے پس اب اشکال یہ ہے کہ جب یہ غیر اختیاری امر ہے تو پھر اس سے نہیں کیوں ہے کیونکہ امر و نہی کا تعلق امور اختیار یہ سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اختیار یہ سے۔ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ خوف و حزن کے دو درجے ہیں ایک غیر اختیاری یہ خوف و حزن طبعی ہے اور ایک اختیاری یہ خوف و حزن عقلی ہے۔ مثلاً طبعی حزن تو یہ ہے کہ ایک واقعہ رنج دہ ہوا اور دل پر اس سے چوٹ لگی بے قراری ہوئی اور عقلی درجہ یہ ہے کہ اس غم کو لے کر بیٹھ جائے اس میں غور و فکر کرتا رہے قصد اس کو یاد کرتا رہے زبان سے تذکرہ کرتا رہے اس طرح جو شخص غم کو لے کر بیٹھے گا تو غم پہلے سے زیادہ ہوگا تو لا تخانی ولا تحزنی میں طبعی حزن کی ممانعت نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ عقلی حزن کی ممانعت ہے جو اختیار سے پیدا ہوتا ہے اور گو حزن طبعی کو حدوث غیر اختیاری ہے مگر تدبیر و علاج سے اس میں تقلیل ہو سکتی ہے اور علاج یہ ہے کہ طبیعت کو دوسری چیز کی طرف متوجہ کرے یہ عام قاعدہ ہے کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے چیز کمزور ہو جاتی ہے اور بعض امور کو تو بعض کے ازالہ یا تضعیف میں خاص دخل ہوتا ہے مثلاً غم کی حالت میں بشارت کو یاد کرنا ازالہ غم میں بہت مفید ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اول تو عقلی حزن و خوف سے منع فرمایا پھر طبعی حزن و خوف کے ازالہ کی یہ تدبیر فرمائی کہ انار آدوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین کی بشارت سنائی اس میں مصیبت فراق کی غایت وحد بھی بتلادی کہ یہ ایک دن ختم ہونے والی ہے اور اس کے ساتھ ایک بشارت عظمیٰ بھی سنادی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنانے والے ہیں تو یہ مصیبت مرتفع ہو کر ایک نفع زائد حاصل ہوگی۔

وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تُهْتَزُّ كَانَهَا جَانٌّ وَلِي مُدِيرًا وَلَمْ

يُعَقِّبْ يَمُوسَى أَقْبَلُ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنی عصا ڈال دو سو انہوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم یہ ہوا) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت تم (ہر طرح) امن میں ہو۔

تفسیری نکات

طبعی خوف نبوت و کمال کے منافی نہیں

جو باتیں طبعی ہوتی ہیں یہ منافی کمال کے نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کیسے قوی القلب تھے مگر قرآن پاک میں قصہ موجود ہے ولی مدبرا ولم یعقب یموسی لا تخف انی لا یخاف لدی المرسلون - یعنی جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کے حکم سے عصا زمین پر ڈالا اور وہ اڑ دھا بن گیا خود موسیٰ علیہ السلام اس سے ڈر کر بھاگے یہ طبعی خوف تھا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میں نے ان کا ایک آدمی خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیش ہے (کہ کہیں اول وہلہ میں) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں۔

تفسیری نکات

حربی کے قتل کو ناجائز قرار دینے کا سبب

سورہ قصص کی آیت جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبلی کو قتل کر دینے اور پھر جناب باری میں اس پر استغفار کرنے اور حق تعالیٰ کی طرف سے مغفرت فرمانے کا تذکرہ ہے اس کے متعلق فرمایا کہ اس میں ایک سوال ہے وہ یہ کہ قبلی کافر تھا اور کافر بھی حربی جس کا خون حسب قواعد شرعیہ مباح ہے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے استغفار کیوں کیا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی مغفرت کا ذکر فرما کر اس کی تقریر کر دی گئی کہ یہ قتل مناسب نہ تھا تو سوال یہ ہے کہ حربی کافر کے قتل کو ناجائز یا نامناسب قرار دینے کا سبب کیا ہے پھر فرمایا کہ مدت

سے میرا ایک خیال ہے وہ یہ کہ کفار سے جیسے باقاعدہ زبانی یا تحریری عہد ہو جاتا ہے تو اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے اسی طرح بعض اوقات عملی عہد ہو جاتا ہے کہ باہمی طرز معاشرت اور تعامل سے فریقین ایک دوسرے سے مامون و بے خطر ہوں باہمی معاملات اور لین دین وغیرہ جاری ہو یہ بھی ایک نوع عہد عملی کی ہے اس کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے کہ اگر کسی وقت ایسے لوگوں پر حملہ کرنا ہے تو پہلے ان کو بند عہد کے طور پر متنبہ کر دیا جائے کہ اب ہم سے مامون نہ رہیں پھر طرفین کو اپنے اپنے فعل کا اختیار ہے اور بغیر اس بند عہد کے اس قسم کا عذر ہے جو شریعت اسلامیہ میں کسی حال کسی کافر سے جائز نہیں قبلی کا واقعہ بھی اسی قبیل سے تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام مع اپنے متعلقین بنی اسرائیل کے اور قبلی کفار دونوں فرعون کی سلطنت کے باشندے تھے اور ایک دوسرے سے باہم مامون تھے۔ اسی حالت میں قبلی کا اچانک قتل کر دینا عہد عملی کے خلاف تھا اس لئے اس پر عتاب ہوا اور استغفار و مغفرت کی نوبت آئی۔ رہا یہ سوال کہ جب یہ قتل بحکم غدر اور معصیت تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم رسول اور معصوم ہیں ان سے کیسے صادر ہوا اس کا جواب ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قصداً قتل نہیں کیا معمولی ضرب اس کو ہٹانے کے لئے لگائی تھی اتفاقاً مر گیا اس لئے معصیت کا صدور ان سے نہیں ہوا تاہم صورت معصیت کی تھی اس لئے پیغمبر خدا نے اس کو بھی اپنے حق میں معصیت ہی کے برابر سمجھ کر استغفار کیا۔

(صحیح بخاری کی ایک حدیث بروایت مغیرہ ابن شعبہ میں اس کا ثبوت اور قسطلانی شرح بخاری میں اس کی تصریح ہے)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَأْتِيهَا الْمَلَائِكَةُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي

ترجمہ: اور (دلائل موسویہ دیکھ سن کر) فرعون کہنے لگا کہ اے اہل دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا۔

تفسیری نکات

نمرود و فرعون خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے

چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے اسی لئے فرعون کہتا ہے مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہیں کر سکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو انار بکم الاعلیٰ کہا ہے اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے کہ جو قاضی شاء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ فرعون دھری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی

اس کا رب ہے اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہیں حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ رعایا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے اس لئے وہ اپنے رب کو رب اعلیٰ کہتا تھا یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنے والوں سے بڑا رب ہوں تو میں سب سے بڑا رب ہوں یہ مطلب تھا اس کے قول کا یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ تو سرے سے خدا ہی کا منکر تھا اسی لئے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا وما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے) وہ کمبخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔

شان موسویت

پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپ کی کسر شان ہے اعراف العارفين تھے (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسول اور نبی تھے جو منتہائے کمالات بشریہ ہے) آپ نے جواب دیا رب السموت والارض وما بینہما ان کنتم موقنین خدا وہ ہے جو آسمان اور زمین کا جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا کہ کنہ ذات باری مدرك نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اس طرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقع میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے مجیب کا عجز سمجھا جائے اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کو سن کر تمسخر کیا اور قال لمن حوله الاتستمعون اپنے پاس والوں سے کہنے لگا کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ قال ربکم و رب آباءکم الاولین۔ فرمایا کہ خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گزشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا۔ ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی (اور ایسی وجہ بیان کی جو اثبات وجود صانع کے لئے بالکل کافی تھی چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان وزمین اور ان کے مابین جو اشیاء ہیں سب کا رب ہے اس میں فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کر دی کہ بس جو جس کی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے

الوہیت کی تو بتلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی ہوا آگ وغیرہ کس نے پیدا کی ظاہر ہے کہ یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لئے تابع ہونا ضروری ہے جب ان کا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے اور ضرور کوئی اور ہی رب ہے علیٰ ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں یہ کون پیدا کرتا ہے۔ اگر کہو کاشتکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بدہمتہ غلط ہے اور کاشتکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے کے سوا کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہیے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیدا ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق بارہا پیدا اور نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے جب فرعون اس سے لا جواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جس میں صراحتہ اس کے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں بتلا دیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو بتلا کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکہ زندہ رہتی ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مر جائے اور مربوب زندہ رہے اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مرجاتی خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا اس نے اپنے آپ کو زندہ کیوں نہ رکھا جب وجود اس کے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں یہی گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دیدیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہو سکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے وہی رب العالمین ہے) جب فرعون اس پر بھی لا جواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا کہ یہ تو جواب بالکنہ نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی قال رب المشرق والمغرب وما بينهما ان كنتم تعقلون فرمایا کہ تربیت کرنے والا ہر شخص مشرق کی اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کیونکہ یقیناً طلوع شمس وغروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں انسان تو یہ چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العالمین ہے)

صاحب حق مرعوب نہیں ہوتا

غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا۔ ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا سلطنت کا رعب بھی نہ ہوا صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہی جس کا فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا ۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہیے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہیے۔ یہ آج کل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ بولو گے جواب وجہ ہی سے ملے گا۔ پھر

چو حجت نماید جفا جوئے را بہ پر خاش درہم کشد روئے را

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ: اور ایسے شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدوں اس کے منجانب اللہ کوئی دلیل (ان کے پاس نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

تفسیری نکات

مذمت ترجیح ہوی

ایک مرض کو حق تعالیٰ ایک خاص عنوان سے جس سے اس مرض کا منشا بھی معلوم ہو جاوے گا اس جگہ بیان فرماتے ہیں چنانچہ وہ مضمون اور اس کا منشا ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا سوارشاد ہے و من اضل ممن اتبع هوہ بغیر ہدی من اللہ یعنی کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص نے جس نے اتباع کیا اپنی خواہش کا بدوں اس کے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی کوئی ہدایت یعنی دلیل شرعی ہو یعنی بغیر ہدایت اور دلیل شرعی کے اس نے اتباع کیا اپنی خواہش نفسانی کا ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کس بات کی مذمت فرما رہے ہیں اور یہ ذرا توجہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ واقعی ہم لوگوں میں یہ مرض عام ہے یا نہیں سو حق تعالیٰ مذمت فرماتے ہیں خواہش نفسانی کی کہ جس چیز کو جی چاہا کر لی اور ظاہر ہے کہ خواہش نفسانی کا جب ایسا اتباع ہوگا گناہ اس کی نگاہ میں ثقیل اور عظیم نہ ہوگا بلکہ خفیف اور سرسری ہوگا۔ اس سے دونوں باتیں معلوم ہو گئیں مرض بھی یعنی استخفاف معاصی اور

اس کا منشا بھی یعنی اتباع ہوا ہے اور اس کا مرض عام ہونا بھی ظاہر ہے۔

چنانچہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری حالت یہی ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا پس ہمارے یہاں مرنج محض اتباع ہوئی ہے خواہ فعل ہو یا ترک فعل..... دونوں میں مرنج یہی ہے اور کچھ نہیں اور مرنج کا اشتراط ظاہر ہے کیونکہ یہی مسئلہ مسلمہ ہے کہ القدرة تتعلق بالضدين یعنی قدرتی کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ضد پر تو قدرت ہو دوسری پر نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھنے پر قادر ہے تو اس کے ترک پر بھی ضرور قادر ہوگا افعال مقدورہ میں دونوں جانبوں یعنی فعل و ترک پر قدرت ہوتی ہے اور ایک وجہ کو دوسری جانب پر ترجیح کسی خاص وجہ سے دی جاتی ہے۔

غرض فعل ہو یا ترک فعل ہر ایک کے لئے مرنج ہونا چاہیے یعنی کوئی ایسا داعی ہونا چاہیے جس کی وجہ سے انسان اپنی قوت ارادہ کو ایک جانب کی طرف منحرف کرے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افعال یا ترک میں وہ داعی کون ہے عقلاً دو حال سے خالی نہیں یا داعی مذموم ہے اور وہ ہوئی ہے یا داعی محمود ہے اور وہ ہدی ہے یہی دونوں چیزیں اس آیت میں بھی مذکور ہیں اور دونوں کے لفظ ہم قافیہ بھی ہیں پس داعی بننے کے قابل یہی دو چیزیں ہیں گر بندہ کی شان اتباع ہدی ہونا چاہئے یعنی حق تعالیٰ کی اجازت اور شریعت کی دلیل سے ایک جانب کو ترجیح دینا چاہیے۔ پس اس آیت میں اسی بات کی مذمت کی ہے کہ ہوئی کو ہدیٰ پر ترجیح دی جاتی ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ آیت بدالالت سباق و سیاق کفار کی شان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مناط مذمت کیا ہے سو ظاہر ہے کہ مناط مذمت وہ صفت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اس لئے جس میں بھی یہ صفت ہوگی وہ قابل مذمت ہوگا وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات من حیث الذات سے نفرت نہیں ہے اگر ذات سے بغض ہوتا تو حق تعالیٰ کفار کو ایمان کا مکلف نہ فرماتے کیونکہ اس حالت میں ایمان کا مکلف بنانا محض بے سود ہوتا کیونکہ اگر کوئی کافر ایمان لے آوے تو ذات تو وہی رہتی ہے اور ذات سے ہوتا بغض تو ایمان لانے سے کوئی نفع نہ ہوتا اور اس کی مخاطبت کو عبثیت لازم ہوتی (یعنی حق تعالیٰ کا اس کو مخاطب با ایمان بنانا ایک فعل عبث ہوتا اور حق تعالیٰ فعل عبث سے منزہ ہیں بس ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں بلکہ جس سے بغض ہے اس کے افعال کی وجہ سے ہے خواہ افعال باطنی ہوں یا ظاہری جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اس آیت میں جو کفار کی مذمت ہے تو وہ کسی خاص فعل اور خصلت پر ہے اس لئے جہاں وہ خصلت ہوگی وہاں مذمت بھی ہوگی خواہ وہ خصلت مسلمان ہو یا کافر میں اس لئے آیت کا کفار کی شان میں ہونا بے فکری کا سبب نہیں ہو سکتا۔

وَمِنْ أَضْلٍ مِّمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغِيرَ هُدًى مِنَ اللَّهِ

اقسام ہوئی

ہر چند کہ ہوئی لغتہً خواہش محمود مذموم دونوں کو عام ہے مگر اکثر ہوئی کا اطلاق ہوائے مذموم پر ہی ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ہدیٰ من اللہ قید واقعی ہوگی اور کبھی ہوئی کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی آتا ہے چنانچہ

ایک حدیث میں ہے کہ بعض عورتیں آپ سے کہتی تھیں کہ ہم نے اپنے نفس کو آپ کے لئے ہبہ کیا یعنی اپنے کو بلا مہر کے آپ کے نکاح میں دیتی ہیں کیونکہ آپ کا نکاح بلا مہر سے بھی صحیح ہو جاتا تھا حضرت عائشہؓ نے ان عورتوں کو ایک بار بے حیا کہہ دیا اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وامرأة مومنة ان وهبت نفسها للنبي الى قوله ترجى من تشاء منهمن و تؤى اليك من تشاء
اس پر حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا ما اری ربک الا یسارع فی ہواک یہاں بھی لفظ ہوا آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش محمود ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کا اطلاق ہوا محمود پر بھی ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ہدی من اللہ قید احترازی ہوگی فیصلہ یہ ہوگا کہ ہوئی دو قسم کی ہے ایک وہ جو تا بعد ہدی کے ہو اور ایک وہ جو تابع ہدی کے نہ ہو پس جو ہوئی تابع ہدی کے ہے وہ ہوئی اہل اللہ کی ہے ان کا نفس مطمئنہ ہوتا ہے جس کا تعلق رضا سے ہو چکا ہے وہ یہ بات ہے جو بہلولؓ کی حکایت میں ہے کسی بزرگ سے انہوں نے پوچھا کہ کس حال میں ہو ان بزرگ نے فرمایا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف دنیا میں کچھ بھی نہ ہوتا ہو کہا یہ کیسے؟ فرمایا یہ ایسے کہ میں نے اپنی خواہش کو حق تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہے اب کوئی واقعہ میری خواہش کے خلاف ہوتا ہی نہیں پھر مجھے راحت ہی راحت ہے رنج کیوں ہو۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۶۶﴾

ترجمہ: آپ جسکو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے۔

تفسیری نکات

ضرورت قصد اصلاح

فرمایا کہ قرآن میں جو ارشاد ہے کہ انک لا تہدی من احببت ولكن الله يهدي من يشاء اس آیت میں یشاء کی ضمیر جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے لیکن قواعد عربیہ کے موافق ایک دوسری توجیہ لطیف بھی ہو سکتی ہے کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص خود اپنی ہدایت کا قصد کرے خدا تعالیٰ اس کو ہدایت دیتے ہیں اور اس امر کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے کہ اگر خود قصد کرے تو خدا تعالیٰ بھی امداد فرما دیتے ہیں ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے الذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے انلزمکموھا وانتم لها کرھون۔ یہ ملفوظ اس پر بیان کیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے۔ شیخ اس کی اصلاح نہیں کر سکتا (ملفوظ نمبر ۸۹)

عزم اصلاح

اور قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی ایک تفسیر پر یہ مضمون معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے انک لاتھدی من احببت ولكن الله یھدی من یشاء اس آیت کی ایک تفسیر تو مشہور ہے اور ایک تفسیر اس کی یہ بھی ہے کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو اور معنی آیت کے یہ ہوں کہ بیشک آپ نہیں راہ دکھلاتے جس کو آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت کرتے ہیں اس شخص کو جو اپنی ہدایت کو چاہے اور دوسرے مقام پر یہ مضمون تصریحاً ارشاد ہے ومن اراد الاخرۃ و سعی لها سعیھا (اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسے ہی سعی بھی کرے گا۔ مدار آخرۃ کا بندہ کی اور سعی اور ارادہ پر رکھا ہے اور بیشک صحیح ہے کہ بغیر حق تعالیٰ کی مشیت سے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن عادیۃ اللہ یونہی جاری ہے۔ جب کہ بندہ ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی چاہتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور آپ سے آپ کام ہو جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انلزمکموھا و انتم لها کارھون یعنی کیا ہم تم کو اپنی رحمت یعنی ہدایت چپکا دیں اور تم اس کو ناپسند کرنے والے ہو۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تمہاری طرف سے تھوڑی توجہ ہوگی تو اس طرف سے بہت زیادہ ہوگی لیکن ابتدا تمہاری طرف سے ہونا ضروری ہے حدیث قدسی ہے من تقرب الی شبرا تقرب الیہ ذرا عا ومن تقرب الی ذرا عا تقرب الیہ باعا۔ یعنی جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہو میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب ہو میں اس کی طرف ایک باع (یعنی دو ہاتھ کھلے ہوئے) قریب ہوتا ہوں تو کوشش کرو اور اپنی ہمت خرچ کر لو اور پھر بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ کوشش اور سعی بیکار گئی بلکہ ثواب ضرور ملے گا کام پر تو ثواب ہوتا ہی ہے صرف ارادہ پر بھی ثواب ملتا ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ومن یشاء من بیتہ مهاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ یعنی جو شخص اپنے گھر سے نکلے اس حالت میں کہ وہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے والا ہو پس اس کا ثواب اللہ تعالیٰ پر ثابت ہو گیا لیکن ارادہ سوچنے اور تمنا کرنے کو نہیں کہتے۔

غرض اس ضرورت سے اس مضمون کا ذکر ضروری ہوا تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے پس جن بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعضے خود کو کعبے ہی میں آنا پڑا اور جب ایسوں کو بھی خود کعبے کی طرف جانے کی احتیاج تھی تو اس سوداگر کو تو کیوں ضرورت نہ ہوگی اور یہ تجارت چھوڑ کر جائیں نہیں تو محض حاجی صاحب کی دعا سے ان کو کیا نفع ہو سکتا ہے تو جو لوگ کچھ تدبیر کرتے بھی ہیں صرف اس قدر کرتے ہیں۔

شان نزول

صاحبو! خیال کیجئے ابوطالب جو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے محب کہ جس موقعہ پر تمام قریش نے مخالفت کی اور آپ کے دشمن ہو گئے اس موقعہ پر بھی ابوطالب نے ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے نہیں ارادہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوشش اور محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی اور آخر کار اپنی قدیم ملت پر ان کا خاتمہ ہو گیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی انک لا تہدی من احببت ولكن الله يهدي من يشاء (بیشک آپ ہدایت نہیں دیتے جس شخص کو آپ چاہیں لیکن بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ

اللَّهِ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ: اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جس حکم کو چاہتا ہے) پسند کرتا ہے ان لوگوں کو تجویز (احکام) کو کوئی حق حاصل نہیں اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

تفسیری نکات

اختیار تکوینی اور تشریعی صرف اللہ کیلئے ہے

وربک یخلق ما یشاء و یختار اور آپ کا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے) یعنی جس طرح صفت خلق میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح صفت اختیار میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہاں اختیار تکوینی مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یخلق ما یشاء (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) سے اختیار تکوینی خود ظاہر ہے۔ اگر بختار سے بھی اختیار تکوینی مراد ہوتا تو یخلق ما یشاء کے بعد اس کی ضرورت ہی کیا تھی معلوم ہوا کہ اختیار تشریعی مراد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں ما کان لہم الخیرۃ بندوں کے لئے کچھ اختیار نہیں۔ کیونکہ اوپر بختار میں اختیار شرعی کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے اس لئے ما کان لہم الخیرۃ۔ ان کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ میں اسی کی نفی مراد ہونی چاہیے۔ اس صورت میں لام

تعریف عہد کے لئے ہوگا اور اگر لام جنس کے لئے مانا جاوے تو عموم کی وجہ سے ہر اختیار کی نفی ہو جاوے گی۔ معنی یہ ہوں گے کہ اختیار تکوینی اور تشریحی دونوں خدا کے لئے مخصوص ہیں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں تو تشریحی نہ تکوینی۔ آگے فرماتے ہیں سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون۔ یعنی خدا تعالیٰ شرک تکوینی اور تشریحی دونوں سے پاک ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے الہ الخلق والامر یعنی خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ یہ آیت تو بہت زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں اختیار تکوینی کا احتمال بھی نہیں کیونکہ امر کا اطلاق جبکہ خلق کے مقابلہ میں ہے شریعت میں امر تشریع ہی پر ہوا کرتا ہے۔ امر کے معنی حکم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے سوا حکم کرنے والا اور احکام مقرر کرنے والا کوئی نہیں خلق سے اختیار تکوینی اور امر سے اختیار تشریحی مراد ہے اور دونوں کو بصورت حصر خدا کے لئے ثابت کیا گیا جس سے دونوں کی نفی ماسوا سے لازم آگئی۔ اور یہاں میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس آیت سے عالم مجردات کے وجود پر دلیل قائم کی ہے۔ عالم مجردات کو صوفیہ کی اصطلاح میں عالم امر بھی کہا جاتا ہے اس لئے الہ الخلق والامر یعنی خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ سے لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ خدا ہی کے لئے عالم خلق و عالم امر ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے اور وہ عالم امر کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ اصطلاح بعد میں حادث ہوئی۔ نزول قرآن کے وقت عالم امر کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر لوگوں کی عادت ہے کہ اصطلاحات علمیہ کو یاد کر کے ہر جگہ انہی کو چلایا کرتے ہیں۔

و ربک یخلق ما یشاء و یشاء ما کان لہم الخیرة سبحن اللہ و تعالیٰ عما یشرکون
ما کان لہم الخیرة میں صراحت اختیار عبد کی نفی ہے۔ مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو استعمال کا امر ہے بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں جس کا عنوان ثانی تجویز و رائے ہے مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ یہ اچھا ہی ہو جائے پھر اس کے ظہور و وقوع کا انتظار کرنا کہ کب اچھا ہوگا پھر تاخیر صحت سے پریشانی اور کلفت کا بڑھنا اس کی تو ممانعت ہے۔

ام للانسان ما تمنی للہ الاخرۃ والاولی

میں اس تجویز کی جڑ کاٹی گئی ہے کہ دنیا و آخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تم کو ان میں تجویز کا کوئی حق نہیں اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اس کے وقوع کا تقاضے کے ساتھ انتظار کیا جائے یعنی ایسا انتظار جس کی جانب مخالف کا تصور ناگوار ہو۔

حقیقت رجاء

یہ اس واسطے کہاتا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ میں انتظار انفرج بعد الشدة کی نفی کرتا ہوں سو خوب سمجھ لیجئے میں اس

کی نفی کرتا کیونکہ یہ تو رجاء ہے بلکہ میں خاص انتظار کی نفی کرتا ہوں مثلاً کسی کا بچہ بیمار ہے تو اگر اس کو اس کی صحت کا ایسا انتظار ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظار مذموم ہے اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظام مذموم ہے اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کی عدم صحت سے ناراض ہو اس پر اعتراض کرے اور اگر صحت و عدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ بھی کریں گے وہ عین حکمت ہے مگر دل چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حزن ہے اور حزن مذموم نہیں حزن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضا بھی ہوتی ہے حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی۔ گویا ہر میں ناگواری کی صورت ہو مگر دل میں ناراضی نہیں ہوتی۔ بلکہ رضا موجود ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا اپریشن بدوں کلورافارم سنگھائے کیا ہو تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی چلائے گا بھی ناک منہ بھی چڑھائے گا۔ مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہوگا چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کراہت ظاہرہ کے ساتھ رضا مجتمع ہو سکتی ہے۔ تو میں اس کراہت کی بھی نفی نہیں کرتا بلکہ میں صرف اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہر میں بھی ناگواری ہو یہاں تک کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت و شکایت ہونے لگے۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الأرض ولا فساداً والعاقبة للمتقين. (القصص آیت ۸۳)
یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

طب علوم مطلقاً مذموم ہے

فرمایا تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الأرض ولا فساداً حق تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے طب علوم مطلقاً مذموم ہے گو فساد نہ ہو اور جہاں فساد ہو وہاں تو بالکل منع ہے اور جہاں غلو ہو اور اس کے ساتھ غلو بلکہ دین سے غلو بھی ہو وہ مذموم کیسے نہ ہوگا (غالباً کسی خاص شخص کے متعلق تھا) (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۴۴)

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ٤٨

ترجمہ: سب چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے اسی کی حکومت ہے اور اسی کے پاس تم سب کو جانا ہے۔

تفسیری نکات

سوائے ذات باری کے سب فانی ہیں

مادہ ارواح ماسوی اللہ کے حدوث کی قطعی دلیل قرآن ہے یہ ہے کہ کل شیء ہالک الا وجہہ اور قاعدہ عقلیہ ہے ما ثبت قدمہ امتنع عدمہ اور جب سوائے ذات باری کے سب مالک ہیں ان پر عدم طاری ہو سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب حادث ہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کل شیء ہالک الا وجہہ اس کی ایک تفسیر تو مشہور ہے یعنی ہالک فی الاستقبال اور ایک تفسیر اس کی وہی ہے جو صوفیہ نے کی ہے یعنی ہالک فی الحال اور یہ تفسیر صاحب شرح عقائد نے بھی لکھی ہے شرح عقائد میں جس کا جی چاہے دیکھ لے مجھے چونکہ صوفیہ محققین سے محبت ہے اس لئے میں ان کی تائید کی تلاش میں رہتا ہوں اور متجسس ہر جگہ سے اپنا مطلب نکال لیتا ہے اس لئے میں نے اہل ظاہر ہی کی کتابوں سے تائید نکال لی اب علماء ظاہر جو صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں وہ شارح عقائد پر بھی فتویٰ لگائیں مگر اس کو سب پڑھتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا اور صوفیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے جہلا صوفیہ کی تو ہم بھی حمایت نہیں کرتے مگر محققین جس معنی کو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اس پر کیا حق اعتراض کا ہے پس خوب سمجھ لو کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کا وجود ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود تو اغیار کا بھی ہے مگر کالعدم ہے جیسے ستارے دن میں موجود تو ہوتے ہیں جس کو اہل علم جانتے ہیں مگر آفتاب کے سامنے کالعدم ہوتے ہیں نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تحصیلدار چہر اسی پر حکومت کرتا ہے اور اس وقت وہ حاکم معلوم ہوتا ہے مگر وائسرائے کے سامنے بول بھی نہیں سکتا اس وقت اس کی حکومت کالعدم ہو جاتی ہے نیز ایک ماہر فن قاری کے سامنے ایک طفل مکتب کو کوئی قاری نہیں کہتا کہ کسی قدر قراءت اس نے بھی پڑھی ہو مگر ماہر فن کے سامنے اس کو کوئی قاری کہے تو شرم سے گڑ جائے گا ہاں کوئی بے حیا ہو تو اور بات ہے۔

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْم ۝ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝

ترجمہ: الم (بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا اور ہم تو (ایسے واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزمایا چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گزرے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا اور جو ایمان کے دعویٰ میں سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔

تفسیری نکات مصائب کی حکمت جلی اور خفی

احسب الناس ان يتركوا الایة اس امتحان کے علاوہ جو کہ ایک حکمت جلی ہے کی ایک خفی حکمت بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب کوئی بلا آتی ہے تو اخلاق پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے جن نفسانی امراض کا بڑے بڑے مجاہدوں سے علاج ہونا چاہئے تھا ان کا علاج مصائب ورنج و غم سے بہت جلدی ہو جاتا ہے یہ بھی ایک مجاہدہ ہے کیونکہ مجاہدہ دو قسم پر ہے ایک اختیاری ایک اضطراری اختیاری مجاہدہ تو یہ ہے تقلیل الکلام کم بولنا تقلیل الاختلاط مع

الانام۔ لوگوں سے کم ملنا جلنا تقلیل المنام کم سونا تقلیل الطعام کم کھانا جس سے اس زمانہ کے لئے صرف اول کے دو جزو کافی ہیں مگر یہ مجاہدہ بعض امراض کے لئے کافی نہیں ہوتا اس کے لئے مجاہدہ اضطراری کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بدوں امداد غیبی کے قصد و اختیار سے نہی شرعی کے سبب ناممکن ہے مثلاً اگر کوئی سنکھیا کھائے یا کسی طرح اپنے کو بیمار ڈالے یا ہلاک کرے تو ناجائز ہے اس لئے وہ خدا کی طرف سے بیمار کیا جاتا ہے اس کے بیوی بچوں کو موت دیدی جاتی ہے اگر یہ خود مارے تو ناجائز ہے پس یہ رحمت ہے کہ تمہارا کام ادھر ہی سے کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہی سے نشتر دلوایا جاتا ہے اپنے ہاتھ سے کوئی نہیں دیتا اور اگر ڈاکٹر کو مشورہ دے کر نشتر نہ دو تو بس علاج ہو چکا خیر خواہ ڈاکٹر مریض کی رائے پر کبھی عمل نہیں کرتا دیکھئے بچہ کو ماں باپ پچاڑ کے چمچہ سے دوا پلاتے ہیں پھر حلق سہلاتے ہیں کہ اندر اتر جائے اور بچہ مچلتا ہے غل مچاتا ہے ہائے رے ہائے رے کرتا ہے مگر اس کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے سننے والے بھی ماں باپ کو ظالم نہیں سمجھتے بلکہ خیر خواہ سمجھتے ہیں افسوس کہ آپ کو ماں باپ پر اعتماد ہے خدا پر بھروسہ نہیں ہے وہاں آپ اپنی عقل سے حکمت دریافت کرتے ہیں اور جب سمجھ میں نہیں آتی تو یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس میں کوئی حکمت نہیں تعجب ہے صاحبو! جس طرح اور قوائے مدر کہ ہیں اسی طرح عقل بھی تو صرف ایک قوت مدر کہ ہے اور جس طرح وہ سب محدود ہیں اسی طرح عقل بھی محدود ہے مثلاً کان ایک حد تک سنتے ہیں اس کے آگے نہیں سنتے ان کے آگے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آواز نہیں ہے مثلاً یہ معلوم ہے کہ کلکتہ میں روز بارہ بجے توپ چلتی ہے اگر اس کی آواز یہاں نہ سنائی دے تو اس کا انکار نہیں ہو سکتا اسی طرح نیل گنج میں عطر کی شیشی کھلی اور یہاں خوشبو نہیں آئی تو اس کے کھلنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا اسی طرح آنکھ ایک حد تک دیکھتی ہے اس سے آگے کام نہیں کرتی مگر کیا حد نظر سے آگے کچھ ہے نہیں؟ یقیناً اس کا کوئی قائل نہیں جب ہر قوت کے لئے ایک حد ہے تو اس کلیہ کا مقتضایہ ہے کہ عقل کے ادراک کے لئے بھی ایک حد ہونا چاہیے مگر آج کل دماغوں میں بیوقوفی یہ سما گئی ہے کہ کوئی چیز عقل سے مخفی نہ رہنا چاہیے ہر چیز عقل میں آجانی چاہئے کیوں صاحب کیوں آنی چاہئے کان آنکھ کی طرح وہ بھی ایک قوت مدر کہ اور دل کی آنکھ ہے جتنی اس کی قوت اور حد ہے اسی کے موافق ادراک کرے گی اور جو اس کی حد اور طاقت سے باہر ہے اس کے ادراک سے عاجز رہے گی تم یہ سمجھتے ہو کہ جو تم نہ سمجھو وہ عقل کے خلاف ہے حالانکہ وہ عقل کے خلاف نہیں بلکہ اس کی حد سے باہر ہے اور ہے صحیح کسی مجذوب سے پوچھا گیا عقل کیا ہے کہا وہ جو خدا کو پاوے پوچھا خدا کون ہے کہا جو عقل میں نہ آوے مطلب یہ ہے کہ عقل وہ ہے جو ہمیشہ اس کی جستجو میں لگی رہے اور اس سے کبھی غافل نہ ہو گو اس کی کنہ اس کی ادراک سے فوق ہے غرض یہ بات ماننا پڑے گی کہ عقل کے لئے یہی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں چل سکتی۔ آپ روح ہی کو نہیں سمجھ سکتے کہ کیا ہے جس طرح یہ سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح احکام الہی کی بعض حکمتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں ہاں نظائر سے تسلی ہونا اور بات ہے اسی طرح

بلا میں ایک حکمت امتحان بھی ہے جو حکمت جلی ہے جس کا بیان اول ہوا ہے دو حکمتیں اور یہ ہیں ایک خفی اور ایک اخفی سو حکمت خفی تو یہ ہے کہ بیماری اور مرض سے انسان میں شکستگی اور عجز پیدا ہوتا ہے اور یہ علاج ہے غرور ناز اینٹھ مروڑ کا مثلاً جب تک کوئی نہ مرے اپنی دولت و قوت کا غرور نہیں جاتا اس سے شکستگی پیدا ہوتی ہے اور یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے یہ تو خفی حکمت تھی جس کا بیان ابھی ہوا ہے اور حکمت اخفی یہ ہے کہ یلا میں مشاہدہ ہے یہ ذرا بار یک بات ہے۔ یہ اہل اللہ کے لئے ہے عاشق کی شان یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ محبوب کا ایک عضو بھی اس سے چھپا نہ رہے عاشق کو چین نہیں آتا کہ ہاتھ اور انگلیاں تو دیکھنا چاہتی ہی ہے۔ محبوب کے دستانہ پر نظر ڈالتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مینگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست
ان سے بڑھ کر رخسارہ ہے اگر محبوب ایک چھپا لے اور ایک کھول دے تو وہ بے چین ہوگا کہ کسی طرح دونوں دیکھوں جس طرح محبوب کے دور رخسارے ہیں یہاں حق تعالیٰ کے دو شانیں ہیں ایک جلال ایک جمال۔ جمال لطف و رحمت وغیرہ ہے اور جلال وہ ہے جسے آپ سختی و قہر سمجھتے ہیں عاشق یہ چاہے گا کہ دونوں کو پہچانوں بغیر اس کے اسے صبر نہیں آتا کیونکہ ایک رخ کی معرفت تھی دوسرے کی نہ تھی یہی راز ہے آدم علیہ السلام کے جنت سے اخراج میں یعنی جب وہ جنت میں تھے انہیں صفت محسن و کریم کی بدرجہ عین الیقین معرفت تھی اور عادل و منتقم عفو و اب رحیم و رؤف کی معرفت بدرجہ علم الیقین تو تھی مگر بدرجہ عین الیقین نہ تھی حق تعالیٰ کو ان کی معرفت کو مکمل کرنا مقصود تھا اس کے لئے سامان یہ ہوا کہ ممانعت کے بعد بوسوسہ شیطان گہیوں کا دانہ کھالیا۔

گو اس کا بھی انہیں ثواب ملا کیونکہ یہ ان کی اجتہادی خطا تھی ارشاد ہوا جنت سے باہر ہو جاؤ اس وقت انہیں عادل و منتقم کی معرفت ہوئی اس کے بعد توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوئی تو ثواب کی معرفت ہوئی پھر معاف ہو گیا تو عفو کی معرفت ہوئی پھر رحمت خاصہ متوجہ ہوئی تو رؤف رحیم کی بھی معرفت ہوئی اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم علیہ السلام کی معرفت اور ان کا علم عین الیقین کے درجہ تک مکمل نہ ہوتا انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں سے ان کے معارف و کمالات بڑھائے جاتے ہیں یہی راز ہے کہ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار آیا ابن مسعودؓ سے فرمایا مجھ کہ یہ نسبت تم لوگوں کے دو گنا بخار ہوتا ہے اور اجر بھی دو گنا ہوتا ہے چونکہ ان کی معرفت کامل بلکہ اکمل عطا ہوتی ہے اس لئے ان کے لئے بیماری بھی سب سے بڑھ کر ہونی چاہئے صحت بھی اوروں سے بڑھ کر یہی شان ہے انبیاء و صلحاء کی اور اسی مشاہدہ کی بدولت انہیں بلا میں اس قدر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کو انعام میں بھی نہیں ہوتی حضرت رابعہ کے یہاں جب عرصہ تک فاقہ نہ ہوتا تو فرماتیں کہ اللہ میاں خفا معلوم ہوتے کیوں کہ بہت دن سے فاقہ نہیں ہوا جو چھیڑ چھاڑ کی دلیل ہے الغرض یہ حکمتیں تھیں جن میں بعض کا حاصل مجاہدہ تھا اور بعض کا حاصل مشاہدہ اور جو بالکل جلی یعنی کھلی ہوئی حکمت ہے وہ اس آیت میں مذکور ہے فرماتے ہیں السہم ایک نکتہ اس میں اس وقت سمجھ میں آیا

کہ اسے شروع کیا حروف مقطعات سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہمارے چند حروف کی حکمت تو معلوم نہیں بڑا دعویٰ ہے اور بڑے حکمت جاننے والے ہیں تو انہیں کی حکمت بتا دو جب حروف کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہمارے افعال کی حکمت کیا سمجھو گے یہ تعجیز کے لئے ہے آگے مقصود ارشاد فرماتے ہیں۔

دعویٰ اور دلیل

احسب الناس ان يتركوا ان يقولو آمنة کیا لوگوں کا گمان ہے کہ امنا کہنے سے چھوڑ دیئے جائیں گے وہم لا یفتنون اور امتحان نہ ہوگا۔ کیونکہ آمنة (ہم ایمان لائے) ایک دعویٰ ہے اور اس کی دلیل امتحان میں کامیابی ہے۔ ولقد فتنا الذین من قبلہم پہلے بھی ہم نے لوگوں کا امتحان لیا ہے اور اس امتحان کا ثمرہ کیا ہے۔ فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین (پ ۲۰)

کہ اللہ تعالیٰ جان لیں گے کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ لیعلمن میں ایک علمی تحقیق ہے مگر اس کی تفصیل کا وقت نہیں ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ دوسروں پر ظاہر کر دیں کون سچا ہے اور کون جھوٹا اور نہ انہیں تو سچے اور جھوٹے کا پہلے سے علم ہے۔ اس امتحان کے متعلق ایک شعر یاد آیا۔

وجائزة دعویٰ لمحبة فی الهوی ولكن لا یخفی کلام المنافق

محبت کا دعویٰ عشق میں جائز ہے لیکن منافق کی بات چھپی نہیں رہتی۔

ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نوجوان سے ایک شخص نے کہا میں تم پر عاشق ہوں۔ اس نے التفات نہ کیا جب بہت مرتبہ کہا تو ایک دن اس نے کہا اگر تم عاشق ہو تو سیر بھر چونا بے بجھا کھا لو۔ اب تو لگا سوچنے کہ چونا کھاؤنگا تو منہ اور آنتیں سب کٹ جائیں گی۔ اس کے سوچنے پر محبوب نے ایک جوتا رسید کیا کہ میں یہی عشق ہے۔ واقعی اگر عاشق ہوتا تو چونا پیش کرنے پر چوں نہ کرتا اور کھا لیتا۔ بس اس روز سے پھر عشق کا نام نہیں لیا۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ ہولیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پوچھا تم کون ہو کہا میں تم پر فریفتہ اور عاشق ہوں۔ کہا مجھ میں کیا رکھا ہے پیچھے میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے ہزار درجہ زیادہ حسین ہے یہ براہ ہوس اس کے دیکھنے کو پیچھے پلٹے جیسا کسی نے کہا ہے

وفاداری مدار از بلبلان چشم کہ ہر دم بر گلی دیگر سرانید

بلبل چشم لوگوں سے وفا کی امید نہ رکھ کیونکہ وہ ہر بار دوسرے پھول پر چڑھاتی ہے

یہ حسرت جو نہی پیچھے پلٹے اس نے ایک دھول رسید کی کہ بس یہی عشق ہے۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیان دعویٰ خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

تو اگر عاشق تھا غیر کی طرف کیوں رخ کیا غرض سچے جھوٹے مدعی امتحان کے وقت معلوم ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات

فرمایا: آیت فلما تجلی ربہ للجبل موسیٰ علیہ السلام کے لئے رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات و استدلال غلط ہے۔ کیونکہ تجلی پر بلا فصل زمانی مرتب ہے۔ کوہ جبل و صقع موسیٰ علیہ السلام۔ اور تقدم و تاخر محض ذاتی ہے تو رؤیت کس کی ہوئی۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۲۶۵)

عند الامتحان یكرم الرجل اویہان

امتحان کی حقیقت

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آ منا کے معنی عشقنا کے ہیں اور وہ اس طرح کہ اللعین امنوا اشد حبائلہ میں ایمان کے لئے محبت الہی کو لازم قرار دیا گیا ہے تو اب آ منا کے معنی عشقنا و احبنا ہوئے۔ جب تم نے آ منا کہہ کر خدا کی محبت کا دعویٰ کیا تو اس کے لئے امتحان ضروری ہوا۔ اس لئے کبھی آپ کی اولاد کو بیمار کر دیتے ہیں کبھی کسی اور عزیز کو۔

اب یہ کہنا کہ بیٹے کو بیمار کیوں کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے امتحان سے بری کیوں نہ کیا جب بری نہ ہوئے تو اب شبہ اور وسوسہ ہونے لگا ایک شبہ یہ ہے کہ خدا کو تو خبر ہے کہ کون کیسا ہے اور کون کیسا ہے۔ امتحان لینے کیا ضرورت۔ امتحان تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں حالت مخفی ہوتی ہے اس کا جواب اوپر بھی مذکور ہے کہ یہ امتحان ظہور علی الممتحن کی غرض سے نہیں لیا جاتا بلکہ ظہور علی الناس کی غرض سے لیا جاتا ہے یعنی امتحان اس لئے لیا جاتا ہے کہ اور لوگ اس کی حالت سے واقف ہو جائیں کہ سچا مسلمان ہے یا جھوٹا اور یہ اپنی حالت خود بھی جان لے اور جہل مرکب میں مبتلا نہ رہے بعض اوقات آدمی لائق سمجھا جاتا ہے اور خود بھی اپنے کو لائق سمجھتا ہے مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کچھ بھی نہ تھا۔

یہی راز ہے خدا تعالیٰ کے امتحان کا۔ پل صراط اور میزان کی بھی یہی حکمت ہے مقصود یہ ہے کہ کوئی جھگڑا بھی نہ کر سکے اور جہل مرکب میں مبتلا نہ رہے اور حجت تمام ہو جائے۔ معتزلہ نے میزان کا اسی اشکال کی بناء پر انکار کر دیا کہ خدا کو تو معلوم ہے کتنے عمل اچھے ہیں کتنے برے اور یہ نہ سمجھے کہ خدا نے اپنے علم کے لئے ایسا نہیں کیا بلکہ بندوں کی آگاہی کے لئے ایسا کیا تا کہ خدا پر کسی کو الزام رکھنے کا حق نہ رہے۔ وسوسہ کی گنجائش ہی نہ رہے ورنہ اگر کسی جگہ حجت کج بخشی اور جہل مرکب کا احتمال نہ ہو تو بدوں امتحان کے صرف اپنے علم کے موافق عمل درآمد کرنے میں بھی کچھ محذور عقلی نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے شاگردوں کا ماہواری امتحان نہیں لیتے تھے کیونکہ استعداد ہر ایک کی مستحضر تھی۔ جب موقع آتا بلا امتحان لئے نمبر بھر دیتے اور فرماتے تھے کہ مجھے سب معلوم ہے کہ کون

کیسا ہے اور کون کیسا ہے اور یہ بھی فرمادیتے تھے کہ اگر کسی کو یہ احتمال ہو کہ مجھے کم نمبر دیئے ہیں تو لاؤ امتحان لے لوں۔ مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ تھی کہ ہاں لے لیا جائے۔

امتحان سے مقصود مدعی کو خاموش کرنا ہوتا ہے

امتحان سے مدعی کی زبان بند کرنا مقصود ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ اس لئے امتحان لیتا ہے کہ لوگوں پر اور خود اس پر بھی یہ ظاہر ہو جاوے کہ محبت کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ اگر یہ اس امتحان میں فیل ہو گیا تو اسے یہ بھی نفع ہو گا کہ آگے پھر کوشش کرے گا اور کوشش کر کے اعلیٰ لیاقت پیدا کر کے پھر امتحان میں ضرور پاس ہو جاوے گا۔ تو جو کچھ بلا اور مصیبت آتی ہے واللہ سب رحمت ہے اس میں ذرا بھی حرج نہیں البتہ ایسے شخص کے لئے ضروری پریشانی ہے جس کا تعلق خدا سے ضعیف ہے ورنہ سراسر رحمت ہی رحمت ہے چونکہ اس وقت بہت سی پریشانیوں کا ہجوم ہے جن سے خیالات متزلزل ہو رہے ہیں اس لئے میں نے عمر بھر کے لئے علاج بتلا دیا۔ جو شخص اس علاج سے کام لے گا وہ تھوڑے دنوں تک صبر کرتے کرتے پھر بجائے صبر کے شکر کرنے لگے گا۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعان گفت فراق یار نہ آں مے کند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنا بتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وہم لا یفتنون۔ رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے ان کا طریقہ یہ ہے ابھموا ما ابھمہم اللہ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے اطاعت بدوں ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ اطاعت بدوں ابتلاء ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے۔

بوجہ مجاہدہ کے وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین یسر کے خلاف ہوتا اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتدا ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہی امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتدائی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہو گا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

یہی ہے کہ ابتداء سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت و دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتداء میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا ورنہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جاوے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جاوے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابطال نہیں ہے اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پنشن دیں گے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی (اشرف الجواب ص ۲۶۳ تا ۲۶۵)

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو اللہ کا وہ معین وقت ضروری آنے والا ہے اور وہ سب کچھ متناسب کچھ جانتا ہے۔

تفسیری نکات

رجا کا مفہوم

لفظ یرجوا کے دو معنی ہیں امید کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور خوف کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے دونوں تفسیروں پر جدا جدا ترجمہ ہوگا ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید ہو الخ ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کا خوف ہو کہ خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی منہ دکھانا ہوگا الخ دونوں صورتوں میں فرماتے ہیں وہ میعاد ضرور آنے والی ہے ظاہر میں فان اجل اللہ لات (سو اللہ تعالیٰ کا وہ وقت معین ضروری آنے والا ہے) جزا من کی معلوم ہوتی ہے مگر واقع میں جزا نہیں حقیقت میں جزا مقدر ہے اور یہ جملہ اس کے قائم

مقام ہے جزایہ ہے فلیتھنیالہ ولیستعدلہ پس چاہیے کہ اس کے لئے تیاری کرے اور مستعد ہو جائے (حاصل یہ ہوا کہ جو شخص خدا سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو اس کی تیاری کرے کیونکہ وہ پیشی کا دن ضرور آنے والا ہے علیٰ ہذا جس کو خدا کا خوف ہو اس کو بھی تیاری لازم ہے اور وہ تیاری یہ ہے کہ اس کے لئے عمل کرے جیسا کہ دوسری نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے من اراد الاخرة و سعى لها سعيها۔ جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہے ویسی ہی سعی بھی کرے گا۔ اب حاصل یہ ہوا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید یا خوف ہو وہ عمل کے لئے مستعد ہو جائے یہ تو ترجمہ ہوا اب سمجھئے کہ وہ طریقہ عمل کے آسان کرنے کا کیا بتلایا گیا ہے وہ طریقہ صرف لفظ یرجو میں بیان کیا گیا ہے یعنی عمل کے لئے مستعد اور تیار ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں امید و اشتیاق اور خوف خدا پیدا کرے پس وہ طریقہ امید اور خوف یہ ہے کہ اپنے دل میں امید و اشتیاق اور خوف خدا پیدا کرے پس وہ طریقہ امید اور خوف ہے یا یوں کہئے کہ ترغیب و ترہیب ہے یا وعدہ اور وعید ہے جب دل میں رغبت اور شوق ہوگا تو خواہ مخواہ اس کے حاصل کرنے کا سامان کرے گا اسے امید یا جب خوف ہوگا تو اس کے لئے مستعد ہونا چاہے گا بلکہ دین ہی کی کیا تخصیص ہے یوں کہے کہ ہر کام اور ہر عمل میں یہی دو طریق کارآمد ہو سکتے ہیں خوف یا رغبت ان دونوں کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا نہ دنیا کا نہ دین کا اسی لئے مشہور ہے دنیا با امید قائم ہے میرے نزدیک یوں کہنا چاہیے تھا دنیا با امید و بیم قائم مگر شاید جس طرح عربی میں لفظ رجا خوف اور امید دونوں کے واسطے مستعمل ہے فارسی میں بھی امید کا لفظ دونوں کے واسطے مستعمل ہو اس لئے مشہور مثل میں صرف امید کے لفظ پر اکتفا کیا یا یہ وجہ ہو کہ زیادہ کام امید سے ہوتے ہیں اس لئے اسی کا ذکر کیا کہ جو نیک کام کرنے میں بھی یہ دونوں نافع ہیں اور عمل بد کے چھوڑنے میں بھی اس لئے کہ جب رغبت اور خوف جس کسی کے دل میں ہوں گے تو رغبت کی وجہ سے اعمال صالحہ کو بجالائے گا کیونکہ رغبت کی وجہ سے ان کے ثواب پر نظر ہوگی خدا تعالیٰ کی رضا قرب کی طلب ہوگی اور چونکہ اس کے دل میں خوف بھی ہے اس لئے اعمال صالحہ کے چھوڑنے پر وعید ہے اس پر نظر کر کے ان کے چھوڑنے سے رکے گا غرض کہ رغبت کو اعمال صالحہ کے فعل میں دخل ہے اور خوف کو ان کے معاصی سے بچنے میں دخل ہے اسی طرح معصیت میں مطلوب یہ ہے کہ اس کو ترک کیا جائے اور معاصی کے ترک پر ثواب و رضا قرب کا وعدہ ہے تو رغبت کی وجہ سے معاصی کو ترک کرے گا اور خوف کی وجہ سے ان کے فعل سے رکے گا کیونکہ گناہوں کے ارتکاب پر عذاب کی وعید ہے اس طرح سے یہ رغبت اور خوف دونوں مل کر انسان کو طاعات میں مشغول اور معاصی سے متنفر بنادیں گے اور یہ دونوں مستقل طریقے ہیں ان میں سے اگر ایک بھی حاصل ہو جائے وہ بھی اتباع احکام کے لئے کافی ہو جائے گا کیونکہ اگر صرف خوف ہی ہو اور رغبت نہ ہو تو جب بھی گناہوں سے بچے گا اور طاعات کو ترک نہ کرے گا کیونکہ ان دونوں میں گناہ کا اندیشہ ہے اور اگر صرف رغبت ہی ہو جب بھی طاعات کو بجالائے گا اور گناہوں کو چھوڑ دے گا کیونکہ ان دونوں میں ثواب کا وعدہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ طاعات کے بجالانے اور معاصی کے چھوڑنے میں ان دونوں میں سے ہر واحد کو دخل ہے۔

رجاء وامکان

من كان يرجو لقاء الله فان اجل الله لات وهو السميع العليم یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال و احوال کو) خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذا سے گھبراتے تھے تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش سے پرکھ چکے ہیں اس کے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بچ کر بھاگ جائیں گے سوان کی یہ تجویز بہت بے ہودہ ہے اس جملہ معترضہ میں کفار کی تنبیہ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کر دی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں چند روزہ ہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اس وقت سارا غم غلط ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور کاموں کو جانتے ہیں اس وقت ان کی طاعات قبولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دیکر ان کو خوش کریں گے) اس آیت میں رجاء سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جس کی وجہ سے اعتقاد کو بعنوان رجاء بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت مکی ہے جس کے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد نہ تھے منکر تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجاء وامکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔

ہم اس کو بتلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں

شک نہ کرنا چاہیے۔

صفات خداوندی

وهو السميع العليم یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایمان کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایمان کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تا کہ بندوں کو اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں۔ یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو صحیح عقائد سے مؤخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو عقائد ہی سے ہو جاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے ومن جاهد فانما يجاهد لنفسه ان الله لغنى عن العلمين یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے

محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اس کو کسی کی محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول عقائد کا ذکر فرمایا پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولیٰ کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ ہیں موثر ضرور ہیں مگر وہ تاثیر بلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہو جاتی ہے اس لئے مجاہدہ کے توسط بین العقائد والاعمال ظاہر کرنے کے لئے یہ ترتیب اختیار کی گئی۔

نصیحت ناصح

اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اس واسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی ہے اسی لئے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیے ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ شاگرد اگر نہ ہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کے پستان چوستا ہے تو دودھ اتر آتا ہے اگر بچہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کے پستان خشک ہو جائیں گے اسی جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ کا رخا نہ خداوندی میں بڑا اندھیر ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان نیا و نگر کا راج ہو اسو یہ کلمہ اس موقع پر تو بہت سخت ہے اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اس لئے بیان کر دیئے تاکہ کوئی آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نہ کرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی میں استعمال کیا گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں یہی معنی ہیں دوسرے یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال کے متعلق ہے والذین آمنوا و عملوا الصالحات لنکفرن عنہم سیناتہم ولنجزینہم احسن الذی کانوا یعملون یہاں ایمان کا مکرر ذکر اس لئے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدوں ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزاء حسن دیں گے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بحمد اللہ حاصل ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدوں مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۷﴾

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزاء حسن دیں گے۔

تفسیری نکات

عمل بغیر ایمان کے مقبول نہیں

لہذا واضح ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدوں مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا۔

یہاں ایمان کا مکرر ذکر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدوں ایمان مقبول نہیں۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ

وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم

مِّن نَّصِيرِينَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: اور ابراہیم نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے پس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت میں تم میں ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو جائیگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

تفسیری نکات

کفر و شرک پر اتفاق نا اتفاقی سے بدتر ہے

دیکھئے مودۃ بینکم سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں میں اتفاق تھا مگر انجام اس کا دیکھئے کیا ہے کہ وہاں پر ایک کو

دوسرے کی طرف سے لعنت اور پھٹکار ہوگی۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام نے ان میں نا اتفاقی ڈالنے کی کوشش کی تھی کیا مصلحان قوم کے پاس اس کا کچھ جواب ہے؟ اصول جدیدہ کے موافق تو کامل اتفاق چوروں اور ڈاکوؤں میں ہے یا اور جو بد معاش طائفے ہیں کہ جان مال دین آبرو گنوا کے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں لیکن آج تک کسی مصلح نے نہ تو کسی چور کو انعام دیا نہ کسی ڈاکو کو اتفاق کی وجہ سے رہا کیا۔ ہمارے مصلحان قوم کو ضرورت ہے کہ وہ اتفاق کی تقسیم کریں اور ایک قسم کی تو رغبت دلا دیں اور دوسری قسم کے قلوب میں نفرت بٹھا دیں۔ جس اتفاق سے اصلاح ہوتی ہے وہی اتفاق ہے جس میں باطل کو حق کے تابع کیا جائے۔ ورنہ وہ اتفاق نا انصافی سے بھی زیادہ برا ہو جائے گا۔

اٰتِلْ مَا اَوْحٰی اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: جو کتاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی گئی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے پڑھا کیجئے اور نماز کی پابندی کیجئے بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے۔

تفسیری نکات

شب قدر میں معمولات سلف

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آج ستائیسویں شب ہے اس کو شب قدر کہتے ہیں اس میں کیا پڑھنا چاہئے فرمایا کہ ایسے موقع پر سلف میں تین چیزیں معمول تھیں اب لوگوں نے دو کو حذف کر کے ایک پر اکتفا کر لیا ہے وہ تین چیزیں یہ تھیں ذکر تلاوت قرآن نفل نماز اس میں سے عابدین نے نفل نماز اور تلاوت قرآن کو حذف کر دیا۔ یعنی اس میں مشغولی بہت ہی کم ہے بس زیادہ تر ضربیں ہی لگاتے ہیں اور اتفاق سے مجھ کو یہ تینوں چیزیں ایک آیت میں جمع مل گئی ہیں۔

نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے سے روکتی ہے

ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنکر کی ایک تفسیر ابھی سمجھ میں آئی۔ مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ نماز مسلمان کو برے کام سے روک دیتی ہے۔ اس پر ظاہر میں اشکال پڑتا ہے کہ ہم تو بہت نمازیوں کو برے کام کرتے دیکھتے ہیں اور اس کا جواب دیا گیا ہے کہ نماز سے برے کام ضرور کم ہو جاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی نماز

کامل ہے۔ خشوع، خضوع و جملہ آداب کے ساتھ ہے تب تو یہ شخص بالکل برے کاموں سے محفوظ ہو جائے گا اور اگر اس کی نماز ناقص ہے تو جیسی نماز ہے اسی کے مناسب برے کام چھوڑ جائیں گے۔ غرض جس درجہ کی نماز ہو گی اس درجہ کی نہی عن الفحشاء ہوگی تجربہ کر لیا جائے۔ کہ دو جماعتوں کا امتحان کر کے دیکھو۔ ایک وہ جو بالکل بے نمازی ہے دوسرے وہ جو نمازی ہو (گو ان کی نماز کسی درجہ کی ہو) یقیناً نمازی جماعت کے اندر برے کام کم ہوں گے اور بے نمازیوں میں ان کی نسبت زیادہ ہوں گے تو مشہور تفسیر پر اشکال واقع ہوتا تھا جس کا جواب دینے کی ضرورت ہوگی مگر جو تفسیر اس وقت القاء ہوئی ہے اس پر کوئی اشکال نہیں پڑتا وہ یہ کہ نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے اور اس کے بھٹکانے سے روک دیتی ہے اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اذان سے شیطان گوز مارتا ہو اور بھاگ جاتا ہے اور اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ چنانچہ مندر کے پاس اذان دینے سے وہ لوگ روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اذان کی آواز سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں پس جبکہ کفار کے دیوتا اذان سے بھاگ جاتے ہیں تو جس گاؤں میں اذان ہوگی وہاں کفار بھی نہ آسکیں گے اور اگر آویں گے بھی تو ان کے حوصلے پست ہو جاویں گے۔ پس یہ تفسیر اس آیت کی بہت عمدہ ہے اور واقعی اس پر کوئی بھی اشکال نہیں چنانچہ اس وقت جو لوگ بھی دشمنوں کے بہکانے سے مرتد ہوئے ہیں یہ وہی ہیں جن کو نماز سے کچھ علاقہ نہ تھا اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ فتنہ ارتداد سے بچنے کے لئے خود بھی نماز کی پابندی شروع کریں اور دیہات میں بھی مسلمانوں کو نمازی بنانے کی کوشش کریں (ایضاً ص ۲۸)

ایک عجیب تفسیری نکتہ

ایک مجلس میں اس کا نکتہ بیان کیا کہ پارہ اکیس کی پہلی آیت میں تلاوت اور صلوٰۃ کو تو بصیغہ امر فرمایا اور ان کی کوئی فضیلت نہیں بیان فرمائی اور ذکر کو بعنوان فضیلت ذکر فرمایا۔ اور اس کا امر نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ تلاوت اور صلوٰۃ تو فرض ہے۔ گواتنا فرق ہے کہ صلوٰۃ فرض عین ہے اور تلاوت قرآن فرض کفایہ کیونکہ اصل فرض قرآن شریف کا محفوظ کر لینا ہے جو مجموعہ امت پر فرض ہے اور وہ موقوف ہے تلاوت پر اس لئے وہ بھی اسی طرح فرض ہوگی اور بعد ضرورت ظاہر ہونے کے بیان فضیلت کی ضرورت نہیں۔ اس کے ابقاء کے لئے بیان ضرورت ہی کافی ہے بخلاف ذکر کے کہ ماسوائے قرآن اور اذکار صلوٰۃ کے اور بقیہ اذکار بالمعنی التبادر للذکر فرض نہیں اس لئے صیغہ امر کا تو فرمایا نہیں۔ لیکن فضائل اس لئے بیان کئے کہ غیر ضروری ہونے پر نظر کرنا سبب ترک نہ ہو جاوے۔ کیونکہ استماع فضائل سبب ہو جائے گا فعل کا۔

اللہ کا بتلایا ہوا راستہ

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اتل ما اوحی الیک من الکتب واقم الصلوٰۃ جو آپ کی طرف وحی کی

جاتی ہے اس کو پڑھئے اور نماز کی پابندی کیجئے۔

کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے۔ تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور ہذا صراطی مستقیم میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچانے والا ہو گا وہ مستقیم ہی ہو گا اس لئے مستقیم فرمایا اور مستقیم کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے۔ نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم راستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے۔

نماز کی روح

بیان یہ ہو رہا تھا کہ ذکر نماز کی روح ہے درمیان میں ایک کام کی بات بھی بیان کر دی اور چونکہ ذکر نماز کی روح ہے اسی واسطے نماز کی فضیلت کے موکد کرنے کے لئے فرماتے ہیں ولذکر اللہ اکبر کہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔ اس لئے نماز میں اگر یہ خاصیت ہو کہ تنہی عن الفحشاء تو تعجب کی بات نہیں بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ذکر بڑھ کر ہے یعنی نماز سے بھی پس ذکر ہی کر لیا کریں نماز نہ پڑھیں۔

اس کا ایک لطیف جواب میرے عرض سابق سے نکل آیا یعنی ولذکر اللہ اکبر کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر اللہ نماز سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ علت ہے ماقبل کی پہلے نماز کی ایک خوبی بیان کی ہے اب آگے اس کی علت بتلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز کی یہ خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے مگر یہ خاصیت اس کی کیوں ہوئی اس لئے ہوئی کہ ولذکر اللہ اکبر کہ (اس کی روح سے ذکر اللہ اور) اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور ہر پہلو سے مفید ہے طبع سے عقل سے عشق سے۔

ذکر اللہ کی ضرورت

میں نے جس حصہ آیت کی تلاوت کی ہے اس میں دو جملے میں ایک مقصود بالبیان صرف پہلا جملہ ہے دوسرے کو برکت کے لئے پڑھ دیا۔ مقصود ولذکر اللہ اکبر کا بیان کرنا ہے سامعین غالباً اس کی تلاوت ہی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود ذکر اللہ کے متعلق کچھ کہنا ہے اور شاید مجتادریہ ہوا ہو میں ذکر اللہ کی فضیلت بیان کروں گا کیونکہ آج کل واعظین زیادہ تر اعمال کے فضائل ہی بیان کرتے ہیں مگر مجھے فضیلت کا بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ آج کل فضائل اعمال سے تو اکثر لوگ واقف ہیں البتہ ان کی ضرورت سے غافل ہیں گو وہ شعائر دین ہی سے کیوں نہ ہوں اور جو اعمال شعائر دین سے نہ ہوں ان کی ضرورت سے تو بہت سے اہل علم بھی غافل ہیں حالانکہ بعض اعمال گو شعائر دین سے نہ ہوں مگر شعائر دین کی اصل اور جڑ ہیں اس لئے ضرورت میں

وہ شعائر سے کم نہیں مگر عام طور پر ان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا چنانچہ بہت لوگ پھلوں سے تو واقف ہیں اور باغ میں جا کر پھلوں اور پتوں کو دیکھتے بھی ہیں مگر جڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا نہ کسی کا ان کی طرف خیال جاتا ہے کیونکہ جڑوں کے ساتھ پھلوں اور پتوں کا تعلق نظری ہو گیا ہے بوجہ اس تعلق کے مستور ہونے کے۔ تو جیسا حیات میں جڑوں کی طرف توجہ کم ہے اسی طرح شریعات میں ہماری بعینہ یہی حالت ہے کہ جڑ سے غافل ہے محض فروغ پر نظر ہے اسی لئے فضائل اعمال پر سب کی نظر ہے ضرورت پر بہت کم نظر ہے اور اس میں زیادہ خطا عوام کی نہیں بلکہ خطا ہماری ہے کہ ہم تعلیم کرنے والے بھی زیادہ تر فضائل ہی کو بیان کرتے ہیں ضرورت کو بیان نہیں کرتے اور یہ بڑی کوتاہی ہے میں ضرورت کو بیان کروں گا ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے مگر اس کے علاوہ ذکر اللہ ضرورت کی وجہ سے بھی بڑی چیز ہے اس طرح سے فی نفسہ ضروری ہے اور دیگر ضرورت کی بھی جڑ ہے گو یہ شعائر دین سے نہ ہو مگر حقیقت میں یہ شعائر کی بھی جڑ ہے شعائر دین وہ اعمال ہیں جو اسلام کی کھلی علامات ہیں جن سے دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان اعمال کا بجالانے والا مسلمان ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جو چیز کھلی علامت نہ ہو وہ ضروری بھی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک عمل شعائر میں سے نہ ہو لیکن شعائر کی بھی جڑ ہو حیات میں اس کی مثال بال کمافی ہے کہ ظاہر میں وہ گھڑی کا بڑا پرزہ نہیں چھوٹا سا پرزہ ہے جس کو دیکھ کر ناواقف شاید یہ سمجھے کہ معمولی چیز ہے مگر درحقیقت پرزے اسی وقت کارآمد ہیں جب بال کمافی درست ہو ورنہ سب بیکار ہیں یعنی گھڑی جو مقصود ہے دو بدوں اس کے حاصل نہیں ہو سکتا گو اس کی خوبصورتی میں کمی نہ آئے جیب میں رکھنے سے دیکھنے والے بھی سمجھیں گے کہ آپ کے پاس گھڑی ہے اسی طرح ذکر کو سمجھئے کہ گو خود نماز روزہ کے درجہ میں شعائر سے نہیں مگر تمام شعائر کی جڑ اور بنیاد ہے شعائر کی حقیقت تو یہ ہے کہ شریعت کو بعض انتظامات بھی مقصود ہیں اس لئے شریعت نے بعض اعمال کو مصلحت انتظام سے اسلام کی علامات قرار دیدیا ہے جس نے لوگوں کو دوسرے کے اسلام کا علم ہو جائے اور احکام اسلام کا اس پر اجراء کیا جائے یہ علامات ہیں اور یہ ضرورت دین سے ہیں یعنی جن کا جزو دین ہونا خاص و عام ہر کسی کو معلوم ہے ضروریات کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی شخص ضروریات کا منکر ہو خواہ وہ انکار تاویل سے ہو یا بدوں تاویل کے وہ کافر ہے اور اس کا یہ عذر بھی نہ سنا جاوے گا کہ مجھ کو علم نہ تھا بخلاف شعائر کے مثلاً کوئی مسائل رہن وغیرہ کا انکار کرے وہ علی الاطلاق کافر نہ ہوگا بلکہ اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ اگر آیت قرآنیہ سننے کے بعد انکار کرے تو کافر ہوگا ورنہ نہیں کیونکہ مسئلہ رہن کا جزو دین ہونا بالمعنی المذکور ضروریات میں سے نہیں اور نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ جزو دین ضروریات سے ہے ان کا انکار مطلقاً کفر ہے یہاں یہ عذر بھی مسموع نہ ہوگا کہ اس کے جزو دین ہونے کا علم نہ تھا گو عند اللہ معذور ہو (اگر واقعی اس کو علم نہ تھا) مگر یہ عذر قفأ مسموع نہ ہوگا حاکم اسلام اس پر کفر کا حکم لگا کر بینونت زوجہ وغیرہ کا حکم جاری کر دے گا ان یکون قد اسلم فی دار الحرب ثم ہاجر فانکارہ قبل الہجرة لایکون کفراً عذرہ فی عدم العلم ۱۲ غرض حکمت انتظام و اجراء احکام کی

وجہ سے بعض اعمال کو شعائر میں سے قرار دیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شعائر نہ ہوں وہ ضروری نہیں ان میں ایک تصدیق بالقلب ہی ہے گو یہ شعائر اصطلاحیہ میں سے نہیں دیا گیا ہاں اقرار باللسان شعائر میں ہے مگر کیا تصدیق ضروری بھی نہیں یہ عجیب مثال اس وقت ذہن میں آئی جس سے دعویٰ بخوبی ثابت ہو گیا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شعائر میں سے نہ ہو وہ ضروری نہ ہو کیونکہ ایمان و اسلام کے لئے تصدیق بالقلب کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے مگر اس کو شعائر میں اس لئے شمار نہیں کیا گیا کہ شعائر سے جو مقصود ہے یعنی ظہور ایمان و اجراء احکام وہ اس سے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ تصدیق قلبی کی کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی مگر ضروری ہے کہ تمام اعمال کی جڑ ہے بلکہ ایمان و اسلام کا مدار حقیقی اسی پر ہے بدوں تصدیق بالقلب کے عبد اللہ کوئی شخص مسلمان نہیں گو ظاہر میں اس کو مسلمان کہا جاتا ہو پس یہ ہم لوگوں کی کوتاہی ہے کہ ہم نے ضرورت کو صرف شعائر تک محدود کر رکھا ہے اور جو اعمال شعائر میں سے نہ ہوں ان کو ضروری نہیں سمجھتے تصدیق کی مثال نے اس غلطی کو اچھی طرح واضح کر دیا اور بتلادیا کہ جو اعمال شعائر دین سے شمار کئے گئے ہیں ان کو شعائر اسلام صرف اس لئے قرار دیا ہے کہ لوگوں کو ان کے ذریعہ سے ایک دوسرے کا اسلام بے سہولت معلوم ہو جاتا ہے اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شعائر نہیں وہ غیر ضروری ہیں سخت غلطی ہے پس ولذکر اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ ذکر اللہ اس جہ سے بھی اکبر ہے کہ فضل ہے اور اس واسطے بھی اکبر ہے کہ وہ تمام فضائل کی جڑ ہے نیز تمام اوامر و نواہی کے امتثال و اجتناب کی بھی جڑ ہے اور اکبر میں دو احتمال ہیں یا تو مقطوع عن الاضافۃ ہو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر اللہ فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یا مفضل علیہ کی طرف اضافت ملحوظ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تمام اعمال سے اکبر ہے یہ تو آیت کی توجیہ تھی اب اس کی ضرورت کو سنئے جس سے بہت لوگ غافل ہیں اول تو لوگوں کو آج دین کا اہتمام ہی کم ہے اور جن کو ہے بھی تو وہ نماز فرض اور نوافل و مستحبات کا تو اہتمام کرتے ہیں مگر ذکر اللہ سے غافل ہیں یہاں شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب تم کو یہ تسلیم ہے کہ لوگوں کو مستحبات کا اہتمام ہے اور مستحبات میں تلاوت قرآن بھی داخل ہے اور تلاوت قرآن کا بہت لوگوں کو اہتمام بھی ہے پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوا کہ ذکر اللہ کا اہتمام نہیں کیونکہ تلاوت قرآن تو ذکر اللہ کی بڑی فرد ہے اس کا جواب یہ ہے کہ میری مراد ذکر حقیقی ہے اور وہی اکبر کا مصداق ہے اس کا اہتمام بہت کم ہے رہی تلاوت قرآن تو وہ ذکر کی ایک صورت ہے اس کے اہتمام سے یہ لازم نہیں آیا کہ ذکر حقیقی کا بھی اہتمام ہے کیونکہ یہ ممکن ہے۔

ذکر اللہ ہی اصل مقصود ہے

فرمایا۔ سالک کو کسی چیز کی ہوس نہ چاہیے کوئی ذوق شوق کا متمنی ہے۔ کوئی رقت قلب کی خواہش کرتا ہے کسی کو کشف و کرامت کی تمنا ہے۔ کوئی جنت کو مقصود سمجھ کر اس کا طالب ہے حالانکہ کسی چیز کی بھی طلب و ہوس نہ کرنا چاہیے کیونکہ عبد کے معنی ہیں مالک کے سامنے سر جھکا دینے کے اور جو حکم ہوا اس پر بہ سر و چشم قبول کر کے

عمل کر لینے کے۔ پھر عبد ہو کر کسی چیز کی ہوس کرنا کہ مجھے یہ ملے وہ ملے۔ یہ ہوس حقیقت میں فرمائش ہے مالک پر اور یہ کیونکر جائز ہوگا اگر کوئی شبہ کرے کہ حدیث شریف میں آیا ہے اللہم انی اسئلك رضاك والجنة یہاں پر جنت کا سوال کیا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سوال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوال کرے کہ فلاں صاحب سے کہاں ملاقات ہوگی۔ اس پر وہ شخص باغ میں جانے کا آرزو مند ہے تو حقیقت میں وہ باغ مقصود بالذات نہ ہوگا۔ بلکہ مقصود وہ صاحب ہیں مگر چونکہ وہ باغ میں ملیں گے اس لئے اس کی تمنا ہوتی ہے جو اس مقام پر رہتے ہیں۔ اسی طرح حدیث شریف میں مقصود رضا ہے جس کو جنت پر مقدم فرمایا ہے۔ مگر چونکہ اس کا حصول جنت میں ہوگا۔ لہذا جنت کا بھی سوال کیا گیا حق سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں و رضوان من اللہ اکبر یہاں پر رضا کو جنت سے اکبر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑی چیز یہی ہے۔ پھر یہ نکتہ بیان کیا کہ اس اکبر کی تحصیل کے لئے ذریعہ بھی اکبر ہونا چاہیے سو فرماتے ہیں ول ذکر اللہ اکبر معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ذکر اللہ ہے تمام احکام پر عمل کرنے سے۔ ذکر اللہ ہی مقصود ہے۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

ترجمہ: بلکہ یہ کتاب بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔

تفسیری نکات

آیات بینات

اس میں ہو کی ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع ہے یعنی قرآن مجید آیات بینات ہیں باوجود یہ کہ قرآن ایک چیز ہے مگر خبر میں فرمایا آیات بینات یعنی بہت سی نشانیاں ہیں۔ پس جمع کے صیغے سے تعبیر فرمانا یا تو اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید مشتمل ہے بہت سی آیتوں کو اور یا اس لئے کہ وہ بہت سے معجزوں کو مشتمل ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اسے حفظ کر لیتے ہیں تو اس واسطے آیات بینات فرمایا کہ کئی نشانیاں ہیں اور ہیں کہا فی صدور الذین اوتوا العلم ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے چونکہ علم کے دو مرتبے ہیں علم الفاظ علم معانی اسی لئے اس کی بھی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر پر علماء مراد ہیں دوسری تفسیر پر حفاظ تو میں اس وقت وہ تفسیر کرتا ہوں جس میں حفاظ کی مدح ہے کہ انہیں الذین اوتوا العلم (وہ لوگ ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے) کے لقب سے یاد فرمایا ہے تو اس میں اس تفسیر کے موافق اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں اہل علم فرمایا ہے۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهُوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ
لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور دنیوی زندگی فی نفسہ بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔

تفسیری نکات

حقیقت دنیا

آیت میں دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر کیا گیا و ما هذه الحياة الدنيا الا هو و لعب (دنیوی زندگی محض لہو و لعب ہے) گویا دنیا کی حقیقت کو واضح کر دیا صرف دو چیزوں میں ایک لہو اور دوسرا لعب کہ دنیا بجز اس کے اور کچھ نہیں یہاں پر دو لفظوں کا استعمال کیا گیا ایک لہو دوسرا لعب اگرچہ یہ دونوں لفظ بظاہر بالکل مرادف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتہً ان میں قدر تفاوت ہے لعب کہتے ہیں کسی لغو و عبث فعل کو اور لہو کہتے ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات کو حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت عبث ہونے کی جو موجب غفلت ہونے کی اول کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو لیکن اس پر ایک شبہ پڑتا ہے دنیا جمیع اجزائہا لغو و عبث ہوگئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جائے گی حالانکہ خداوند تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرے جو فضول ہو سخت گستاخی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا جرم ہے علاوہ ازیں خود دوسرے ارشاد ہوتا ہے اف حسبکم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون۔ کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے) یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور لغو محض پیدا کیا ہے نیز ایک آیت میں ارشاد ہے ربنا ما خلقت هذا باطلاً (اے ہمارے رب تو نے بیکار پیدا نہیں کیا) جواب شبہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شے مخلوقات میں سے عبث اور بے کار نہیں البتہ تعین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ دنیا سے قابل قدر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں انسان ان کے منافع اور ضروریات کو پورا کرتا ہے یہ سب کچھ دنیا کے منافع میں داخل ہیں لیکن ہم لوگوں نے ان جمیع منافع میں سے بعض منافع کو جو کہ واقعی منافع تھے نظر انداز کر دیا اور دنیا کے منافع کا انحصار صرف ان منافع کے اندر کر دیا جو کہ حظ نفسانی سے لبریز ہوتے ہیں اگرچہ منافع سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم بداہتہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ مند ہے۔ آرام پاتا ہے لیکن ان کی

وجہ سے وہ حظ وافر جو نفع اور قابل قدر فائدہ تھا ہم بھول جاتے ہیں اور اس نسیان کے باعث صرف یہی فوائد بنتے ہیں جو چند روز ہم کو حظ نفس کا مزہ چکھا دیتے ہیں اور مقصود اصلی اور اس المنفعت کو چھڑا دیتے ہیں لذتوں اور دلچسپیوں کو ہی فائدہ اور نفع قرار دے لینا اور انہیں پر قناعت کر لینا مثال تو بعینہ اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک دور دراز ریل کا سفر کر رہا ہے اور راستہ میں کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہوئی سنے اور وہاں جا کر کھڑا ہو جائے اور اس گھنٹی کو مزے لے لے کر سنتا اور بجاتا رہے اور اس طرف گاڑی چھوٹنے والی ہو انجن نے سیٹی دیدی ہو اور جب اسے کہا جائے کہ ارے ظالم گاڑی چھوٹنے والی ہے انجن نے سیٹی دیدی ہے تو وہ یہ کہے کہ مجھ کو تو اس کی ٹن ٹن میں مزہ آ رہا ہے میں تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا چاہے گاڑی چلی جائے تو جس طرح اس شخص کو اس گھنٹی کی آواز اور لذت نے ایسا مست کر دیا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی سفر کھوٹا ہوا اسی طرح اگر آپ بھی ان لذات دنیوی اور دلچسپ کی دلچسپیوں میں پڑے رہیں گے تو آپ کا بھی انجام یہی ہوگا کہ مقصود اصلی سے محروم ہو کر کوئی حظ وافر حاصل کر سکیں گے تو دیکھئے گو آرام پہنچنا اور ان میں ہونا یہ بھی منافع کی فہرست میں داخل ہے لیکن پھر وہ کس قدر مضرت رساں نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک ضروری اور قابل قدر منفعت سے غافل کر دیا اسی طرح دنیا کی ہر چیز فی نفسہ حکم و مصالح و منافع سے لبریز ہے عبث و فضول کوئی نہیں مگر جب وہ مقصود اصلی سے مانع ہو جائے تو اس وقت یہی فائدہ جن کو ہم نے منافع دنیویہ کا اصل اصول سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں لہو و لعب سے تعبیر کیا جاوے گا یعنی جس صورت سے تم دنیا کے ساتھ انتفاع رکھتے ہو اس صورت میں وہ تمہارے لئے لہو و لعب سے زیادہ نہیں گو فی نفسہ اس میں بہت مصالح و منافع ہیں مگر وہ منافع ایسے نہیں جن میں پڑ کر منافع آخرت کو بھلا دیں جن منافع کے لئے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں ان کے اعتبار سے اس سے عبثیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوانے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں ان کے اعتبار سے اس کو لہو و لعب فرمایا ہے بہر حال یہ دنیا اگر بہت سے اغراض کا سبب بن جاوے تو یہ لغو عبث ہے چنانچہ مقابلہ میں اس کے فرماتے ہیں کہ ان الدار الاخرة لھما الحيوان (اصلی زندگی آخرت ہے) اس طرف تو دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر فرمایا اور اس طرف دار آخرت کو حیوان سے تعبیر کیا کیونکہ لہو و لعب باعتبار اپنے ثمرات کے مثل مردہ ہیں اور موت ثمرات دلیل ہے موت دنیا کی بخلاف دار آخرت کے کہ اس کو حیوان بمعنی حیوة مراد زندہ سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے ثمرات زندہ اور باقی رہنے والے ہیں اور حیات ثمرات دلیل ہے حیات آخرت کی لہذا آخرت خود بھی زندہ ہے باقی فوائد دنیویہ دراصل فانی و مردہ ہی ہیں زندہ فوائد کو چھوڑ کر مردہ فوائد کو کیا کریں کارآمد چیز کو چھوڑ کر بیکار شے کے پیچھے جانا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے چنانچہ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ لو کانوا یعلمون کاش کہ یہ لوگ اپنی دینی منفعتوں کا احساس کرتے اور دنیوی مضرتوں کو جان لیتے سمجھتے کہ یہ دنیا اور اس کے لواحق سخت مضرت رساں ہیں اور آخرت اور اس کے متعلقات

نفع رساں اور راحت بخش ہیں یہاں پر استعمال کیا گیا ہے حرف لو کا جو کہ ان کے واسطے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں تو اس سے انتہا درجہ کی شفقت و رحمت مترشح ہوتی ہے کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچے سے پیار کی باتیں کرتا ہے اور محبت میں اگر بچے کے ساتھ خود بھی تو تلا بن جاتا ہے بلاشبہ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ذات سے کسی امر کی تمنا کرنا بالکل مستبعد اور ان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آرزو ہمیشہ ایسی چیز کی کی جایا کرتی ہے جو حاصل نہ ہو اور خود اس کے نفع کا محتاج ہو اور خداوند تعالیٰ قادر قیوم اور مالک کل شئی ہے اس کے واسطے کوئی شے ایسی نہیں جو حاصل نہ ہو دوسرے وہ نفع کا محتاج نہیں پھر آرزو کیسے کرتے لیکن باوجود اسکے محض اپنے بندوں کی دلہی کی خاطر ان کے مذاق کے موافق ان سے معاملہ فرمایا جس سے غرض و مقصود محض تقریب اور تفہیم ہے اور اس تفہیم کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ دوسرے یہ کہ خیر ہم ہی تمہارے موافق ہو جائیں کیونکہ تم میں اتنی قابلیت و استعداد نہیں کہ تم ہمارے موافق ہو یا ہم سے قریب ہو سکو لہذا چلو ہم ہی تمہاری خاطر تمہارے موافق ہو جاتے ہیں جن مواقع پر قرآن شریف میں الفاظ تمنی و ترجی مستعمل ہیں ان سے تمنی ترجی حقیقی مراد نہیں ہوتی۔

دنیا کے مذموم

پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فردیہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرمادی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی دار آخرت کو ذکر کر دیا کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس مذمت کر دیا جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے یہی دوسرا طریقہ جو اسلم و احسن ہے یہاں اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا و ما هذه الحیوة الدنیا الا لہو و لعب کہ نہیں ہے حیوة دنیا مگر لہو و لعب فضول و بیکار ہے۔ دیکھئے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ حیات دنیا کی مذمت کر دیں آگے فرماتے ہیں وان الدار الاخرة لہی الحیوان اور بیشک دار آخرت ہی حیات ہے یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے دنیا کی کیا زندگی یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے جس کا مریض دائم المرض ہے جس کو آج کل کے جاہلانہ دائم المریض کہتے ہیں۔

غرض دنیا وہ مذموم ہے جو غفلت میں ڈال دے۔

چست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ و فرزن

یعنی دنیا کے کہتے ہی خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال دولت اور بیوی کو ایسی ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں۔

اہل دنیا چہ کہیں وچہ مہیں لغتہ اللہ علیہم اجمعین

(دنیا دار خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت یہاں پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کر دی جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے ایک حدیث کا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الدنیا ملعون و ملعون مافیہا الا ذکر اللہ و ما والاہ او عالم او متعلم یعنی رحمت سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے دور نہیں ہے باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں تو لعنت یعنی بعد عن الرحمة (رحمت سے دوری) کا حکم خاص ان پر کر رہے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں

اہل دنیا کا فران مطلق اند روز و شب و رزق زق و در بق بقاند

(صرف کفار اہل دنیا میں رات دن زق زق بق بق میں گرفتار رہتے ہیں اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر بنا دیا مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمة کے محل کا وہ توجیہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتدا اور کافران مطلق خبر نہیں ہے بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے موخر ہے یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں مومن اہل دنیا ہے ہی نہیں کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلقات رکھنے والے ملعون نہیں ہیں کون مومن ایسا ہوگا جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہوگا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو باقی اسباب دنیا تو اس میں حدیث نے دو قسمیں کر دی ہیں ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلاً دخل نہ رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیا محضہ اور مذموم ہے اور اسی کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے تو حق تعالیٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے اسی کو ارشاد فرماتے ہیں وان الدار الاخرة لہی الحیوان کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ مرض تھا ہمارے اندر جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرما دیا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو و لعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتا دیئے تاکہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل او یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتے ہیں آخرت میں واقع ہیں دنیا نہیں ہیں کیونکہ وہ لہو و لعب نہیں اسی طرح اس کے مقابلہ و آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے

ہیں اور واقع میں دنیا کے لئے ہیں وہ آخرت نہیں ہیں۔

کلید در دوزخ است آن نماز کہ در چشم مردم گذاری دراز
(یعنی وہ نماز دوزخ کے دروازہ کی کنجی ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے دراز کی جائے)

ان الدار الآخرة لہی الحیوان سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیواۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنی مصدر ہے یہ ایسا ہے کہ جیسے زید عدل اور اگر صفت بھی ہو تو بمعنی ذی حیات ہوگی پس وہاں کی درود یوار میں بھی زندگی ہوگی دیواریں گائیں گی نعمات پیدا ہوں گے درخت گائیں گے اور بظاہر اس لئے کہا کہ کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ الدار کا مضاف مقدر ہو یعنی حیوة الدار الآخرة ہی الحیوة باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہی ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے یہی صوفیہ کا مسلک ہے بعض اہل ظاہر خشک ہیں وہ کہتے ہیں کہیں جنت مثل بولنے والے کی ہوگی جیسے بے جان تصویر کا کہہ دیتے ہیں کہ ایسی جیسے اب بول پڑے گی۔ یہ حیات کے قائل نہیں مگر یہ محض تاویل ہے صوفیہ کا قول ظواہر نصوص سے متاید ہے ان کے نزدیک دوزخ بھی ذی حیات ہوگی دلیل یہ ہے کہ اہل من مزید پکارے گی نیز اس میں اور بھی آثار حیات کے پائے جاتے ہیں نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل اثر دھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو کھنکھو رے وغیرہ ہیں سارا جہنم اثر دھے کی صورت ہے اس سے ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آ جاویں گے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاوے گی جس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور اہل من مزید پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس سہولت سے اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور جاندار ہونے کی صورت میں اس کا اثر فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہوں گے ہی مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات ہونے کے خوش ہوگا اور پھانک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت بھی نہیں جیسے دنیا میں بچے کے لئے اماں جان پھانک بن جاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسے ہی وہ دروازہ ہوگا اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اس طرح جیسے یہاں جاندار پھانک پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے

لنهدینہم سبلنا میں مجاہدہ پر ہدایت سبل کا وعدہ ہے چنانچہ ترجمہ آیت سے ظاہر ہو جائے گا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ

لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب و ثواب یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھا دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ کی (رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات مقصود طریق

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر طریق کا ایک منہا ہوتا ہے جس پر سیر ختم ہو جاتی ہے جب کوئی سفر کرتا ہے تو ایک جگہ ایسی آتی ہے جہاں سفر منقطع ہو جاتا ہے اس طرح طریق الہی کی بھی کہیں انتہا ہونی چاہئیں جس پر مجاہدہ منتهی ہو۔ یعنی کوئی مقصود ہونا چاہیے جس پر پہنچنے کے لئے ان راستوں کو طے کیا جاتا ہے ہر چند کہ لنہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں۔ کیونکہ ہدایت کبھی اراءت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلا دیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہو کر منزل تک پہنچا دے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لنہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں کیونکہ ہدایت کبھی اراءت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلا دیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہو کر منزل تک پہنچا دے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لنہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر دونوں احتمال ہونے کی وجہ سے مقصود تک پہنچانے کا بھی یقینی نہیں مگر محققین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقصود تک پہنچانے کا بھی وعدہ ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے ہدایت کو مفعول ثانی کی طرف بلا واسطہ متعدی فرمایا ہے اور حسب تصریح محققین اس صورت میں ہدایت کا مدلول وصول

ہی ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب دوسرے مقدمہ یہ رہا کہ مقصود کیا ہے تو جو لوگ آیات و احادیث پر نظر رکھنے والے ہیں ان کو اس میں کوئی شک نہ ہوگا کہ مقصود قرب حق جل و علا ہے۔

اصل مطلوب رضائے الہی ہے

والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا

اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت ارأء طریق نہیں ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ شرط نہیں بلکہ ایصال الی المطلوب ہے اور مطلوب ہے رضا پس رضا کا ملنا ثابت ہو گیا اور اصل مطلوب یہی ہے۔ والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مشقت و مجاہدہ کرتے ہیں ہم بیشک ضرور ان کو اپنے راستے بتلا دیں گے۔

مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے

دیکھئے مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے یہ تو ابتدائی حالت ہے اور انتہا یہ ہے وان اللہ لمع المحسنین یعنی بیشک اللہ نیک کاروں کے ساتھ ہے۔ الحاصل آپ کی طرف سے کچھ طلب ہونا چاہیے۔

وصول میں دیر نہیں لگتی

والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ جاہدوا سے مراد غور فکر دعا و التجاسعی و کوشش حق تعالیٰ کے سامنے الحاج و زاری تو واضح و خاکساری یہ چیزیں پیدا کرو رونا اور چلانا شروع کرو نخوت اور تکبر کو دماغ سے نکال کر پھینک دو اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا بطور امتحان ہی کے کر کے دیکھ لو مولانا فرماتے ہیں۔
فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیر و فضل شاہ

سُورَةُ الرُّومِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ

هُمْ غٰفِلُونَ ﴿١﴾

ترجمہ: یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

تفسیری نکات

یہ آیت کفار کے لئے مخصوص ہے

وعد الله لا يخلف الله وعده الله تعالیٰ کا وعدہ اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔
فرماتے ہیں کہ یہ (جو اوپر مذکور ہوا جو ایک پشین گوئی ہے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں کرتے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اس کا کوئی انکار نہ کرنا۔ مگر ایسے بھی بہت لوگ ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں چنانچہ آگے بطور استدراک کے فرماتے ہیں۔

ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ لیکن زیادہ تر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔
یہاں پر گو لا يعلمون کا مفعول مذکور نہیں مگر مقام کا مقتضایہ ہے کہ مفعول وہی ہو جو پہلے مذکور ہے یعنی لا يعلمون ان الله لا يخلف وعده۔ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔
اور یہ حالت کفر کی ہے اس لئے یہ آیت کفار سے مخصوص ہوئی آگے فرماتے ہیں
يعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا یہ لوگ جانتے ہیں ظاہر حیات دنیا کو۔
اس کا مرجع بھی وہی ہے جو پہلے لا يعلمون میں مذکور ہے ورنہ اس آیت کو ماقبل سے ربط نہ ہوگا اور
ضمائر میں بھی انتشار ہوگا۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِّدُ يَتَفَرَّقُونَ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ۝۱۵

ترجمہ: قیامت جب قائم ہوگی تو لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو باغ میں مسرور ہوں گے۔

تفسیری نکات

مومن و کافر کی تفریق

یہ جدا جدا ہونا بھی حضور ہی کے نور مبارک کا ایک ثمرہ ہے کیونکہ ایمان و معرفت و اعمال صالحہ کا حصول آپ کی برکت سے ہوا اور ایمان و اعمال صالحہ ہی کی وجہ سے مخلوق کے دو فرقے ہو گئے بعض مومن بعض کافر۔ تو اس تفریق کا اصل منشاء بھی نور محمد ہے۔ اسی تفریق کے ظاہر کرنے کے لئے قیامت قائم ہوگی تو دراصل حقیقی قیامت آپ ہی کی ذات ہے اور عرفی قیامت اس کا ایک اثر اور ثمرہ۔ اسی کو مولانا نے مثنوی میں ایک جگہ بیان فرمایا ہے۔

صد قیامت بود احمد در جہاں

اس لئے حق تعالیٰ نے یوم تقوم الساعة یومئذ یبلس المجرمون فرما کر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا و یوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون۔ یعنی گو جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم ناامید ہو جائیں گے مگر سب کا یکساں حال نہ ہوگا جس دن قیامت آئے گی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ فاما الذین امنوا و عملوا الصلحت فهم فی روضة یحبرون۔

ترجمہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور انہوں نے اچھے اعمال کئے ہیں وہ ایک بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔

تکبر و ن کی تفسیر

یوم تقوم الساعة کے بعد یومئذ پھر زیادت تہویل کے لئے مکرر لایا گیا فی روضة میں تنہیں تعظیم کے لئے ہے یعنی بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔ یحبرون احبار سے ہے جو باب افعال کا مصدر ہے۔ بمعنی سر جس کے بے تکلیف معنی اردو محاورہ کے موافق یہ ہوئے کہ وہ بڑے باغ میں مسرور ہوں گے کیونکہ سرور بھی لازم نہیں متعدی ہے دیکھئے حق تعالیٰ نے اس مقام پر یفرحون نہیں فرمایا کیونکہ فرح لازم ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایمان والے جنت میں خوش ہوں گے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر طبعی خوشی انسان کو ہو سکتی ہے اس قدر ان کو خوشی حاصل ہوگی۔ سو یفرحون سے طبعی خوشی پر زیادتی سمجھ میں نہ آتی۔ تکبر و ن سے یہ بات بتلا دی گئی کہ ان کو طبعی خوشی سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی کیونکہ ان کو خوش کیا جائے گا یعنی ان کو خوش

کرنے کا اہتمام ہوگا کوئی خوش کرنے والا ان کو خوش کرے گا۔

جیسا کہ علماء نے یہی نکتہ مطہرہ میں بیان فرمایا ہے کہ ازواج مطہرہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو پاک کیا ہے صرف یہی نہیں کہ وہ خود بخود پاک ہیں کیونکہ جو پاک کی خود بخود حاصل ہوتی ہے وہ کم ہوتی ہے دیکھئے اگر ایک کپڑے کو دن رات نہر میں ڈالے رکھیں تو وہ خود بخود پاک ہو جائے گا مگر جو خوبی اس وقت حاصل ہوگی کہ اس کو کسی شخص کے سپرد کیا جائے اور وہ پانی میں ڈال کر تختہ پر اسے کوٹ پیٹ کر صاف کرے وہ صرف نہر میں ڈالے رکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہی نکتہ معبرون میں ہو سکتا ہے یعنی یہی صرف نہیں کہ وہ خوش ہوں گے بلکہ خوش کئے جائیں گے اور ان کو حق تعالیٰ خوش کریں گے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کتنے بڑے ہیں۔ ان کی عظمت کے موافق ان کو دی ہوئی خوشی بھی عظیم ہوگی اتنا فرق ہوگا کہ حق تعالیٰ کی عظمت تو بالفعل بھی غیر متناہی ہے اور اہل جنت کی خوشی اگرچہ بالفعل متناہی ہوگی مگر لا تقف عند حد کے اعتبار سے وہ بھی ایک طرح غیر متناہی ہوگی اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عظمت الہی داخل مشیت نہیں اور عظمت و سرور اہل جنت داخل مشیت ہے یعنی حق تعالیٰ کے ارادہ اختیار کو اس میں دخل ہے اور حادث کی لا متناہی بالفعل محال اور لا تقف عند حد جائز۔ غرض غیر متناہی دونوں ہیں ایک غیر متناہی بالفعل دوسرا غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے الاما شاء ربک کی تفسیر بھی یہی لکھی ہے کہ خلود اہل جنت و اہل نار داخل تحت القدرت ہے اگرچہ منقطع کوئی بھی نہ ہوگا۔ ورنہ بدوں اس توجیہ کے بظاہر اس استثنائی پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت اہل جہنم کے خلود کے ساتھ الاما شاء ربک کا کیا معنی؟ کیونکہ بظاہر اس کا یہ ترجمہ ہے کہ وہ لوگ جنت اور دوزخ میں رہیں گے مگر جب کہ چاہیں حق تعالیٰ تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی نکالے بھی جائیں گے سو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے خوب تفسیر فرمائی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے مگر خدا جب چاہے تو ان کو نکالنے پر بھی قادر ہے مگر ایسا کیا کبھی نہ جائے گا تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر خدا تعالیٰ اس پر مجبور نہیں بلکہ یہ سب اسی کی مشیت سے ہوگا و علیٰ ہذا اہل نار بھی۔

فصل و رحمت

اس آیت میں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ مذکور ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ والے جنت میں خوش ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے نہیں معلوم ہو سکتے اسی لئے حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ لوگوں کو ایمان و اعمال صالحہ کا راستہ بتا دیں اور اس وقت اول تو کسی اور نبی کی شریعت موجود نہیں اور اگر پہلے انبیاء میں سے کسی کی کوئی شریعت ہے بھی تو محرف ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر اگر غیر محرف بھی ہوتی تو منسوخ تھی۔ اس لئے اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر حضور تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے بالکل محروم رہتے حق تعالیٰ شانہ کا بہت بڑا احسان ہمارے اوپر ہوا کہ آپ کی برکت سے ہم کو اس دولت سے

سرفراز فرمایا۔ اسی کو حق تعالیٰ شانہ نے بطریق امتنان احسان جتلا کر جا بجا قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے کہیں فرماتے ہیں ولولا فضل الله عليكم ورحمته لاتبعتم الشيطان الا قليلا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے ولولا فضل الله عليكم ورحمته لكنتم من الخسرين

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہارے جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

تفسیری نکات

نکاح کا اصل موضوع لہ

یعنی ازواج کو پیدا کیا تاکہ تم کو ان سے سکون قلب حاصل ہو۔ یہ نکاح کا اصل موضوع لہ ہے یعنی سکون حاصل ہونا باقی خدمت وغیرہ یہ سب فرع ہیں۔ وجعل بینکم مودۃ ورحمة اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی یہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے کہ جو دو شخص ابھی ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھے اب ان میں نکاح کے بعد کیسی محبت ہو جاتی ہے کہ دوسرے تعلقات میں اسکی نظیر نہیں ملتی اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کو صیغہ امر سے بیان نہیں کیا کہ تم کو آپس میں مودت ورحمت کا برتاؤ رکھنا چاہئے بلکہ صیغہ خبر سے بیان فرمایا کہ ہم نے تمہارے درمیان خاص تعلق پیدا کر دیا یعنی ہم نے تمہاری مدد کی ہے بدوں ہماری مدد کے اجنبیت میں ایسا تعلق نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں مودت ورحمت دو لفظ اختیار کئے گئے اس سے مطلب یہ ہے کہ اس تعلق میں کبھی مودت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی رحمت و ہمدردی کا چنانچہ ابتدا میں عموماً محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور انتہا میں رحمت و ہمدردی کا اور اس عنوان میں عورتوں کی اس شکایت کا بھی جواب ہو گیا جو عورتوں کو مردوں سے اکثر ہوا کرتی ہے جب نکاح کو چند سال گزر جاتے ہیں تو عورتیں مردوں سے کہا کرتی ہیں کہ اب تمہارے دل میں ہماری ویسی محبت نہیں رہی جیسی شروع میں تھی اب وہ ولولہ اور تقاضا اور جوش عشق نہیں رہا اس شکایت کا منشا جہل ہے اور اگر مرد لا جواب ہو جائے تو یہ اس کا جہل ہے دونوں جاہل ہوں گے تو شکایت بڑھے گی عاقل اس اعتراض کو کبھی تسلیم نہ کرے گا وہ اس کا یہ جواب دے گا۔

جوش کا کم ہونا کمال محبت کی دلیل ہے

کہ قاعدہ یہ ہے کہ قدامت کے بعد جوش کم ہو جاتا ہے مگر جوش کا کم ہو جانا زوال محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمال

محبت کی دلیل ہے کیونکہ جوش خود نقص کی دلیل ہے دیکھو ہنڈیا میں جب تک جوش رہتا ہے کچی ہے اور جب کم ہو کر سکون ہو جاتا ہے اس وقت سمجھتے ہیں کہ ہنڈیا پک گئی اسی لئے انبیاء اور کاملین میں کیفیات کا جوش کم ہوتا ہے اور متوسطین میں ان سے زیادہ اور چھٹ بھیموں میں تو سب سے زیادہ جوش ہوتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کامل ہیں تو ان کی محبت بھی سب سے کامل ہے مگر وہاں جوش نہیں پس عورتوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی کے پرانے ہو جانے سے اگر مرد کا جوش کم ہو جائے تو یہ محبت کے کم ہو جانے کی دلیل نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے کہ محبت کامل ہو گئی ہے مگر رنگ بدل گیا ہے پہلے محبت و عشق کا رنگ تھا اب رحمت و ہمدردی کا رنگ ہے پہلے محبت تھی مگر کسی قدر تکلف اور اجنبیت بھی تھی اب بالکل بے تکلفی ہے کہ ایک دوسرے کا ہمزاد و مساز اور راحت و غم کا۔

شریک ہے گویا دو قالب ایک جان ہیں یہ نکتہ ہے مودت و رحمت و لفظوں کے اختیار کرنے میں اس کے بعد ارشاد ہے ان فی ذلک لآیات لقوم یفکرون۔ کہ ان میں لوگوں کے لئے دلائل قدرت ہیں جو سوچ سے کام لیتے ہیں۔

معاملہ نکاح میں دلائل قدرت

اس میں ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سے وجود صانع پر استدلال ہوتا ہے اس طرح کہ دیکھو عورت اور مرد دونوں انسان ہی ہیں مگر دونوں میں کس قدر تفاوت ہے کہ مرد کی خلقت اور بناوٹ جدا ہے مرد سے بچہ نہیں پیدا ہو سکتا عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے مرد کو مرد سے وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا جو عورت سے حاصل ہوتا ہے تو ایک ہی نوع کے افراد میں ایسا تفاوت اور اس میں مصالح کی اس قدر رعایت بدوں صانع حکیم کے نہیں ہو سکتی اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی صانع ضرور ہے ایک اعرابی کہتا ہے البعرة تدل علی البعیر والا ثریدل علی المسیر فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاع کیف لایدلان علی اللطیف الخیر۔ کہ اونٹ کی مینگنی دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں سے کوئی اونٹ گیا ہے اور قدم کا نشان دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی گیا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پاکی

تو یہ بڑے بڑے ستاروں اور چاند سورج والا آسمان اور یہ کشادہ اور فراخ سڑکوں والی زمین اپنے صانع حکیم کے وجود پر کیونکر دلالت نہ کرے گی ضرور کرے گی سبحان اللہ! ایک جاہل بدوی کیسی عجیب بات کہتا ہے کہ جب آثار موثر پر دلالت کرتے ہیں دھواں دیکھ کر تم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں آگ ہے نشان قدم دیکھ کر یہ خبر ہو جاتی ہے کہ یہاں سے کوئی ضرور گیا ہے اور ایک نفیس عمارت دیکھ کر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ نشان قدم خود ہی بن گیا ہو گا۔ یا یہ مکان خود ہی تیار ہو گیا ہو گا پھر حیرت ہے کہ اتنا بڑا آسمان اور یہ پہاڑ اور زمین دیکھ کر اور اس کے نظام اکمل کا مشاہدہ کر کے تم کو اس کے صانع کا علم نہ ہو اور یوں کہو کہ یہ خود ہی اپنی طبیعت سے بن گئے ہیں اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ ایک بدوی بھی اس خیال کو دلیل سے باطل کر رہا ہے۔

مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

جس سے معلوم ہوا کہ مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے اور قرآن میں جا بجا اسی فطری دلیل سے اور توحید صانع پر استدلال کیا گیا ہے چنانچہ اس مقام پر بھی اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں سے بیبیاں بنائی ہیں۔ اگر غور سے کام لو تو اس میں تمہارے لئے دلائل قدرت ہیں اور یہی وہ فطری امر ہے جو میثاق الست میں قلوب کے اندر پیوست کر دیا گیا۔

نکاح میں آیات کثیرہ

اب شاید کسی کو یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ خلق ازواج میں آیات کثیرہ کہاں ہیں جو کہ ان فی ذالک لایت لقوم یتفکرون میں صیغہ جمع سے مفہوم ہو رہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو دنیا میں لاکھوں ہزاروں میاں بیوی ہیں پس ہر فرد کا وجود اور اس کی باہمی محبت مودت و رحمت الگ الگ دلیل ہے جو مجموعہ ہو کر بہت سے دلائل ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی میاں بیوی کو لیا جائے تو خود ان میں بھی بہت سے دلائل ہیں کیونکہ نکاح سے انسان کے لئے ایک نیا عالم شروع ہو جاتا ہے جو ہر شخص کی زندگی کا ورق الٹ دیتا ہے یقیناً جس شخص نے کسی بچہ کو چار پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا وہ اس شخص کو نکاح کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ گھر کا سردار بنا ہوا بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہے تو وہ ہرگز یہ نہ سمجھے گا کہ یہ وہی بچہ ہے جو میرے سامنے نکلا پھرا کرتا تھا پھر لوگوں کے بتلانے کے بعد اس کو بڑی حیرت ہوگی کہ اللہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے۔

عورت باورچن نہیں

فرمایا عورت باورچن نہیں ہے۔ جی بہلانے کے لئے ہے۔ قرآن میں لتسکنوا آیا ہے۔ اگر وہ کھانے پکانے سے انکار کر دے تو ان کو قدرت ہے۔ شوہر زور نہیں کر سکتا۔ خاوند کو یہ حق نہیں کہ اس کو ذلیل سمجھے۔

مودۃ ورحمة کا مفہوم

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بیبیوں کے باب میں جو ارشاد وجعل بینکم مودۃ ورحمة ہے میں اس کے متعلق کہا کرتا ہوں کہ دو وقت ہیں ایک تو جوانی کا اس میں تو جوش خروش کا غلبہ ہوتا ہے یہ حاصل ہے رحمت کا اور یہ بھی لغت محبت ہی کی ایک فرد ہے مگر عرف و محاورہ میں اس کو محبت کہتے نہیں اس کا نام عرف میں ہمدردی رحم مہربانی ہے اور یہ نکتہ اسی محاورہ پڑی ہے۔

زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں

حق تعالیٰ نے زوجین کے متعلق فرمایا وجعل بینکم مودۃ ورحمة مودۃ کے رحمت کو اسی لئے بڑھایا کہ زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ماند شے ماند شے دیگر نئے ماند

اور کسی کو بہت ہی محبت رہے گی تو جوانی تک رہے گی۔ بڑھاپے میں محبت و عشق باقی نہ رہے گا۔ ہاں شفقت و رحمت باقی رہے گی۔

مستورات پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا بے رحمی ہے

عورتوں پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا نہایت بے رحمی اور بے مروتی کی بات ہے فرمایا کہ ان بی بی کے خاوند نے ایک مرتبہ مجھ سے خود شکایت کی تھی کہ یہ وظیفہ و وظائف میں رہتی ہے میری خدمت کی پرواہ نہیں کرتیں۔ بندہ خدا ایسی کوئی خدمات ہیں جو بغیر وظائف ترک کئے ہوئے نہیں ہو سکتیں مرد کی خدمات ہی کیا ہیں چند محدود خدمات یہ دوسری بات ہے کہ خدمات کا باب اس قدر وسیع کر دیا جائے جن کا پورا کرنا ہی بے چاری پر دو بھر ہو جائے پھر فرمایا کہ ایک مقولہ مشہور ہے کہ مرد ساٹھا پاٹھا اور عورت بیسی کھسی سو عورت کے اعضاء کا جلد ضعیف ہو جانا اس کا سبب بھی زیادہ یہی ہے کہ اس پر ہر وقت غم اور رنج کا جھوم رہتا ہے۔ سینکڑوں افکار گھیرے رہتے ہیں امور خانہ داری کا انتظار بے چاری کے ذمہ ڈال کر مرد صاحب بے فکر ہو جاتے ہیں وہ غریب کھتی ہے مرنے لگتی ہے اگر یہ حضرت دوروز بھی انتظام کر کے دکھا دیں ہم تو اس وقت ان کو مرد سمجھیں باوجود ان سب باتوں کے کمال یہ ہے کہ اپنی زبان سے اظہار بھی نہیں کرتی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ سبب ہے عورت کے جلد ضعیف ہو جانے کا یہاں پر بعض عورتیں عیش اور راحت میں ہیں اور عمر ان کی تقریباً چالیس پینتالیس پینتالیس برس کی کم و بیش مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سال دو سال کی بیاہی ہوئی آئی ہیں اور ان کی کوئی پچیس برس کی عمر سے زائد نہیں بتلا سکتا تو بیوی کو عیش و آرام میں رکھنے میں ایک یہ بڑی حکمت ہے کہ وہ تندرست رہے گی۔ ضعیفی کا اثر جلد نہ ہوگا دراز مدت تک ان کے کام کی رہے گی مگر لوگ اپنی راحت اور مصلحت کا خیال کر کے بھی تو ان کی رعایت نہیں رکھتے اور میں یہ نہیں کہتا کہ جو روؤں کے غلام بن جاؤ۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ حدود کی رعایت رکھو اور ظلم تک نوبت نہ پہنچاؤ اگر کبھی ضرورت ہو دباؤ بھی دھمکاؤ بھی کوئی حرج نہیں حاکم ہو کر رہنا چاہیے اور محکوم کو محکوم بن کر لیکن جیسے محکوم کے ذمہ حاکم کے حقوق ہیں اسی طرح حاکم کے ذمہ محکوم کے بھی حقوق ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے برتاؤ کرنا چاہیے ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ عورتوں کے ذمہ واجب ہے کھانا پکانا۔ میری رائے ہے کہ ان کے ذمہ واجب نہیں میں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے عدم وجوب پر

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً
حاصل یہ ہے کہ عورتیں اس واسطے بنائی گئی ہیں کہ ان سے تمہارے قلب کو سکون ہو قرار ہو جی بہلے تو عورتیں جی بہلانے کے واسطے ہیں نہ کہ روٹیاں پکانے کے واسطے اور آگے جو فرمایا کہ تمہارے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی ہے میں کہا کرتا ہوں مودۃ یعنی محبت کا زمانہ تو جوانی کا ہے اس وقت جانبین میں جوش ہوتا ہے اور ہمدردی کا زمانہ ضعیفی کا ہے دونوں کا اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ ضعیفی کی حالت میں سوائے بیوی کے دوسرا کام نہیں آ سکتا۔ اس ضعیفی اور ہمدردی پر ایک حکایت یاد آئی ایک مقام میں ایک علامتی رئیس تھے گورنمنٹ میں

ان کا بڑا اعزاز اور بڑی قدر تھی یہ کابل سے یہاں آ کر رہے تھے گورنمنٹ نے کچھ گاؤں دے دیئے تھے ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا کلکٹر صاحب تعزیت کے لئے آئے ملاقات ہوئی کلکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہم کو بڑا رنج ہوا اس پر یہ ولایتی صاحب اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں فرماتے ہیں کلکٹر صاحب (کلکٹر صاحب) وہ ہمارا بیوی نہ تھا ہمارا اما تھا ہم کو گرم گرم روتی (روٹی) کھلاتا تھا پنکھا جھلٹاتا تھا تھندا تھندا (ٹھنڈا ٹھنڈا) پانی پلاتا تھا یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۸۲، ۱۸۳)

عورتوں کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ عورتیں جو کھانا پکاتی ہیں کیا یہ شرعاً ان کے ذمہ ہے فرمایا کہ میں تو ذمہ نہیں سمجھتا۔ مگر ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ قضاء تو نہیں مگر دیانتہ ان کے ذمہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیانتہ بھی ان کے ذمہ نہیں البتہ جس وقت شوہر حکم دے وہ اطاعت زوج کے تحت ملازم ہو جاویگا اور میں اس آیت سے استدلال کرتا ہوں۔ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً لِتَسْكُنُوا سَعَةَ مَعْلُومٌ ہوتا ہے کہ عورت بہلانے کے واسطے ہے روٹیاں پکانے کے واسطے نہیں۔ وہ مولوی صاحب اس کو فی نفسہ واجب فرماتے ہیں میں اس کو فی نفسہ واجب نہیں سمجھتا (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۲۵۸)

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاءُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں جو سنتے ہیں۔

تفسیری نکات

لیل ونہار کا تعلق عام ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاءُكُمْ (اسی کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اسی کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے) (میں بعض لوگوں نے باللیل کو منامکم کے ساتھ اور والنہار کو ابتغاءکم کے ساتھ متعلق کیا ہے گویا اصل میں اس طرح تھا منامکم وابتغاءکم باللیل والنہار فرمایا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ منام کو عام لیا جاوے مطلق لینے کو بھی اور وابتغاءکم من فضلہ سے بھی عام مراد لیا جاوے کہ بعض حصہ میں ہو تو اس تقدیر پر باللیل والنہار دونوں کا تعلق ہر ایک کے ساتھ ہو جاوے۔

سُورَةُ لُقْمَانَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِنْ جَاهِدَكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَىٰ
تُمرَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾

ترجمہ: اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کچھ کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع کرنے والا ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جہلاؤں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

تفسیری نکات حقوق والدین

حضرت لقمان علیہ السلام نے اسی ایہام خود غرضی سے بچنے کے لئے حقوق والدین کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس کو ذکر فرمایا کہ ووصینا الانسان بوالدیه حملته الایہ (ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا) اور حقوق والدین کے بعد فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت علی الاطلاق نہیں بلکہ اسی وقت تک ہے جب تک خدا کے خلاف نہ کہیں اور اگر وہ خدا کے خلاف کوئی بات کہیں تو نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرو یہ تو ربط کے لئے بیان کیا گیا اب آگے وہ جملہ ہے جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی یعنی ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ

ہوئے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہ میری طرف سے ہٹاتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو گویا باپ ہی ہوں بلکہ ان کی اطاعت کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے اور اس کے مابعد میں وعید فرمائی کہ چونکہ میرے پاس تم سب کو آنا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے ورنہ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر ہم تم کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کام کئے یہ مقام کا حاصل ہوا اختصار کیساتھ۔

ایک جدید مرض اور اس کا علاج

ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی تو اتنا تو جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی (ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرمادیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آوے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمے ضروری ہے تو یہ کتنا عجیب و غریب قصہ ہے اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ بہت سے عقلاء جو یہ رائے دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت ہے کہ علم کلام جدید تیار ہو علم کلام قدیم آج کل کے لئے کافی نہیں ہے بالکل غلط رائے ہے دیکھئے یہ کتنا جدید مرض تھا مگر پھر بھی قرآن مجید میں اس کا علاج مذکور ہے اسی طرح ہر شبہ کے جواب کے لئے قرآن و حدیث ہی کافی ہے۔

اتباع کا صحیح معیار

ایک جماعت میں تو اتباع ایسا سستا ہے اور ایک میں اتباع بالکل ہی نہیں پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک تو سب کے تابع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی تابع نہیں پس ایک جماعت میں افراط ہے حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں واتبع سبیل من اناب الی (جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کا راستہ کا اتباع کرو) اتباع سے اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت کو نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس و ناکس کے معتقد ہونے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتباع وحی کا حکم

ثم جعلنک علی شریعة من الامر فاتبعھا خود اللہ تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

حکم فرماتے ہیں اور من الامر میں الف لام عہد کا ہے پس اس سے مراد امر دین ہے پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جائیے پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تو کوئی تھا نہیں تو آپ کو حکم ہوا۔

اتباع وحی کا اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے انہیں حکم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں چنانچہ ارشاد ہے فاتبعونی یحببکم اللہ (سو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے) اور علیکم بسنتی (میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو) پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آ کر عوام کو حکم ہے علماء کے اتباع کا چنانچہ ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علینا بیانہ (یعنی پھر اس کا بیان کر دینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں علمنی ربی فاحسن تعلیمی (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس اچھی ہوئی تعلیم میری) تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جاوے یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کو دین خوب سمجھایا اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہیے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے اسی لئے اس کو صحابہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ سنة الخلفاء الراشدین (خلفاء راشدین کی سنت) علی ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات دیکھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے علماء کو ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہیے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور وہ چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے اس لئے ہم کو ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہیے پس جبکہ ثابت ہو گیا کہ متبوع مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور مجتہدین کے اتباع کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو خفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز و عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال وبالذات مراد لیا جاوے تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایسا اتباع تو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق

حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے پھر کیا وجہ کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز۔

حنفی کہلانے میں کوئی قباحہ نہیں

پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحہ نہیں اس نسبت کو کفر شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت تو خدا کے کلام میں بھی دوسروں کی طرف موجود ہے ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) قل هذه سبيلي ادعوا الی اللہ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یصلون عن سبیل اللہ (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو یہ ایسا ہے کہ عباد اتنا شتی و حسنک واحد (عنوانات مختلف ہیں معنوں ایک ہی ہے)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ سے پوش من انداز قدت راے شناسم
(یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو چال سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔)

حضرت مجتہدین کا اتباع

اس وقت چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے اس لئے مجتہدین اور علماء کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں اس لئے کوئی چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گویہ سبیل من اناب (راستہ ان لوگوں کا جو منیب ہیں) کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے علماء چونکہ اسے ہم کو سمجھا دیتے ہیں اس معنی کردہ واسطہ ہیں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے سبیل من اناب کہا گیا خلاصہ یہ کہ اتباع کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جو سرے سے اتباع ہی کو ضرور نہیں سمجھتے اور کسی کا اتباع ہی نہیں کرتے اس سے تو ان لوگوں کی اصلاح کی گئی اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس و نا کس کا اتباع کرنے لگے ہیں سو

آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (ان لوگوں کے راستہ کا جو منیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ واتبع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں جو صاحب انابت (اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا) ہو اس کا اتباع کرو۔ سبحان اللہ کیا عجب معیار ہے پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

دیکھئے حقوق کی کتنی بڑی عادت ہے اور باپ کا کتنا بڑا حق مقرر فرمایا۔ یہ مضمون اس آیت میں بھی ہے وان جاهدک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعہما وصاحبہما فی الدنیا معروفاً واتبع سبیل من اناب الی ثم الی مرجعکم فانبتکم بما کنتم تعملون یعنی اگر وہ اس بات پر زور دیں کہ تم شرک کرو تو اس بات میں ان کا کہنا نہ مانو لیکن اس پر بھی دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو پھر تم سب میری طرف اور میرے ہی یہاں آؤ گے پھر میں ایک ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دوں گا۔ اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ جب باپ نے شرک کیا تو وہ باغی ہے اور اسی بغاوت کی طرف بیٹے کو بھی بلاتا ہے اس سے اور بغاوت میں اضافہ ہوا لیکن پھر بھی شریعت میں اس کے کچھ حقوق مقرر ہیں اس سے ایک تو یہ بات نکلی کہ رحمت حق تعالیٰ کی اس قدر وسیع ہے کہ اس نے باغی کے بھی حقوق رکھے ہیں اور مسلمان بیٹے کو اجازت نہیں ہے کہ باپ کے ساتھ برا برتاؤ کرے اور اس بات کو کس لطیف پیرایہ سے بیان فرمایا۔

ثم الی مرجعکم فانبتکم بما کنتم تعملون یعنی ہم جانیں اور وہ جانے وہ جائے گا کہاں آخر آئے گا ہمارے ہی یہاں ہم اس سے سمجھ لیں گے تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو آخر وہ تمہارا تو باپ ہی ہے تم اس کا ادب کرو۔ کسی اور قانون میں آپ یہ بات دکھا سکتے ہیں کہ باغی کے بھی کچھ حقوق ہوں باغی کا ترجمہ دشمن ہے اور دشمن کے حقوق کیسے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو محبین و موافقین کے ساتھ کیسا ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے

تفسیری نکات

آثار تکبر اور اس کی مذمت

سب سے بڑھ کر بڑی بات تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی برائی جا بجا بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب کل مختال فخور (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور ان اللہ لا یحب المستکبرین (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں) یہ تین الفاظ ہیں مختال اور فخور اور مستکبرین اور تینوں کی نسبت لا یحب نہیں پسند کرتے کیا جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ تو مستکبر ہیں کیونکہ استکبار کے معنی ہیں بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب المستکبرین یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی مغضوب ہیں اور کبھی تہذیب کم ہوئی تو کبر کا اثر ظاہر بھی ہو جاتا ہے اس ظہور کے مراتب مختلف ہوتے ہیں کبھی زبان پر تو نہیں آتا مگر چال ڈھال سے ظاہر ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بناتا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جن سب کا خلاصہ یہی ہے اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے لا یحب کل مختال فخور یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے کلمات نکلنے لگتے ہیں ان کو فخر فرمایا پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر اور افعال سے بھی ظاہر ہو مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو اور فخور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے تو تین مرتبہ ہوئے ایک مستکبرین مختال اور ایک فخور تینوں کے واسطے لفظ لا یحب فرمایا خلاصہ یہ کہ تکبر کا ظہور ہونہ ہو یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے یا افعال سے سب کو ان اللہ لا یحب المستکبرین سے منع فرمادیا ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھئے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمائی صرف لاسحب (نہیں پسند کرتے ہیں) فرمادیا ہے سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اس آیت میں نہ سہی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے الیس فی جہنم مشوی للمتکبرین (کیا غرور کرنے والوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لاسحب فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو غرور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید اسی پر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو مرضی کے خلاف ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک بیان تو ہے پس لاسحب اصل ہو گئی وعید کی بلکہ دوسرے لفظوں

میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو متکبر ہے یا مسختال ہے یا فخور فخور کیونکہ گو لغت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نفیض نہیں لیکن محاورات میں جس پر آیات قرآنیہ ہیں وہ عداوت کی نفیض ہے لایجب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نفی کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت وعید نہیں بلکہ یہ تو وعیدوں کا اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہی۔

الْمُتَرَوِّاَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ

عَلَيْكُمْ نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِی اللّٰهِ

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًی وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بدوں علم کے اور بدوں ہدایت کے اور بدوں روشن کے۔

تفسیری نکات

منکرین توحید سے شکایت

یہ ایک آیت ہے سورۃ لقمان کی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بعض دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل خلاف دلیل ہے اس لئے اس کو مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعض انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائے گا پس یہ آیت توحید پر تو صراحت دلالت کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارۃ دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ مناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لئے دوسرے مضمون کو جو اشارۃ اس آیت سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی لیکن ربط کے لئے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی

طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آوے گی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لئے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **السم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض** اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں یہاں سخر لکم کے معنی وہ نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں لیکن منشاء اس اشکال کا محض خلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لئے بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لئے اس کو قرآن میں اشکالات پیش آ جاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات و لغات میں فرق جانتے ہیں البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ و محاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں سو ممکن ہے کہ کسی نے سخر لکم کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو ”سخر کر دیا تھا تمہارے لئے“ پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط ہو گیا ہو اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورہ اردو میں مستعمل ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھی تھی مسئلہ تصور شیخ صوفیہ کا ایک شغل ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہو گئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اس کی تعلیم کا مضائقہ نہیں رفع خطرات و حصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نوارد طالب علم جواب تک معقول میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلا ہے ہی تھے سو اس کا منشا یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بوعلی سینا ایسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ

سن کر ادھر ہی شغل ہوتا تھا دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شیخ ہو سکتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں نے صفات الہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا قرآن میں حق تعالیٰ کے لئے وجہ وید وسمع و بصر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسیم کے قائل ہو گئے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں اس لئے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر نہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زوند

(بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھگوسلوں کی راہ اختیار کی)
اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گندوں ہی میں سنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا پس قرآن میں سخر لکم کا ترجمہ ”مسخر کر دیا تمہارے واسطے“ دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لے کر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برے گا علیٰ ہذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آ رہا ہو اور ہم ہو اسے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق کے لئے اس سے یہ اشکال پیدا کیا اور حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنی لیتا تو یہ اشکال نہ ہوتا۔

سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض

ترجمہ: کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لئے تمام چیزوں کو جو آسمان وزمین میں ہیں۔

تسخیر کا مفہوم

تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے اور وہ معنی مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے۔

پس جب اہل عرب صانع کے قائل تھے اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ واحد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا تا کہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقناعی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقناعی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقناعی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہو سکتے ہیں بالخصوص دو موقعوں میں تو یہ انطباق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورۃ بقرہ کی اس آیت میں ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التي تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیایہ الارض بعد موتہا و بث فیہا من کل دابة و تصریف الرياح والسحاب المسخرین السماء والارض لایات لقوم یعقلون (آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنا آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ہواؤں کے رخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان ادھر ادھر پھرنا عقلمندوں کے لئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ یعقلون موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لئے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انہوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے لو کان فیہما الہة الا اللہ لفسدتا (اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے)

حاصل اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بدھتہ (ظاہری) بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود و عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی مرتج کا محتاج ہے وہ مرتج اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لئے بھی کسی مرتج کی ضرورت ہوگی علیٰ ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لئے اس کو قطع کرنے کے لئے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرتج واجب الوجود ہے (جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر

کامل ہونا ضروری شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکنے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنی زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے خوب سمجھ لو اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لئے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فردا عظیم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرمادیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے۔

و اسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ و باطنۃ

ترجمہ: اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں۔

نعمت کی دو قسمیں ظاہرہ و باطنہ

اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں نعمت ظاہرہ وہ ہے جو حواس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے اور جو حواس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے بہر حال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرمادیں ورنہ نعم باطنہ (باطنی نعمتوں) کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے۔

چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فردا عظیم اسلام ہے۔ اب ذرا انصاف سے بتائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں

کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ۔ بغض فی اللہ۔ توکل و رضا وغیرہ یہ سب نعم باطن ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالیٰ نے نعم باطن کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ الا من شاء اللہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطن میں داخل ہے۔

آگے حق تعالیٰ منکرین توحید کی شکایت فرماتے ہیں ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتب منير یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بجا دل فی اللہ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں) سے مراد بجا دل فی توحید اللہ (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے اس آیت میں منکرین توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں۔

جدال کی دو قسمیں

چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے ایک جدال بالباطل جیسا کہ جادلہم بالشیء ہی احسن (ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جدل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلتہ ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے جیسا مشاکلتہ جزاء سینۃ سیئۃ مثلھا (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورت دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

فضائل علم

یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالیٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے فرماتے ہیں ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتب منير یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات و صفات و احکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے گو

درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم ہے آگے فرماتے ہیں بغیر علم ولا ہدی ولا کتب منیر یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات ذات و صفات و احکام الہی میں بدوں علم کے اور بدوں ہدایت کے اور بدوں روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احترام یہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہو سکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعیہ ہیں مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے پھر اسی کے ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہو سکے پس یہاں علم سے خاص علم یعنی صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور جو شخص علم صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہو سکتا لہذا یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہو گئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انہوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کر لیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو۔

سُورَةُ الْأَحْزَابِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ

تَرْجَعًا: اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے

تفسیری نکات

ایک شخص میں دو دل ممکن ہیں یا نہیں

فرمایا کہ امریکہ سے ایک شخص نے اشتہار دیا کہ میرے دو دل ہیں اکثر لوگوں نے اس کا انکار کیا اور تمام عالم میں ایک شور مچ گیا اور لوگوں نے سوالات کر کے بھیجے فضلاء شیعہ میں سے بھی ایک صاحب نے جو علم طب اور ہیئت و ریاضی سے واقف تھے اس کے رد میں ایک طویل تقریر اس دعوے کی تکذیب میں لکھی اور اس کو طبع کرایا میں نے بھی اس کو دیکھا مگر مجھے پسند نہیں آئی کیونکہ محض دلائل طبیہ سے اس کی نفی یا عدم امکان ثابت نہیں ہو سکتا میرے پاس بھی اس کے متعلق سوال آیا تھا میں نے اس کے دو جواب لکھے ایک تو ظاہر نظر میں نہایت وقع تھا منشاء شبہ کا یہ تھا کہ قرآن مجید میں ہے مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ تو یہ دعویٰ اس آیت کے خلاف ہے جواب اول تو یہ تھا کہ کلام اللہ میں لفظ ماضی سے ارشاد فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ زمان نزول وحی تک ایسا نہیں ہوا تھا اس سے مستقبل میں نفی لازم نہیں آتی دوسرا جواب کہ وہی با وقعت جواب ہے یہ ہے کہ کلام اللہ میں بطور مثال کے فرمایا ہے زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنی کی زوجہ کے قصے میں مقصود یہ ہے کہ نبوت اور عدم نبوت دونوں وصف جمع نہیں ہو سکتے جیسے ایک شخص کے دو دل نہیں ہو سکتے اور تمام مثالوں میں اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے اس میں کلیت ضروری نہیں اور فرمایا کہ یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور تکذیب واقعہ کی بلا ضرورت اور رد و انکار میرے نزدیک مشکل غیر صحیح ہے اس واسطے کہ اول تو ممکن ہے کہ ان دلائل تکذیب کا کوئی اس سے اقویٰ دلیل سے رد کرے دوسرے دلائل اس شخص کے مقابلہ میں کافی نہیں ہیں جس نے مشاہدہ کیا ہے۔

ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه یعنی خدا تعالیٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ اس کا جواب ایک تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت قوی ہو اس لئے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو یہ جواب تو بطور منع کے ہے اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں ما جعل صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے پس اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں۔

اخبار میں شائع ہوا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں اور اخباروں کو آج کل ایسا سمجھتے ہیں جیسے وحی آسمانی چاہئے تو یہ تھا کہ اس خبر میں اشکال کیا جاتا مگر وہ اخباری خبر تھی غلط کیسے ہو سکتی تھی بعض مسلمانوں کو اس خبر سے قرآن پر اشکال ہو گیا کہ قرآن میں جو آگیا ہے

ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه ”کہ حق تعالیٰ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں بنائے“ ترجمہ: اے نبی آپ اپنی بیبیوں سے فرمادیں کہ اگر تم دنیوی زندگی کا عیش اور اس کی بہاریں چاہتی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فطانت

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو سب سے پہلے حضور نے حضرت عائشہ صدیقہ کو یہ آیات سنائیں اور فرمایا جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور کہ یہ خیال ہوا کہ عائشہ کم سن بچی ہیں اور بچپن میں دنیا کی حرص ہونا کچھ بعید نہیں تو ایسا نہ ہو یہ جلدی سے دنیا کو اختیار کر لیں۔ اس لئے فرمایا کہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا کیونکہ ان کے متعلق آپ کو اطمینان تھا کہ وہ حضور سے مفارقت کی رائے کبھی نہ دیں گے مگر حضرت عائشہ نے آیات تخییر کو سن کر فوراً جواب دیا

افی هذا استامر ابوی کیا اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت الله ورسوله والدار الآخرة میں نے اللہ و رسول ﷺ کو اختیار کیا اور دار آخرت کو۔

ان کے اس جواب سے حضور ﷺ کو بہت مسرت ہوئی کیونکہ آپ کو ان سے بہت محبت تھی۔

عشق و محبت

احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ سے حضور کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب کہ یہ چھ سال کی تھیں اور حضور کے گھر میں جس وقت آئی تھیں اس وقت ان کی عمر نو سال کی تھی ظاہر ہے کہ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے ہندوستان میں تو نو سال کی لڑکی شوہر کے پاس جانے کے اور گھر داری کے قابل نہیں ہو سکتی مگر عرب میں نشوونما

اچھا ہوتا ہے وہاں نو سال کی لڑکیاں اٹھان (نشوونما) میں اچھی ہوتی ہیں اس لئے حضرت عائشہؓ نو سال کی عمر میں حضورؐ کے گھر آ گئی تھیں مگر اس عمر میں بچپن کی باتیں تو ہوتی ہی ہیں نشوونما اچھا ہونے سے بچپن تو زائل نہیں ہو جاتا تو اس عمر میں اگر مال و متاع دنیا کی زیادہ حرص ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ بچوں کو زیور گہنے کی حرص ہوتی ہے۔ مگر حضرت عائشہؓ باوجود اس کم سنی کے بڑی بڑی عورتوں سے عقل و فہم و ادب میں کم نہ تھیں۔ بلکہ سب سے بڑھی ہوئی تھیں بڑے بڑے صحابہ ان سے مشکل مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان کی فہم و سلامت رائے معلوم کرتے تھے اسی عقل و فہم کا یہ اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں بھی ان کے اندر بچیوں کی سی حرص و طمع نہ تھی بلکہ دانا عورتوں کی طرح استغناء کی شان تھی۔

بڑی بات یہ تھی کہ جیسے حضورؐ گوان سے محبت تھی وہ بھی حضورؐ کی عاشق تھیں چنانچہ یہ جواب دے کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ میری ایک درخواست ہے فرمایا وہ کیا؟ کہا وہ یہ کہ آپ میرے اس جواب کو دوسری ازواج سے بیان نہ فرمائیے گا مطلب یہ تھا کہ کہیں میرا جواب سن کر میری تقلید میں سب یہی کہہ دیں اور وہ چاہتی یہ تھیں کہ سب اپنی اپنی رائے سے جواب دیں تو اچھا ہے ممکن ہے کسی کی رائے دینا لینے ہی کی ہو تو وہ الگ ہو جاوے اور رقیبوں کی تعداد کچھ کم ہو جائے مگر حضورؐ نے اس درخواست کو منظور نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گی کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا تو میں بتلا دوں گا۔ ہاں بدوں پوچھے مجھے بتلانے کی ضرورت نہیں۔

تو حضرت عائشہؓ کی اس درخواست سے ان کی محبت کا رنگ معلوم ہو گیا کہ وہ یوں چاہتی تھیں کہ حضورؐ میں جو اتنے شریک ہیں وہ کم ہو جاویں تو اچھا ہے اور اس میں دوسروں کے ساتھ برائی کا قصد نہ تھا بلکہ اپنے لئے بھلائی کا قصد تھا کہ حضورؐ تنہا میرے ہی لئے ہوں اور اس تمنا میں عاشق معذور ہوتا ہے ایک رنگ تو یہ تھا۔

ایک رنگ یہ تھا کہ حضرت ام حبیبہؓ نے ایک دفعہ حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ میری بہن سے شادی کر لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تم کو یہ گوارا ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کے پاس اکیلی تو ہوں نہیں بلکہ اب بھی میرے شریک بہت ہیں تو اگر اس خیر میں میری بہن شریک ہو جائے تو اس سے بہتر کیا ہے غیروں کی شرکت سے بہن کی شرکت تو پھر اہون ہے حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرے واسطے حلال نہیں۔

عشق کا ایک رنگ یہ بھی ہے جو حضرت ام حبیبہؓ میں تھا کیونکہ وہ بہن کا سوکن ہونا محض اس لئے گوارا کرتی تھیں کہ میری بہن کو بھی حضورؐ سے خاص تعلق ہو جائے جو اس کے لئے سعادت آخرت کا سبب ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ آپ کے تعلق کی کتنی قدر دان تھیں۔

بہر حال جب یہ آیت تخیر نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضورؐ ہی کو اختیار کیا دنیا کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں

رہنا منظور تھا مگر حضور سے علیحدگی منظور نہ تھی۔ چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی تم کو حضور اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر بیبیاں کہاں سے ملیں گی خوب سمجھ لو کہ اگر حضورؐ نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر بیبیاں حضور ﷺ کو دے دیں عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجاً خیراً منکن یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ بیبیاں کیسی ہوں گی۔

نقشبند یہ اور چشتیہ کے الوان میں مناسبت

فرمایا اہل علم کو مضامین علمیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں نہیں آتی جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اس کے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے جہتی تو کہتے ہیں

تا بدانی ہر کر ایزداں بخواند از ہمہ کار جہاں بے کار ماند
یقیناً جس کو حق تعالیٰ اپنا خواص بناتے ہیں تمام دنیا کے کاموں سے بے کار فرما دیتے ہیں مگر
نکما ہوا مگر تو مجذوب کیا غم بڑی کار آمد یہ بیکاریاں ہیں
(اسی ضمن میں فرمایا) ویسقون فیہا کاسا کان مزاجھا زنجبیل (۱)

اس کے متعلق میرے قلب پر یہ لطیفہ وارد ہوا کہ یہ محبت کی دو نسبتوں کا لون ہے کافور باردالمزاج ہے اور زنجبیل کو نسبت شوق سے مشابہت ہے کیونکہ شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حارالمزاج ہے اور شوق میں حرارت و التهاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیسا کہ نسبت انس میں برود و خمود و سکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس نقشبند یہ کو وہاں شراب کافور زیادہ ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل زیادہ۔

اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت عشق کے آثار مختلف ہیں اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف معاملہ ہوگا چونکہ نسبت سکون میں غلبہ صحو بھی ہوتا ہے اور اسمیں اختیار اور ارادہ فنا نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا کہ وہ خود جام شراب پیئیں گے جس کا مزاج کافور ہوگا اور نسبت عشق میں اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا تو ان کے متعلق ارشاد ہے ویسقون فیہا کاسا کان مزاجھا زنجبیل یہ وہاں بھی خود نہیں پیئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکران کو پلائیں گے کہ وہاں بھی مستی ہی میں رہیں گے کیونکہ یشربون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اس کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ کافور زنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور زنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور ان کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی اصل مقصود محبت (الہی) دونوں میں مشترک ہے اور محروم کوئی بھی نہیں (المعرق والرحیق ص ۳۵۷ تا ۳۸۲)

يُنْسَاءُ النَّبِيُّ مَنْ يَأْتِي مِنْكَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ يُضَعَفُ

لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۖ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝

ترجمہ: اے نبی کی بیویوں کو جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی اس کو دوہری سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔

تفسیری نکات

نبی کی بیبیوں سے زنا کا صدور نہیں ہوتا

فاحشہ کی تفسیر جاننے سے پہلے سننے والے کا ذہن شاید اس طرف منتقل ہو کر فاحشہ ہے مراد نعوذ باللہ ناہو یاد رکھو انبیاء علیہم السلام کی بیبیوں میں اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے الطبیات للطیبین نبی خود پاک ہوتے ہیں ان کے لئے بیبیاں بھی پاک ہی تجویز کی جاتی ہیں۔ ہاں کسی کسی نبی کی بیبیوں سے کفر ہوا ہے۔ مگر زنا کا صدور ان سے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس سے منصب نبوت میں خلل ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انبیاء جس قدر ہوئے ہیں صاحب جاہ ہوئے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے سب معزز خاندان سے ہوئے ہیں اور حکمت اس میں یہ ہے کہ جو اثر خاندانی آدمی کا قوم پر ہوتا ہے وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا اور اس کے اتباع سے کسی کو عار نہیں ہوتا اور اگر کسی آدمی کی بیوی زانیہ ہو تو اس سے جاہ میں قدح ہوتا ہے اور اگر نماز نہ پڑھے یا کفر کرے تو اس کو عرفاً بے عزتی کا سبب قرار نہیں دیا جاتا اس لئے فاحشہ سے مراد زنا تو ہو نہیں سکتا بلکہ فاحشہ مبینہ سے مراد ایذا رسانی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس لئے کہ قصہ اسکے نزول کا یہ ہوا تھا کہ ازواج مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خرچ مانگا تھا چنانچہ اول آیتوں میں اس کی تصریح بھی ہے ان کستن تر دن الحیوة الدنیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی اور اگر فاحشہ سے مراد زنا ہوتا تو اس کے مقابلہ میں آگے عفت کا ذکر ہوتا ہے حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ ارشاد فرمایا ہے ومن یقنت منک للہ ورسولہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کو بے حیائی اس لئے فرمایا کہ ایسے محسن کو تکلیف پہنچانا بے حیائی ہی ہے اس واسطے کہ جس کے حقوق کے بہت سے مقتضی موجود ہوں اس کے حقوق کو ضائع کرنا بے حیائی ہے پس جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بہت سے مقتضیات موجود تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا بے حیائی ہوئی اور یہاں سے یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے گناہ (نافرمانی) تو بطریق اولیٰ بے حیائی میں داخل ہوں گے پس ثابت ہو گیا کہ ہر گناہ بے حیائی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا اطلاق ان گناہوں پر زیادہ آتا ہے جس کو آدمی چھپاتا ہے۔

يُنْسَاءُ النَّبِيُّ لِسْتُنَّ كَا حِدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنْ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝۳۲

ترجمہ: اے نبی کی بیوی تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ تو تم (نامحرم مرد سے) بولنے میں (جبکہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو (اس سے) ایسے شخص کو (طبعاً) خیال (فاسد) پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے اور قاعدہ (عفت) کے موافق بات کہو۔

تفسیری نکات

ازواج مطہرات کی فضیلت کا سبب

اور آیت یا نساء النبی لستن کا حد من النساء ان اتقین پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ آیت عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یدلہ ازواجاً خیراً منکن مسلمات مؤمنات قانتات۔ الآیہ اس کے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی مثل بلکہ ان سے بہتر دوسری عورتیں ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ یہ ارشاد فرمایا گیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمہارے بدلہ میں تم سے بہتر عورتیں دے دیں گے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہنے ہی کی وجہ سے ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے اور دوسری بیویوں سے نکاح کر لیتے تو آپ کے نکاح کی وجہ سے اب وہ ان سے افضل ہو جاتیں۔

عورت کی تہذیب

دیکھئے اس آیت کے مخاطب وہ عورتیں ہیں جو مسلمانوں کی مائیں تھیں یعنی ازواج مطہرات ان کی طرف کسی کی بری نیت جا ہی نہیں سکتی تھی مگر ان کے لئے بھی یہ سخت انتظام کیا گیا تو دوسری عورتیں تو کس شمار میں ہیں۔ چنانچہ اس کے شرع میں ہی یہ لفظ موجود ہے لستن کا حد من النساء یعنی تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو بلکہ اوروں سے افضل ہو۔ پھر بھی فرماتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ نرم لہجے سے بات مت کرو۔ جب بات کرنا ہو تو خشک لہجہ سے کرو جس سے مخاطب یہ سمجھے کہ بڑی کھری اور ٹری اور تلخ مزاج ہے تاکہ لا حول ہی پڑھ کر چلا جائے نہ یہ کہ نرمی سے گفتگو کرو کہ میں آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوں مجھے جناب کے الطاف کریمانہ کا خاص احساس ہے۔ جیسا کہ آج کل کے رسالوں میں عورتوں کے مضامین نکلتے ہیں۔ یہ مضامین زہر قاتل ہیں آفت ہیں طرح طرح کے

مفاسد اس پر مرتب ہوتے ہیں بعض لوگ اس پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب بتلائیے کہ کیا فساد ہو رہا ہے ہم کو تو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو فساد موجود ہے اور اگر تم کو نظر نہیں آتا تو ممکن ہے کہ بہت قریب آگے چل کر یہ لہجہ کچھ رنگ لاوے گا اس وقت سب کو معلوم ہوگا اور مجھ کو اس وقت معلوم ہو رہا ہے جیسے کہا گیا ہے

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را اہل نظر شروع ہی میں کھٹک جاتے ہیں کہ یہ چیز کس وقت میں رنگ لائے گی اور اس کی دلیل بھی خود اس آیت ہی میں موجود ہے کہ فلات خضعن بالقول کے بعد ہی بطور نتیجہ فرماتے ہیں فیطمع الذی فی قلبہ مرض کہ اگر خضوع فی القول یعنی نرم لہجہ سے بات کی گئی تو جس کے دل میں روگ ہے اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا اور وہ لہجہ کی نرمی سے سمجھ لے گا کہ یہاں قابو چل سکتا ہے پھر وہ اس کی تدبیریں اختیار کرے گا دیکھئے خود حق تعالیٰ لہجہ کی نرمی کا یہ اثر بتا رہے ہیں پھر کسی کی کیا مجال ہے کہ اس اثر کا انکار کرے میں اپنی طرف سے تو نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ الفاظ قرآنی صاف بتاتے ہیں عورتوں کا مردوں سے نرم گفتگو کرنا یہ اثر رکھتا ہے کہ ان کے دلوں میں طمع پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد یہ حکم بھی ہے وقلن قولاً معروفاً جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب بات کرو بھی تو ایسی بات کرو جس کو شریعت میں اچھا مانا گیا ہو۔ ایک تو یہ کہ بے ضرورت الفاظ مت بڑھاؤ کیونکہ شریعت اس کو کسی کے لئے پسند نہیں کرتی۔ شریعت نے کم بولنے ہی کو پسند کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو سوچ کر کہو کوئی بات گناہ کی منہ سے نہ نکل جاوے مختصر ترجمہ معروف کا معقول ہے تو یہ معنی ہوئے کہ معقول بات کہو معقول بات وہی ہوتی ہے جس سے کوئی برانہ نتیجہ پیدا نہ ہو جب ثابت ہو چکا کہ لہجہ کی نرمی سے بھی عورتوں کے لئے برانہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے تو محبت پیار کی باتوں سے کیوں برانہ نتیجہ پیدا نہ ہوگا جس کو آج کل تہذیب میں داخل سمجھا گیا ہے تو اس قسم کی باتیں عورتوں کے لئے معقول نہیں بلکہ نامعقول ہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک بات اس کے لئے معقول ہو اور دوسرے کے لئے نامعقول ایک کے لئے سختی سے بات کرنا اور بے رخی سے جواب دینا معقول ہو سکتا ہے اور دوسرے کے لئے نامعقول تمہارے لئے یعنی مردوں کے واسطے باہمی کلام کا معقول طریقہ یہ ہے کہ نرمی سے بات کرو کسی کو سخت جواب نہ دو روکھا پن نہ برتو۔ اور عورتوں کے لئے معقول طریقہ یہ ہے کہ اجنبی کے ساتھ نرمی سے بات نہ کریں اور سختی سے جواب دیں اور روکھا برتاؤ کریں۔

اور قوت وہ ہے جس سے بقدر کفایت گزر ہو جاوے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک نہیں۔

از واج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں

از واج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ از واج تو آل محمد میں اصالتہ داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے۔ پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور از واج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی و فاطمہ حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی عباء میں داخل فرما کر فرمایا۔

اللهم هؤلاء اهل بيتي کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

اس سے بعض عقل مندوں نے یہ سمجھا کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ ان کو بھی انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اہل البیت و یطہرکم تطہیرا کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور نے ان حضرات کو عباء میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو دوسرے حضرت علی حضرت ام سلمہ سے اجنبی تھے۔ ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ کو عباء میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا۔ یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔

اصل مدعا کے لئے دلیل اول تولدت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاد داخل ہیں۔

دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قالوا تعجبین من امر اللہ رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اہل البیت انہ حمید مجید۔ (نسوان فی القرآن)

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ

وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ

وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ

اللَّهِ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ١٥

ترجمہ: اسلام والے مرد اور اسلام والی عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے

مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور تھامنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ اور تھامنے والی عورتیں اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت اور یاد کرنے والی عورتیں تیار کی ہے خداوند تعالیٰ نے ان سب مردوں و عورتوں کے لئے مغفرت اور اجر بڑا۔

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے مگر ہر عمل کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ اسی طرح اسلام زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اس کا دل سے ماننا یہ ایمان ہے تو اسلام اقرار ہو اور ایمان تصدیق قلبی یہ تو سب سے مقدم شرط ہے کہ اقرار تو حید و رسالت زبان سے کرے اور دل میں اسکی تصدیق ہو کیونکہ یہ اصول میں سے ہے البتہ اعمال میں آج کل کوتاہیاں کی جا رہی ہیں اس کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک بڑی فہرست ہم کو بتلا دی ہے اس کو کہاں حذف کر دیا گیا۔

عورتوں کو بھی فرماتے ہیں ولقائنا ت (اور تو اضع کرنے والی عورتیں) عورتوں کو تو اضع حاصل کرنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ کمزور کا تکبر اور بھی زیادہ برا ہے۔

آگے فرماتے ہیں والصدقین والصدقات اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں۔ یہ بھی آج کل بہت بڑا مرض لوگوں میں ہو گیا ہے کہ بات بات میں جھوٹ بولتے ہیں اور اگر کبھی سچ بھی کہیں گے تو کسی قدر نمک مرچ لگا کر خصوصاً اگر کوئی عجیب مضمون ہو تو اس پر تو جب تک حاشیہ نہ لگاویں اس وقت تک چین نہیں آتا۔ مگر یہ بہت بڑا مرض ہے اس سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے انسان کے یہاں کذابین میں شمار ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں اسی کا حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ دین کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ فرماتے ہیں

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانت

یعنی اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں۔

معلوم ہوا ہے اسلام و ایمان کے بعد صفت قنوت بھی ضروری ہے جس کے معنی ہیں اطاعت یا عاجزی کے اگر پہلے معنی ہیں تو مراد یہ ہے کہ تمام احکام میں اطاعت کرتے ہیں اور اگر اس کے معنی عجز کے ہیں تو یہ قلب کی اطاعت کا بیان ہوگا جس میں ایک بڑی بھاری گناہ کا علاج ہے جو تمام کبائر کی جڑ ہے یعنی تکبر تمام مفسد دینی اور تمدنی کی جڑ یہی کبر ہے غصہ اور غیبت اور حسد غرض تمام برے اخلاق اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً کسی چمار کو

بادشاہ سے حسد کرتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ وہ غریب اپنے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ بادشاہی کی آرزو کرے۔ جو اپنے آپ کو بادشاہی کے لائق اور قابل سمجھتے ہیں وہی بادشاہوں سے حسد کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام تکبر ہے کہ اپنی طرف کسی کمال کو منسوب سمجھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان تمام مفسد دینی اور تمدنی کی اصلاح کے لئے تواضع اور عاجزی کی تعلیم دی ہے اور تواضع صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو برا بھلا کہہ لے بلکہ تواضع تو یہ ہے کہ دل میں اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

والخشعين والخشعت (اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں) خشوع کہتے ہیں سکون کہ۔ یہ شامل ہے قلب کو اور جوارح دونوں کو اس کو جمعیت قلب و جوارح کہتے ہیں۔ مثلاً نماز میں خشوع ضروری ہے یعنی دل ساکن ہو کہ خیالات ادھر ادھر پریشان نہ ہو اور اعضاء بھی ساکن اور پست ہوں اور دوسرے اوقات میں خشوع اس طرح ہوتا ہے کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار ملا ہو چھچھورا پن نہ ہو۔ بعض لوگ تواضع کے چھچھورے ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کو منع فرماتے ہیں کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار بھی چاہئے۔

والصبرین والصبرات اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اس میں صبر کی تعلیم ہے صبر اس کو نہیں کہتے کہ کوئی مر جاوے تو روئے نہیں۔ رونا تو جائز ہے۔ صبر کہتے ہیں نفس کو اس کی ناگواری پر مستقل رکھنے کو مثلاً کسی نے بری بات کہی تو ہم اس کا انتقام نہ لیں۔ سخت و ست نہ کہیں۔ تو یہ صبر ہے عادات میں اور تکوینیات میں صبر اس کا نام ہے کہ اگر کوئی مر جائے یا مال چوری ہو جائے یا بیماری پیدا ہو جائے تو جزع و فزع نہ کریں اور عبادات میں صبر یہ ہے کہ عبادت میں حظ اور مزہ نہ آئے مگر عبادت کرتے رہیں اس وقت لوگ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں کہ مزہ کے طالب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نہیں۔ اگر عاشق ہوتے تو ان کو لذت عشق ہی کافی ہوتی۔ کسی مزہ کے طالب نہ ہوتے۔ بعض دفعہ لذت عشق ایسی بڑھ جاتی ہے کہ عاشق کو محبوب کے وصال کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔

والمتصدقین والمتصدقات اور صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں صدقہ کا حکم اس لئے فرمایا بعض لوگوں کی نسبت و محبت زبانی ہوتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست ورز طلبی سخن درین ست
(یعنی اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں ہے اور اگر مال مانگو تو اس میں کلام ہے)

زبان سے بہت دعوے کرتے ہیں مگر محبوب کے نام پر خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے محبت ہی نہیں ہے۔ اگر محبوب مجازی گھر مانگتا ہے تو دے دیتے ہیں اور کچھ بھی گھر یا ہر کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ کیسی خدا کی محبت ہے کہ خدا کے نام پر خرچ کرنے میں باوجود وسعت کے سوچتا اور تامل کرتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں خیر خیرات بھی کرتے رہا کرو تا کہ دنیا کی محبت دل سے کم ہو۔ آج کل ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ اگر خرچ کرتے ہیں تو ناموری کی جگہ پر نیک مصرف میں شاید ہی کسی کا پیسہ خرچ ہوتا ہوگا اور جو

نیک مصرف میں خرچ بھی کرتے ہیں تو بہت سے مصارف میں سے ایسا مصرف اختیار کریں گے جس میں فخر و مباہات ہو۔ یہ آج کل کے دینداروں کی کیفیت ہے۔ اخلاص تو آج کل بالکل ہی نہیں رہا الا ماشاء اللہ۔

ایک مخلص کی حکایت

میں نے ایک مخلص کی حکایت سنی ہے کہ وہ ایک عالم کے وعظ میں آئے اور ایک ہزار روپیہ کا توڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لوگوں نے ہر طرف سے تعریف کرنی شروع کی۔ اس نے جو دیکھا کہ ہر طرف سے تعریف ہونے لگی اور دل میں اخلاص نہیں رہا تو تھوڑی دیر میں پھر آیا اور کہا کہ مولانا وہ روپے میری والدہ کے تھے واپس کر دیجئے۔ اب تو لوگوں نے اسے بہت ہی برا بھلا کہا کہ علماء سے تمسخر کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے روپے واپس کر دیئے۔ جب وعظ کی مجلس ختم ہو چکی اور مولوی صاحب اپنے گھر پہنچے تو وہ شخص ان کے مکان پر پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اور بہت تکلیف دی۔ وہ ہزار روپے میرے ہی تھے اس وقت پیش خدمت کرتا ہوں۔

اس وقت چونکہ لوگوں کی تعریف کی وجہ سے اخلاص میں کمی ہوتی تھی اس لئے میں نے واپس کر لئے جس پر لوگوں نے مجھے خوب برا بھلا کہہ لیا اور نفس کی اصلاح ہو گئی اب تنہائی میں یہ روپیہ لے کر حاضر ہوا ہوں ان کو قبول کیجئے۔ خلوص اس کا نام ہے تو صاحبو! صدقات میں اخلاص ضروری ہے۔

آگے فرماتے ہیں والصائمین والصائمات الایۃ اور روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں۔ یعنی اسلام کے لئے ایک اور بھی جزو ہے روزہ رکھنا۔ عورتوں کے اندر یہ تو کمال ہے کہ وہ روزہ بہت شوق سے رکھتی ہیں اور کچھ بہت کمال بھی نہیں کیونکہ ان میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے اس لئے بھوک پیاس کم لگتی ہے اس بارہ میں مرد زیادہ بیٹی ہیں بہت لوگ روزہ نہیں رکھتے اور بعض تو ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ کھلم کھلا سب کے سامنے حقہ اور پان کھاتے پھرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ میں کہتا ہوں کہ پھر بیوی کے ساتھ بھی سب کے سامنے ملا کرو کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ اب لوگوں کی شرم جاتی رہی خدا کا خوف نہیں رہا۔ روزہ کا توڑنا تو گناہ تھا سب کے سامنے توڑنا بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اس سے کھلم کھلا خدا کی مخالفت ہوتی ہے۔ دوسروں کی جرات بڑھتی ہے تو پہلے مرض لازمی تھا اب مرض متعدی ہو گیا۔

آگے ارشاد ہے والحفظین فروجہم والحفظت اور اپنے شرم گاہوں کو حرام سے بچانے والے مرد اور عورتیں شرم گاہوں کا حرام سے بچانا تو عقلاً بھی ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور شریعت نے بھی اس کو فرض کیا ہے اور زنا کو سب برا جانتے ہیں اور شریعت نے بھی اس کو حرام کیا ہے مگر لوگوں نے زنا اسی کو سمجھ رکھا ہے جو مباشرت کے ساتھ ہو حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے ہاتھ سے بھی زنا ہوتا ہے قلب سے بھی ہوتا ہے کان اور پیر سے بھی ہوتا ہے۔ آنکھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو بری نیت سے دیکھنے ہاتھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو ہاتھ لگائے۔ کان کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کی باتیں سنے۔ اس کی طرف چل کر جانا پیر کا زنا ہے۔ دل میں کسی اجنبی عورت کی محبت اور تصور سے مزہ لینا یہ دل کا گناہ ہے۔

مسلمان شخص کو ان تمام گناہوں سے بچنا چاہئے کیونکہ یہ بھی اسی زنا کے مثل ہیں اور اس کی حفاظت پوری طرح بردہ سے ہوتی ہے مگر سخت افسوس ہے کہ آج کل کا نوجوان اس کو بھی اٹھا دینا چاہتا ہے مگر یہ ان کی بڑی بھاری غلطی ہے اگر خدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو بڑی سخت دشواری پیش آئے گی۔

ذکر اللہ کی اہمیت

ان سب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات یعنی اور وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو بہت یاد کرتی ہیں گویا اب تک جتنی باتوں کا بیان تھا وہ سب بمنزلہ درختوں کے ہیں اور یہ ان کے لئے پانی ہے کہ یہ سب درخت ایمان و اسلام و قنوت و خشوع و صدقہ و عفت کب بار آور ہو سکتے ہیں جبکہ ان کو خدا تعالیٰ کی یاد کا پانی پلایا جائے اور یہ تجربہ ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا نیک کیوں نہ ہو مگر اس میں پختگی اسی وقت آتی ہے جب ذکر اللہ بھی کرتا ہو اور اس کے بغیر ایسی مثال ہے جیسے بے جڑ کا پھول کہ اس وقت تر و تازہ ہے مگر تھوڑی ہی دیر میں کھلا جائے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں اعدا اللہ لهم مغفرة واجرا عظیما کہ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم تیار کر رکھا ہے حاصل یہ ہے کہ اپنے دین کو جو درست کرنا چاہے وہ ان باتوں کو حاصل کر لے اس کے بعد مستحق اجر و مغفرت ہوگا (شعب الایمان)

امور معاشیہ میں بھی احکام کی پابندی ضروری ہے

فرمایا کہ احکام نبوت صرف متعلق بہ معاد ہی نہیں ہیں بلکہ ہم کو امور معاشیہ میں بھی ان کا پابند کیا گیا ہے دلیل اس کی ماکان لمومن ولا مؤمنة الخ اور اس کا سبب نزول ہے۔ رہی حدیث تا بیر سو وہ مشورہ تھا نہ کہ حکم اور حدیث بریرہ سے اس تفصیل کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد متعلق نکاح مغیث کے بارے میں عرض کیا کہ آپ سفارش فرماتے ہیں یا حکم۔ آپ نے فرمایا سفارش۔ بریرہ نے کہا مجھ کو قبول نہیں۔ اس سے یہ تفصیل صاف معلوم ہو گئی۔

فروج کا معنی

علیٰ ہذا قرآن میں ہے والحافظین فروجہم اور احصنت فرجہا بعض جہلا اس لفظ کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرم گاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شکاف کے ہیں کنلیہ کبھی شرم گاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے لیکن اصل معنی کے اعتبار سے اس کا استعمال چاک گریباں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ احصنت فرجہا کا ترجمہ یہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی ہیں جس کا مرادف یہ ہے کہ پاک دامن تھیں یہ کتنا نفیس عنوان ہے اس میں بتلائے

کون سا لفظ غیر مہذب ہے اور نفخنافیہ من روحنا کا مطلب یہ ہے ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا ہے جس سے وہ حاملہ ہو گئیں بتلائے اس میں کیا اشکال ہے کچھ بھی نہیں۔

والحفظین فروجہم کا سلیس ترجمہ

فرمایا ایک دفعہ میں نے مستورات میں وعظ کہا اور اس آیت والحفظین فروجہم والحفظت پر پہنچا تو بڑا پریشان ہوا کہ اس کا ترجمہ کیا کروں معاً اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ اپنی آبرو کی حفاظت کرنے والے اور اپنی آبرو کی حفاظت کرنے والیاں یا ناموس کہہ دیا جائے۔ (حسن العزیز ج ۱ ص ۴۳۴)

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ

عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ

وَتُخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ

ترجمہ: اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بی بی (زینب کو) اپنی زوجیت میں رہنے دے اور خدا سے ڈر اور آپ اپنے دل میں وہ (بات بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں (کے طعن) سے اندیشہ کرتے تھے۔

تفسیری نکات

حضرت زینبؓ سے نکاح کے شبہ کا ازالہ

اب یہاں پر بعض لوگوں کو ایک شبہ ہوا ہے وہ شبہ یہ ہے کہ کلام اللہ میں حضرت زینب سے حضور کے نکاح کے واقعہ کے بیان میں ہمارے حضور کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وَتُخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ اور انبیاء کے متعلق ارشاد ہے کہ وَيُخْشَوْنَهُ وَلَا يُخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ اس سے بظاہر اشکال لازم آتا ہے کہ دوسرے انبیاء ہمارے حضور سے اکمل تھے تو جواب اس کا یہ ہے کہ استدلال صحیح نہیں اس لئے کہ دوسرے انبیاء کا حضور سے اکمل ہونا جب لازم آتا کہ جس خشیت کی نفی دوسرے انبیاء سے کی گئی ہے اس خشیت کا اثبات حضور کے لئے کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ نکاح کے متعلق وحی کے نزول سے قبل چونکہ حضور کو اس نکاح کے داخل تبلیغ ہونے کی طرف التفات نہ ہوا تھا بلکہ اس میں محض ایک دنیوی مصلحت حضرت زینب کی دلجوئی اور اشک شوقی کی سمجھی تھی اس لئے لوگوں کی ملامت کے اندیشہ سے اس فعل کو

اختیار نہ فرمایا تھا اور امور دنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں بعض حیثیتوں سے مطلوب ہے جبکہ اعتراض سے دوسروں کی دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو اس کے بعد جب آپ پر اس کے متعلق وحی آئی اور آپ کو اس نکاح کے اندر ایک مصلحت دینیہ بتلائی گئی جس کا ذکر آگے چل کر لکھیلا یکنون علی المومنین حرج الایۃ میں فرمایا گیا ہے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ یہ فعل تبلیغ میں داخل ہے لہذا آپ نے پھر کسی کی ملامت کی پروا نہیں فرمائی اور حضرت زینب سے نکاح فرمالیا تو جس خشیت کا اثبات حضور کے لئے فرمایا گیا ہے وہ خشیت تبلیغ میں نہ تھی بلکہ اول میں اس نکاح کو محض ایک دنیوی امر سمجھ کر اس میں یہ خشیت تھی اور جس خشیت کی نفی دوسرے انبیاء سے کی گئی ہے وہ خشیت فی التبلیغ ہے اور قرینہ اس کا کہ مراد ولا یخشون احدا الا اللہ میں خشیت فی التبلیغ ہے یہ ہے کہ یخشونہ سے اوپر فرماتے ہیں الذین یبلغون رسالت اللہ الایۃ پس نہ حضور کے لئے خشیت فی التبلیغ کا اثبات فرمایا گیا ہے کہ جس سے حضور کے کمال کے اندر نعوذ باللہ کچھ نقص کا شبہ ہو سکے اور نہ دوسرے انبیاء کے لئے ایسے امور مباحہ میں خشیت کی نفی کی گئی جس سے ان کا حضور سے اکمل ہونا لازم آتا پس یہ اشکال دفع ہو گیا اب اس مقام کے متعلق ایک اور شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت زینب سے حضور کے نکاح کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو ایک بار آٹا گوندھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس وقت سے حضور کو ان سے محبت ہو گئی تھی اور بعض اقوال شاذہ غیر مستندہ الی الدلیل صحیح کی بناء پر آیت وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ کی تفسیر محبت سے کی ہے مگر محققین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور حجاب نازل ہونے سے قبل حضور شب و روز ان کو دیکھتے تھے پھر یہ احتمال کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دلیل نفی کی کسی وہمی کے نزدیک کافی نہ ہو تو اس کے لئے نفی دلیل کافی ہوگی یعنی اس دعویٰ محبت کی کوئی دلیل نہیں اور دعویٰ بلا دلیل محض لاشے ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حضرت زینب کے نکاح کی طرف توجہ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حضرت زینب کا نکاح حضرت زید سے حضور کی وساطت سے ہوا تھا پھر اس میں طلاق کا واقعہ پیش آیا اس لئے حضور کو اس کا صدمہ بھی زیادہ تھا کہ میری وساطت سے ان کو یہ تکلیف پہنچی اور حضور حضرت زینب کی کسی طرح دلجوئی کرنا چاہتے تھے اور دلجوئی کا طریقہ اس سے احسن نہیں تھا کہ حضور ان سے خود نکاح کر لیں اس لئے حضور نے ان سے نکاح کرنا چاہا لوگوں کی ملامت کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا تھا مگر پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکاح ہوا۔ پس تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ میں یہی نکاح مراد ہے نہ کہ محبت اور اس کا ایک کھلا قرینہ یہ ہے کہ ایک مخفی چیز کو اس عنوان سے ارشاد فرمایا ما اللہ مبدیہ اس سے معلوم ہوا کہ اخفاء اس چیز کا ہوا کہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ ابداء فرمایا ہے اور ابداء نکاح کا ہوا ہے قولاً بھی جو زوجہ نکھا میں ہے اور فعلاً بھی اور وہ وقوع نکاح ہے پس معلوم ہوا کہ جس چیز کا اخفاء ہوا تھا وہ نکاح تھا کہ محبت تو تخفی فی نفسک میں مراد نکاح ہے نہ کہ محبت۔

و فی قصۃ زینب ہذا اشکال قد یختلج فی بعض الاذهان ارید ازاحتہ بما افاض اللہ علینا من برکات الشیخ ادام اللہ مجدہ، تقریر الاشکال ان اللہ تعالیٰ قال فی حقہ علیہ الصلوۃ والسلام و تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ و تخشی الناس واللہ احق ان تخشاه اثبت فیہ خشیۃ الناس فی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال فی حق غیرہ من الانبیاء والرسل الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ اظهر فیہ ان رسل اللہ کانوا لا یخشون احداً غیر اللہ و هذا یقتضی بظاہرہ فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی هذا الوصف بعینہ واجاب عنہ الشیخ بمالضہ ان معنی الآیۃ انک یا محمد انما تخشی الناس فی هذا الامر لعدم علمک بان هذا النکاح من قبیل تبلیغ الرسالۃ عملاً ولو علمت ذلك لم تخش احداً بان اللہ احق ان تخشاه فی ترک التبلیغ ولو علمت کونہ من التبلیغ لفعلت کما کان الرسل تفعلہ من انہم کانوا یبلغون رسالات اللہ یخشونہ ولا یخشونہ احداً الا اللہ فاندفع الاشکال راساً و اساساً کان صلی اللہ علیہ وسلم کسائر الانبیاء بعد علمہ بکون هذا النکاح من تبلیغ رسالات اللہ عملاً فبا درالی النکاح ولم یخش احداً الا اللہ وانما خشی عن الناس و طعنہم فی الدین ما لم یعلم کونہ من تبلیغ الرسالات واما بعد ذلك فلا فلم یثبت من الآیۃ خشیۃ صلی اللہ علیہ وسلم عن الناس فی تبلیغ الاحکام حتی یلزم فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ بل غایۃ ما ثبت ان کان یخشى الناس قبل علمہ بکون ذلك من جملة التبلیغ و بعد علمہ بہ کان کسائر الرسل ۱۲ جامع (تقلیل الاختلاء)

وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ط

ترجمہ: اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

تفسیری نکات

عوام کی رعایت کو سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے

فرمایا عوام کی رعایت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی چنانچہ حکیم کو کعبہ کے اندر داخل نہ فرمانے کی حدیث میں ارشاد ہے لولا قومک حدیث عہد بانی ہلیۃ تو دیکھئے کہ آپ نے لوگوں کو تشویش میں پڑنے سے بچایا مگر جہاں اس پر عمل کرنے کی ضرورت یا مصلحت قوی ہوتی ہے وہاں عوام کی رعایت نہیں کی جاتی جیسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں۔

حضور کے لوگوں کو تشویش سے بچانے سے پرہیز فرمایا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کی رعایت نہ فرمائی تو یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ کس جگہ عوام کی رعایت کرنا چاہیے اور کس جگہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے۔ میری رائے میں تو جہاں رعایت کرنے میں دین کا کچھ نقصان ہو وہاں عوام کی رعایت نہ ہونا چاہیے اور جہاں رعایت کرنے میں دین کا نقصان نہ ہو اور رعایت نہ کرنے میں تشویش ہو جائے وہاں عوام کی رعایت کرے۔ تو حطیم کے واقعہ میں کوئی دین کا نقصان نہ تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں تبلیغ میں کوتاہی ہوتی تھی کیونکہ وہ تبلیغ عملی تھی اور ضروری تھی البتہ اس کا تبلیغ ہونا قدرے خفی تھا۔ اس لئے اولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن مبارک اس طرف نہیں گیا اس لئے آپ نے عوام کی رعایت کا خیال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے اس کا تبلیغ ہونا معلوم ہو گیا۔ پھر آپ نے عوام کی پرواہ بھی نہیں کی اور یہاں سے حضرت زینب کے عقد کے متعلق جو ایک شخص نے اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب بھی ٹھیک سمجھ میں آ گیا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ اس قصہ کی آیت میں ارشاد ہے تَخَشُّوا النَّاسَ إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ لوگوں سے ڈرتے ہیں اور دوسرے انبیاء نہیں ڈرتے تھے تو جواب یہ ہے کہ آیت کا مدلول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ میں نہ ڈرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی تبلیغ میں نہیں ڈرے اور اس میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ڈرے تو اس وقت آپ کے ذہن مبارک میں صرف نکاح کا معاملہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تبلیغ کا فرد نہیں سمجھا تھا مگر حق تعالیٰ کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تبلیغ کا ایک فرد ہے پھر ڈرانا ثابت نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۱۹۸ تا ۱۹۹)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

تفسیری نکات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے روحانی والد ہیں

بلکہ اس سے تو ابوة کی نفی مستتبہ ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے ان شاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا کہ اس سے نہایت صاف طور سے ابوة حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے۔ اول ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا

جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آگیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمائیے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے کہ باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے حالانکہ تضاد ہونا چاہئے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ تَوْاسٍ شَبَّهَ هُوَاكَ جَبَّ حَقَّ تَعَالَىٰ نَعْنَى ابُوَّةِ كِي نَفِي فَرَمَادِي تَوْ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوں گے اس لئے آگے لکن سے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں کہ تمہاری روحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول کی دلالت معنی ابوة پر معتبر نہ کی جائے تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔

ازواج مطہرات مومنین کی مائیں ہیں

اس لئے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہے وازواجه امہاتہم یعنی نبی کی ازواج مطہرات مومنین کی مائیں ہیں تو آپ ظاہر ہے کہ باپ ہوئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سچا جانشین وہی ہوتا ہے جو باپ کے قدم بقدم ہو ورنہ اس کو فرزند ہی نہیں کہتے پس سچے جانشین اولیاء اور علماء امت ہوئے۔

یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں تو حضور کے ابوة کی نفی فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ جَوَابُ يَہ کہ اسی آیت سے ابوة حضور کی معلوم ہوتی ہے اور وہ بہت لطیف بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔ اور اہل علم کو معلوم ہے کہ لکن استدراک یعنی تو ہم ناشی من الکلام السابق کے دفع کرنے کے لئے ہوتا ہے اور یہاں بظاہر کوئی شبہ معلوم نہیں ہوتا جس کا لکن سے دفعیہ مقصود ہو۔ بجز اس کے کہ تقریر آیت کی یہ ہو کہ جب ارشاد ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں تو شبہ ہوا کہ کیا نستہی باپ نہیں تو اور کسی قسم کے بھی باپ نہیں جو علی الاطلاق ابوة کی نفی کی گئی۔ تو اس شبہ کا دفع ہے کہ ہاں! لیکن روحانی باپ ہیں یعنی رسول ہیں اس لئے کہ روحانی تربیت کرتے ہیں قال

آں خلیفہ زادگان مقبلش زادہ انداز عنصر جان و دلش

یعنی آپ کے شاہزادے بلند اقبال آپ کے عنصر خاکی سے نہیں ہیں یعنی نسبی اولاد مراد نہیں ہے بلکہ آپ کے روح و دل کے مبارک عنصر سے ہیں یعنی روحانی اولاد ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۖ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً

وَأَصِيلًا ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام (یعنی علی الدوام) اس کی تسبیح و تقدیس کرتے رہو۔

تفسیری نکات

کثرت ذکر اللہ کا حکم

یایہا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر اتنے معنوں کو حاوی ہے کہ ہمارا کوئی مرض چھوٹا یا بڑا، خفی یا جلی ان سے باہر نہیں فرداً فرداً ہر ایک کا کافی علاج نکلتا ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ وہ علاج کیا ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوا وہ ذکر اللہ ہے ذکر کے معنی لغت میں ہیں یادداشتیں اس کا مقابل ہے نسیان یعنی بھول جانا۔ یاد رکھنا دو طرح پر ہوتا ہے ایک صوری اور ایک حقیقی۔ صوری زبان سے یاد کرنے اور نام لینے کو کہتے ہیں سبق یاد کر لو یعنی بار بار زبان سے پڑھو اور حقیقی کہتے ہیں اداء حقوق کو ہمارے عرف میں بھی بولا جاتا ہے (تم نے ہمیں بھلا دیا) مراد یہ ہوتی ہے کہ تم ہم سے میل نہیں رکھتے اور ہمارے ساتھ سلوک نہیں کرتے چاہے مخاطب زبان سے یاد کر بھی لیتا ہو جب بھلانے کے معنی ہوئے حقوق ادا نہ کرنا تو اس کے مقابل ذکر کے معنی ہوئے حقوق ادا کرنا یہ ایسی اصطلاح ہے جس سے ہر شخص واقف ہے کچھ شرح اور ثبوت کی ضرورت نہیں تو ذکر اللہ بالمعنی الاخیر کا ترجمہ ہوا اداء حقوق اللہ ذکر اللہ حقیقی اور ذکر اللہ کا فرد کامل یہی ہے ذکر لسانی بھی ذکر اللہ کا ایک فرد ہے مگر ناقص اور صرف صوری ہاں اگر دونوں جمع ہو جائیں یعنی اداء حقوق کے ساتھ ذکر لسانی بھی ہو تو سبحان اللہ درجہ اکمل ہے غرض اس آیت میں ذکر اللہ کو ہمارے مرض کا علاج قرار دیا گیا ہے اجمالاً سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ذکر اللہ کتنے معنوں کو حاوی ہے اگر آپ غور سے دیکھئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ کوئی خیر دنیا و آخرت کی نہیں جو اس میں نہ آگئی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ حقوق اللہ کی بہت قسمیں ہیں جیسے عقائد اعمال، اخلاق، معاملات حقوق الناس۔ حقوق الناس کے لفظ پر کوئی صاحب یہ شبہ نہ کریں کہ حق العبد اور چیز ہے اور حق اللہ اور چیز۔ وہ بندوں کی طرف منسوب ہے وہ اللہ کی طرف اور دونوں کے احکام میں فرق ہے۔ حق اللہ توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے اور حق العبد توبہ سے معاف نہیں ہوتا۔ (اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا بڑی سہولت ہوتی کسی کا مال چھین لیا، ہضم کر لیا پھر توبہ کر لی) حق العبد میں صاحب حق کے معاف کرنے کی ضرورت ہے حتیٰ

کہ حج اور شہادت سے بھی اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا پس جب حقوق العباد ہیں حقوق اللہ تو تم نے اس کو اور قسم کیسے بنا دیا حل اس شبہ کا یہ ہے کہ پوچھا ہے کہ بندوں کے حقوق کہاں سے پیدا ہوئے بندہ خود مخلوق اور مملوک ہے ان کے حقوق اس کے پیدا کردہ تو ہو نہیں سکتے دوسرے کے عطا کردہ ہوں گے حق تعالیٰ کے حقوق العباد وہ حقوق ہوئے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر دیا ہے نظیر اس کی یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ گھر فلاں شخص کا ہے ظاہر ہے کہ کہنے والی کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس کی ذاتی ملک ہے بلکہ ملک حقیقی تو حق تعالیٰ کی ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کو مالک بنا دیا ہے اس سے حق تعالیٰ کی ملک سے گھر نہیں نکل گیا حالانکہ تمام حقوق مالکانہ اسی شخص کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسی طرح حقوق العباد حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حقوق مقرر ہوئے اور حکم دیا گیا ہے اعظوا کل ذی حق حقه اور یا ایہا الذین امنوا اوفوا بالعقود (اے ایمان والو معاہدوں کو پورا کرو) حقوق العباد ادا نہ کرنا اس کی مخالفت ہے جو امر اللہ ہے اور امر اللہ کی مخالفت ہی عصیان اور اضااعت حق اللہ کی ہے تو حقوق العباد بھی دراصل حقوق اللہ ہیں۔ یہ سب قسمیں ہیں حقوق کی اور شریعت ان ہی حقوق کی شرح ہے۔ (تفصیل الذکر ص ۶ تا ص ۸)

صبح و شام ذکر الہی کا مفہوم

اس میں تو صبح و شام ذکر کرنے کو بتلایا ہے نہ کہ ہر لحظہ۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف صبح اور شام ذکر کرو اور باقی اوقات میں خالی رہو بلکہ محاورہ ہے کہ اس کام کو ہر وقت کرنا مقصود ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ رات دن کرتے رہو۔ ذکر ضدین سے غصوا استیعاب اس جنس کا ہوتا ہے اور ذکر صرف یہی نہیں ہے کہ پس تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا بلکہ لا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ (یعنی زنا کے پاس نہ پھٹکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے) پر عمل کرنا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ یہ بھی فرمایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا۔

اس پر عمل کرنے کو یوں سمجھو کہ لا تقربوا کے معنی یہ ہیں کہ زنا کرنا تو بہت بری بات ہے تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ یعنی جو چیزیں دوائی زنا ہیں ان کی طرف بھی متوجہ نہ ہو۔ مثلاً نگاہ کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو قلب کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو۔ اسی طرح ہر وقت اس وقت کے احکام عامہ و خاصہ کا اہتمام رکھو۔ اس پر وگرام کے منضبط ہو جانے کے بعد اب بتلائیے کہ غیبت کا کونسا وقت ہے۔ جھوٹ بولنے کا کونسا وقت ہے۔ ہارمونیم بجانے کا کونسا وقت ہے۔ گراموفون سننے کا کونسا وقت ہے۔

اعتدال شریعت

ہاں البتہ شریعت تنگ نہیں ہے۔ اجازت ہے کہ ورزش کیجئے۔ اجازت ہے کہ ہنسے بولے بات کیجئے یہاں

تک اجازت ہے اگر وظیفہ پڑھتے پڑھتے تھک جائے تو چھوڑ دو۔ باہر بیٹھ کر ہنس لو بول لو مگر ناجائز بات مت کرو۔ شریعت میں یہ تعلیم نہیں کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ بچوں کو عاق کر دو۔ اور بس ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ کرنے لگو۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝۱۵

عِيَّا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝۱۶

ترجمہ: اے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنین کو بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کے) ڈرائیو والے ہیں اور سب کو اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک روشن چراغ ہیں۔

تفسیری نکات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص صفت کی تشبیہ کا مفہوم

(اس آیت مبارکہ میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص صفت میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و اکمل ہونا لازم نہیں البتہ واضح و اشہر ہونا ضروری ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چراغ سے تشبیہ دینے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ اس صفت میں چراغ آپ سے افضل ہے۔ یہاں سے یہ اشکال بھی مرتفع ہو گیا جو بہت لوگوں کو صفحہ صلوٰۃ اللہم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم میں پیش آیا کرتا ہے کہ اس میں حضور پر صلوٰۃ کو ابراہیم علیہ السلام کے صلوٰۃ سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے ابراہیم علیہ السلام کی صلوٰۃ کی افضلیت لازم آتی ہے۔ اس اشکال کا منشا یہ ہے کہ تشبیہ کے لئے مشبہ بہ کا افضل ہونا لازم سمجھا جاتا ہے مگر یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ تشبیہ کے لئے افضلیت مشبہ بہ کا لزوم ہی غلط ہے بلکہ اس کے لئے محض مشبہ بہ کا اشہر و واضح ہونا لازم ہے افضل ہونا لازم نہیں۔ تتبع موارد استعمال سے اس کی تائید ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر خود اپنے نور کو مصباح سے تشبیہ دی ہے حالانکہ یہاں مشبہ بہ کی افضلیت کا وہم بھی نہیں ہو سکتا فرماتے ہیں

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاجة الزجاجة کانہا کوکب دری یوقد من شجرة مبارکة زيتونة لا شرقية ولا غربية یکاد ذیتها یضیء ولولم تمسسه نار نور علی نور

گو یہاں مصباح کی بہت کچھ تقویت کی گئی ہے کہ چراغ شیشہ کے (گلاس کے اندر) ہے اور وہ ایسا چمکدار ہے جیسے روشن ستارہ اور اس چراغ میں تیل بھی زیون کا ہے اتنا عمدہ کہ آگ لگنے سے پہلے ہی بھڑکنا چاہتا ہے لیکن گو وہ کتنا قوی ہو حق تعالیٰ کے نور سے اس کو کیا نسبت۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مشبہ بہ کے لئے مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں۔ گو اتفاق سے زید اسد میں اسد زید سے زیادہ ہی بہادر ہو اور واقعی اس جانور کو خدا تعالیٰ نے قوت و شجاعت بہت زیادہ دی ہے اور عجب نہیں ایسی ہی جزئیات سے لوگوں کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہو کہ مشبہ بہ کو مشبہ سے افضل ہونا چاہیے مگر حقیقت میں یہ لازم نہیں، ورنہ نور مصباح کو نور خداوندی سے افضل کہنا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ مشبہ بہ کا صرف اشہر و اوضح ہونا ضروری ہے (افضلیت ضروری نہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ غائب از نظر ہیں کوئی شخص ان آنکھوں سے دنیا میں ان کو نہیں دیکھ سکتا اس لئے خدا کا نور اشہر نہیں اور نور مصباح اشہر ہے اس وجہ سے ان کو نور مصباح سے تشبیہ دے دی گئی ہے۔ خدا کے نور کی تو بڑی شان ہے۔ لوگ عالم کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ حضرت تو روشن چراغ ہیں۔ اس میں بھی ان کو یہ وہم نہیں ہوتا کہ چراغ نور میں ان سے افضل ہے مگر چونکہ یہ چراغ کوئی بھی خالی از نور نہیں دیکھا گیا اس لئے اس کا نور اشہر ہے اور بشر بعض ظلمانی ہیں، بعض نورانی، اس لئے اس کا منور ہونا محتاج دلیل ہے تو اس کا منور ہونا اشہر نہیں۔

مشبہ بہ کا مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں

اس تفصیل سے یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ مشبہ بہ کے لئے مشبہ سے افضل ہونا لازم نہیں صرف اشہر و اوضح ہونا ضروری ہے۔ پس حضور کو سرانج منیر فرمانے سے افضلیت سراج کا مشبہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبیہ روشن چراغ فرمایا گیا ہے۔ تو بناء بر اصول تشبیہ جو خاص وصف چراغ میں ہے وہ آپ میں ہونا لازم ہے۔

حضور ﷺ کو آفتاب یا چاند سے تشبیہ نہ دینے کی وجہ

اور اسی سے یہ بھی دفع ہو جائے گا کہ آفتاب یا ماہتاب سے حضور کو کیوں نہ تشبیہ دی گئی حالانکہ آفتاب تمام منیرات میں روشن تر ہے اس کے سامنے نہ چاند کی کوئی حقیقت ہے نہ چراغ کی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں حرارت اور تیزی زیادہ ہے جس کی وجہ سے کوئی اس پر نگاہ نہیں جما سکتا اس لئے اس سے تشبیہ نہیں دی گئی تو پھر چاند سے تشبیہ دے دی جاتی۔ چراغ سے تو وہ بدرجہا زیادہ ہے۔ وجہ دفعہ یہ ہے کہ چراغ میں ایک خاص صفت ایسی ہے جو نہ آفتاب میں ہے نہ ماہتاب میں اس لئے حضور کو چراغ روشن فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ چراغ میں تین صفتیں ہیں۔

۱- ایک اس کا خود روشن ہونا۔

۲- دوسرے اپنے غیر کو روشنی دینا کہ چراغ کی وجہ سے دوسری چیزیں ظلمت سے نور میں آ جاتی ہیں۔
ان دو صفتوں میں چراغ اور آفتاب و ماہتاب سب شریک ہیں۔ اور یہ دو وصف آفتاب میں بے شک
چراغ سے زیادہ ہیں۔

۳- تیسری صفت چراغ میں یہ ہے کہ اس سے دوسرا چراغ اسی کے مثل روشن ہو سکتا ہے چنانچہ ایک
چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

یہ صفت خاص چراغ ہی میں ایسی ہے کہ آفتاب و ماہتاب میں نہیں ہے۔ کیونکہ آفتاب سے دوسرا
آفتاب اور ماہتاب سے دوسرا ماہتاب روشن نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آفتاب و ماہتاب دوسری چیزوں کو
منور (باسم المفعول) تو کر دیتے ہیں مگر منور (باسم الفاعل) نہیں کرتے اور چراغ دوسری اشیا کو منور بھی کرتا
ہے اور منور بھی کر دیتا ہے اس لئے حضور کو آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ چراغ روشن فرمایا گیا۔
تو چراغ کی طرح آپ میں بھی علاوہ خود نورانی ہونے کے دو صفتیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ دوسروں کو منور
کرتے ہیں دوسرے یہ کہ آپ بعضوں کو منور بنانے والے ہیں۔ پہلا کمال آپ کا امت میں ظاہر ہوا۔ اور دوسرا
کمال انبیاء علیہم السلام میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام آپ سے فیض حاصل کرتے ہیں جو مستقل چراغ ہو
گئے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کر لیا جاوے تو وہ بجائے خود مستقل منور ہو جاتا ہے یہی شان انبیاء علیہم
السلام کی ہے۔ امت کی یہ حالت نہیں کیونکہ امتی کے اندر جو نور آپ کے واسطے سے آتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں۔
پس آپ انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے لئے بمنزلہ واسطہ فی الثبوت کے ہیں کہ ذی واسطہ بھی اس
کمال کے ساتھ موصوف حقیقتہ ہو جاتا ہے اور واقع میں وہاں دو صفتیں ہوتی ہیں۔ ایک واسطہ کی اور ایک ذی
واسطہ کی اور امتیوں کے لئے بمنزلہ واسطہ فی العروض کے ہیں ذی واسطہ حقیقتہ اس کمال کے ساتھ موصوف ہی
نہیں ہوتا محض مجاز امتصف ہوتا ہے کیونکہ وہاں واقع میں ایک ہی صفت ہوتی ہے صرف واسطہ میں اور ذی
واسطہ میں کوئی صفت ہوتی ہی نہیں۔ اسی طرح امتیوں میں واقع میں صفت تنویر کی ہے ہی نہیں وہ حضور کی صفت
ہے کہ امتیوں کی طرف مجازاً منسوب کر دی جاتی ہے بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ واقع میں بھی ان میں تنویر
کی صفت ہو جاتی ہے گو آپ ہی کی برکت سے تھی۔

رہا یہ کہ حضور سے جمیع کمالات میں انبیاء علیہم السلام کو فیض پہنچنے کی کیا دلیل ہے۔ تو ہم کو اس کے دلائل بتلانے
کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ اہل تحقیق کا اجتماعی ہے مگر تقریب فہم کے طور پر بتلانے کا کچھ حرج بھی نہیں۔

جامع کمالات

سو ایک مقدمہ اول سمجھنا چاہئے کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور اس کی ایک دلیل تو

یہ ہے کہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کے فضائل میں گفتگو کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ و کلمۃ اللہ بنایا و علیٰ ہذا۔ اور اس گفتگو میں صحابہ کا یہ مقصود نہ تھا کہ انبیاء کو آپ پر فضیلت دیں بلکہ غالباً وہ یہ چاہ رہے تھے کہ جس طرح ہم کو ان انبیاء کے خاص اوصاف معلوم ہیں اسی طرح یہ بھی معلوم کریں کہ ہمارے حضور میں خاص صفت کیا ہے جس کی وجہ سے آپ سب انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابہ اسی گفتگو میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری گفتگو سنی۔ واقعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ و کلمۃ اللہ ہیں الا ان صاحبکم حبیب اللہ اس واقعہ میں یہ تو ضرور ہے کہ حضور نے اپنی یہ خاص صفت اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے بیان فرمائی ہے۔

محبت اور خلت میں فرق

چنانچہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ لغت میں تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت میں خلت کا درجہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ محبت کا اطلاق تو تھوڑی محبت پر بھی ہو سکتا ہے مگر خلت کا اطلاق جہی ہوتا ہے جبکہ محبت خلل قلب یعنی اندرون قلب میں پہنچ جائے جس کو متبنی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے

عذل العود اذل حول قلب التاء ہ وھوی الاحبتہ منہ فی سودائہ

پس خلت اس درجہ کی محبت کا نام ہے جو سویدائے قلب میں پیوستہ ہو جائے۔ تو اب حضور کا یہ فرمانا کہ میں حبیب اللہ ہوں ابراہیم علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ وہ خلیل اللہ ہیں اور خلت کا درجہ محبت سے بڑھا ہوا ہے۔

اس اشکال کے جواب میں لوگوں نے مختلف تقریریں کی ہیں مگر سہل جواب یہ ہے کہ اس جگہ آپ نے محبت کا اطلاق معنی لغوی کے اعتبار سے نہیں فرمایا ہے بلکہ محاورات کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ پس لغت گو خلت محبت سے بڑھی ہوئی ہے لیکن استعمال و اطلاق محاورات میں گو محبت خلت سے بڑھی ہوئی نہ ہو مگر حبیب کا صیغہ خلیل سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خلیل تو جس طرح معشوق کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق عاشق پر بھی آتا ہے بخلاف حبیب کے کہ اس کا اطلاق محض معشوق پر ہوتا ہے عاشق پر حبیب کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کو محبت کہتے ہیں پس خلیل اللہ و حبیب اللہ میں یہ فرق ہوا کہ خلیل اللہ خدا کے عاشق کو بھی کہہ سکتے ہیں اور معشوق کو بھی اور حبیب اللہ صرف محبوب ہی کو کہیں گے۔ (گو جو خدا کا محبوب ہو گا وہ محبت بھی ضرور ہو گا) مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں محبوبیت کی شان ابراہیم علیہ السلام سے بڑھی ہوئی ہے۔

حضور ﷺ میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضور میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے تو اب عادات پر نظر کی جائے گی عادت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا محبوب ہوتا ہے تو محبت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو چیز بھی عمدہ ہو اور محبوب کو دی جاسکتی ہو وہ اس کو ضرور دیتا ہے۔ دی جاسکتی ہے کی قید میں نے اس لئے بڑھائی تاکہ کوئی صاحب اس دلیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب و خواص الوہیت کو نہ ثابت کرنے لگیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ گفتگو ان امور میں ہے جو محبوب کو دیئے جاسکتے ہوں اور خواص الوہیت کا عطا بشر کو محال ہے (ورنہ یہ بھی ممکن ہوگا کہ حق تعالیٰ کسی کو خدا بنادیں حالانکہ اس کے امکان کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یقیناً جتنے کمالات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے ہیں وہ سب عمدہ ہیں اور قابل عطا ہیں۔ تو اس قاعدہ عادیہ کی بناء پر جو کہ بمنزلہ لازم عقلی کے ہیں حق تعالیٰ نے وہ سب کمالات حضور کو کیوں نہ عطا فرمائے ہوں گے۔ پس ثابت ہوگی کہ جو کمالات جملہ انبیاء میں منفرداً منفرداً موجود ہیں وہ سب حضور میں مجمعا موجود ہیں۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور چونکہ یہ مقدمات اقناعیہ ہیں اس لئے اگر ان پر کچھ عقلی اشکایات واقع ہوں تو مضرت نہیں۔ کیونکہ مقدمات اقناعیہ سے سامعہ کی تسلی کر دینا مقصود ہوتا ہے اس سے الزام مقصود نہیں ہوتا۔ لہذا اس مقصود پر مقدمات عادیہ سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور چونکہ اصل مقصود ان مقدمات پر موقوف نہیں لہذا ان کا اقناعی ہونا اصل مقصود میں بھی مضرت نہیں۔

شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنان مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ حضور میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں۔ حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا۔ چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے۔

یزیدک وجہہ حسنا اذا مازدته نظراً

(الرفع والوضع ملحقہ مواظ میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۹۶ تا ۴۰۱)

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۵۶﴾

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیج دیا کرو

تفسیری نکات

درود شریف پڑھنے کا اجر و ثواب بلا استحقاق ہے

جو ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے حق تعالیٰ اس پر دس بار صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں (یعنی رحمت خاص فرماتے ہیں) اور دس نیکیاں اس کو ملتی ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ دس گناہ معاف ہوتے ہیں یہ صلہ دانت گھسائی ہے انسان اللہ میاں سے دانت گھسائی بھی وصول کرتا ہے۔ ورنہ واقع میں درود میں اس کو ثواب کا کیا حق تھا کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان تھوڑی ہی کیا کرتا ہے جو ثواب کا استحقاق ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود کی کیا احتیاج ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر درود بھیجتے ہیں چنانچہ خود نص میں ارشاد ہے ان اللہ و ملائکته یصلون علی النبی (بلا شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں) اس میں خود اشارہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تمہارے درود کی ضرورت ہے نہیں آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کا درود کافی ہے اور مخلوق میں سے مقدس جماعت ملائکہ کا درود کافی ہے باقی تم کو جو صلوٰۃ و سلام کا امر کیا گیا ہے اس میں تمہارے لئے یہی بات کافی تھی کہ تم کو اس کام میں شریک کر لیا گیا جو خدا تعالیٰ اور ملائکہ کرتے ہیں اور ثواب مزید برآں مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کفایت صلوٰۃ حق کو ایک قطعہ میں خوب ظاہر فرمایا ہے۔

خدا در انتظار حمد مانیت محمد چشم بر راہ ثنا نیست
محمد حامد حمد خدا بس خدا مدح آفریں مصطفیٰ بس

یعنی نہ حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کافی ہے بس اب ہم جو حق تعالیٰ کی ثناء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کرتے ہیں اس سے مقصود اپنا ہی فائدہ ہے اسی کو آگے فرماتے ہیں کہ جیسا اپنا فائدہ مد نظر ہے تو بس مناجات کر لو۔

منا جاتے اگر خواہی بیاں کرد یہ بیٹے اکثفا خواہی تو اں کرد

(اگر کوئی مناجات بیان کرنا چاہتے ہو تو ان دو بیتوں پر اکتفا کرو) آگے کیا اچھی مناجات ہے
 محمد از قوی خواہم خدا را الہی از تو حب مصطفیٰ را
 کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہم خدا کی محبت مانگتے ہیں اور اے اللہ آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 محبت مانگتے ہیں۔ بس خدا نے دیا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا یعنی خدا کا پتہ دیا تو
 خدا سے رسول کی محبت مانگو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کی معرفت مانگو یہ مناجات کافی ہے۔ میں یہ کہہ
 رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبہ شکر کو
 پورا کرتے ہیں اب اس پر ثواب ملنا یہ محض دانت گھسائی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس دانت گھسائی پر مجھے ایک قصہ یاد آیا
 ڈھا کہ میں ایک پیرزادہ صاحب اپنے باپ کے مریدوں میں گئے ایک رئیس نے ان کی دعوت کی اور دعوت کے بعد
 پچاس روپیہ نذرانہ میں دیئے پیرزادہ نے روپے پھینک دیئے کیا ہم اس لائق ہمیں ہمارا نذرانہ دو سو روپے سے کم
 نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے یہ حکایت سن کر کہا کہ دعوت کے بعد نذرانہ پر اتنا تکرار کیا؟ ایک ظریف نے کہا کہ یہ
 دانت گھسائی ہے کیونکہ لقمہ چبانے میں تو دانت گھستا ہی ہے (عصم الضوف عن غم الانوف)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ يُصْلِحْ

لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿۵۱﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو۔ اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں)
 تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول
 (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

تفسیری نکات

مشقت اور الجھن دفع کرنے کا طریق

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر
 لفظوں میں ارشاد فرمایا اس آیت کریمہ میں جو میں نے تلاوت کی ہے اسی طریقہ کا بیان یہ حاصل ہے اس تقریر
 کا اجمال اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور

محوذنوب اور ان میں بھی گرانی اس کی سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولوا قولاً سدیداً ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں یصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقویٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کر لو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں ان کو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے پھر اس کو طریق ایک بتلا دیا جاوے کہ اسی میں انجن لگا دو سب گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گی واللہ العظیم ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل اس کے مثل نہیں لاسکتا یہ ایک مطلب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ پھوں سے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس کو دیکھ کر علاج تجویز کیا۔

خشیت الہی پیدا کرنے کی ضرورت

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ طریق اصلاح اعمال و محوذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کر لو تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے اتقوا اللہ و قولوا قولاً سدیداً کے یوں فرماتے یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ یسدد لکم انکم و یصلح لکم اعمالکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ و قولوا قولاً سدیداً کا اتقوا اللہ پر عطف کیا اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔

ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں پاؤں تھک جاتا ہے کثرت سے چلنے سے ہاتھ تھک جاتا ہے ان اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کر تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بکثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کو فی نفسہ کوئی تکان نہ ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے پس گناہ بھی

اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے درمیان قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی اور یہ مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من وجہ و مکشوف من وجہ ہے چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نکلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں اس مستور ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف سے جو ف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہوا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جاوے اس کے ہاتھ سے نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ تکرار ہوگا اس لئے کہ زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہوگی اذا اصبح ابن ادم فان الاعضاء كلها تكفرا للسان فتقول اتق الله فينا فاننا نحن بك فان استقممت استقمنا وان اعوججت اعوججنا یعنی جس وقت ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہوگی ہم سب کج ہو جاویں گے۔

تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معبر ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہوتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہوگا کہ یہ شخص کیسا ہے زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا احمق دشمن ہے یا دوست خیر خواہ ہے یا بدخواہ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب شبہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ قاتل دشمن ہی تھا۔ ممکن ہے کہ دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرے بھائی کی آنکھ میں ایک چہرہ جا لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق متعین کرنے کے لئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب قلب کی ہے۔

چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہوگا وہ بدولت زبان کے ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہوگا اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں قرآن شریف کسی نے پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس

کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ اور ان بتلانے سکھانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کے کی گئی ہے تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں دخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں۔

جبکہ دیگر جوارح اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریق اصلاح کا بنادیا اگرچہ تقویٰ سے جو درستی ہوگی درستی لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گزشتہ گناہ محو ہو جائیں گے۔

اور یصلح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ناز مت کرو جو کچھ کرتے ہیں اور خیر اگر کچھ ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یصلح کا یعنی یہ کہ جیسے چاہئے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کے لئے فرشتوں کی معرفت پیش کرادیں گے جیسے بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شے اٹھالو اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا دیتے ہیں اس اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اتقوا اللہ الخ پر مرتب فرمائی وہ یغفر لکم ذنوبکم ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے یغفر لکم ذنوبکم کے یجنبکم ذنوبکم فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو یصلح لکم میں آچکا ہے ذنوب ماضیہ باقی تھی ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بخوف مادیں گے۔

خوف حاصل ہونے کا طریقہ

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گر اور میرے تمام وعظ کا گویا خلاصہ ہے اور وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے ولتنظر نفس ما قدمت لغد یعنی ذکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلا ناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاذ کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو

کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہوگا سب سامان مال اسباب باغ نوکر چاکر اولاد بیٹا بیٹی ماں باپ بھائی خولیش اقارب دوست دشمن سب یہیں رہ جاویں گے میں تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جالیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدا نخواستہ ڈراؤنی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آکر سوالات کریں گے پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہوگا تیرے اعمال ہی وہاں کام آویں گے اگر سوالات کے جواب درست ہو گئے سبحان اللہ جنت کی طرف کی کھڑکی کھل جاوے گی اور اگر خدا نخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرة من حفرة النار ہوگی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جائے گا اور اعمال نامہ اڑائے جاویں گے حساب کتاب کے لئے پیش کیا جاوے گا پل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکہ میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غم خواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ چند ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا اور خوف پیدا ہونے کے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہوگی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی اس وقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و محو ذنوب مرتب ہو گئے آگے فرماتے ہیں ومن يطع الله ورسوله فقد فاز فوزاً عظيماً یعنی جو شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا بطبع میں اشارہ ہے جو کہ شخص خوشی سے کہنا مانے اس لئے کہ یہ طلوع سے متعلق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدوین محبت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتا۔

محبت الہی حاصل ہونے کا طریقہ

اور اللہ کی محبت کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنا ہے اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سرتاسر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بطبع کا تعلق آپ سے بھی ہے آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو جب محبت پیدا ہوگی۔ اطاعت خوشی سے ہوگی ادھر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا یہ دونوں شے آپ کے دین دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اصلاح اعمال کی توفیق عطا فرماویں و صلی اللہ تعالیٰ علی

خیر خلقہ محمداً و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ والسلام (تہذیب الاملاح ص ۱۳۱ تا ۲۰)

فَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَ يُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ مَنْ يَطْعِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں ایک کارآمد مضمون پر متنبہ فرمایا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جو آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شے مقصود ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے لذت و تغذی کے لئے یہ ایک منفعت ہے دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفع مضرت کے واسطے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت و مضرت کی تعیین میں اہل الرائے اور اہل ملت میں اختلاف ہے۔

کونسا نفع قابل تحصیل ہے

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے ہے کون مضرت واقع میں قابل دفع کے لئے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائق تحصیل کے ہے جس میں دو صفتیں ہوں ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو دوسری یہ کہ خالص ہو مشوب بضرر نہ ہو معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئی منفعت باقیہ خالصہ، منفعت فانیہ غیر خالصہ، مضرت باقیہ خالصہ، مضرت فانیہ غیر خالصہ۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ دنیا کی منفعت و مضرت تو ہر شخص کے پیش نظر ہے ہم کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنے کے بعد واقع ہونے والی ہے اب محل کے اعتبار سے منفعت و مضرت کی دو قسمیں اور نکلیں۔ منفعت دنیویہ منفعت اخرویہ مضرت دنیویہ مضرت اخرویہ۔

تو سمجھ لیجئے کہ آخرتہ کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرتہ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بد اعمالیوں سے بچنا ہے خلاصہ یہ کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دوشے ہیں اصلاح اعمال محمود ذنوب اور محمود ذنوب کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ سے توبہ کی جائے اور آئندہ بچنے کا عزم کیا جائے لیکن اعمال کی تحصیل اور گناہوں سے بچنا اول کو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ
 أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ
 ظَلُومًا جَهُولًا ۝

ترجمہ: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ وہ انسان بہت ظلوم و جہول ہے۔

تفسیری نکات

اصل مادہ الامتیاز محبت ہے

اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے ڈرتے تو فعل قلب کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے باقی و حملہا الانسان کی کیا وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مادہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔

محبت سبب حمل امانت ہے

حقیقت میں محبت ایسی شے ہے کہ اس کے احکام اور آثار عقل جزوی کے احکام سے بالکل جدا ہیں۔ یہی محبت تو وہ شے ہے جس کے ساتھ نوع انسان کی خصوصیت ہے اور یہی محبت تو سبب حمل امانت ہے جس کی نسبت ارشاد ہے انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال فابين ان يحملنها واشفقن منها و حملها الانسان۔ یعنی بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے اس کی وجہ عارف شیرازی نے ایک شعر کے اندر ایک لفظ سے بیان کی ہے کہتے ہیں

آسمان بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زوند

لفظ دیوانہ سے اس امانت کے برداشت کرنے کی لم کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان میں محبت اور عشق کا مادہ رکھا ہے اور سوائے اس کے اور مخلوقات میں یہ مادہ اس درجہ کا نہیں ہے۔ یہ امر دوسرا ہے کہ ہر شے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق ہے لیکن وہ تعلق دوسری قسم کا ہے پس چونکہ زمین و

آسمان و جبال میں ایسا مادہ محبت کا نہ تھا اس لئے جب ان پر امانت الہی پیش کی گئی تو بوجہ عدم محبت کے اس خطاب میں ان کو لذت نہ آئی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا اور حضرت انسان میں چونکہ دیوانگی اور عشق رکھا تھا اس لئے اس نے آگے بڑھ کر فوراً عرض کیا کہ حضرت اس بار کو میں لیتا ہوں مجھے دیدتے تھے یہ سمجھا کہ اور کچھ نہیں تو اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقع ملا کرے گا۔ بقول کسی شاعر کے

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا و ما تلک بسمینک یا موسیٰ یعنی کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ۔ تو اس کا جواب تو اس قدر تھا عصای۔ یعنی میری لاٹھی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اقتصار نہیں فرمایا بلکہ اس پر ایک طویل مضمون بڑھایا۔ چنانچہ فرمایا عصای اتو کؤ علیہا و اہش بہا علی غنمی یعنی یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر سہارا کر لیتا ہوں اور اپنی بکریوں پر اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور چاہتے تھے کہ کچھ فوائد اس کے مفصلاً بیان کریں لیکن کچھ ہیئت اور کچھ فرط و نشاط کے سبب اور کچھ جب یاد نہ آیا تو یہ فرمایا و لی فیہا مارب اخری یعنی میرے لئے اس میں اور بھی مقاصد ہیں اور اس میں گنجائش اس کی رکھی ہے کہ کسی اور وقت یہ عرض کر سکوں کہ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں اور بھی فوائد ہیں وہ فوائد یہ ہیں۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کو ان سب فوائد کی خبر تھی۔ اور نیز سوال بھی صرف یہی تھا کہ کیا شے ہے اس کے فوائد سے سوال نہ تھا لیکن کلام کو اس لئے طول دیدیا کہ پھر ایسا وقت کہاں ملے گا کہ اللہ میاں سے باتیں کرنا نصیب ہوں اچھا ہے جتنا وقت بھی میسر ہو تو جو اہل دل ہیں ان کی غرض تو دعا سے اپنے مولیٰ حقیقی سے مناجات ہوتی ہے اس لئے وہ دیر میں ملنے سے اکتاتے تو کیا اور خوش ہوتے ہیں۔

ازدعا نبود مراد عاشقان جز سخن گفتن باں شیریں وہاں

حامل امانت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے قرآن کی امانت کو زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن فابین ان یحملہا واشفقن منها و حملہا الانسان سوانہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملہا الانسان آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ بدوں عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آ رہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی۔

امانت سے مراد اختیار ہے

(انا عرضنا الامانة پ ۲۲) کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد امانت اختیار ہے پہاڑوں نے زمین نے آسمانوں نے انکار کیا انسان نے فرط محبت سے خود قبول کر لیا۔ عقل پر محبت کا غلبہ ہوا۔ کچھ نہ سوچا یہ بار اٹھالیا اس لئے آگے فرمایا گیا لیعذب اللہ المنافقین الایۃ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ اکثر عارفین کے نزدیک امانت سے مراد عشق ہے اور آگے جو ارشاد ہے کہ انہ کان ظلوما لبعض اہل لطائف نے کہا کہ یہ عنوان میں تو قدح ہے لیکن دراصل مدح ہے کہ اس نے بڑا ہی ستم کیا کہ جھٹ کھڑا ہو گیا اور عشق کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا بڑا نادان ہے یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب کی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال فابین ان يحملنها واشفقن منها و حملها الانسان کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین و جبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے وہ تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا اس امانت سے مراد کیا ہے۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریعی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت و اطاعت سے تو کوئی شی خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم استوی الى السماء وهی دخان فقال لها وللارض انتیا طوعا او کرها قالتا اتینا طائعين کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے حکام (تکوینیہ) کے لئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعين سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسریہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ قسر و حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں بہر حال عابد و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریعیہ ہیں ان کا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کرے گا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاوے گی یعنی اس کی قوت ارادہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دی جائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے اس کو مقرب بنالیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کرے گا اس کو مطرود کر دیا جائے گا اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی انسان اس کے لئے آمادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے (وہ جن

احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ ان کے لئے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کا یہ مکلف ہے وہ اس کے لئے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی۔ مراحق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اس لئے میں اس کا قائل ہوں کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہیں ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراحق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے آخر ہد کی گفتگو حضرت سلیمان کے ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں کہ خالی از عقل کہنا دشوار ہے۔

آیت مبارکہ میں امانت کا مفہوم

انا عرضنا الامانة (پ ۲۲) (ہم نے یہ امانت پیش کی تھی)

کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد امانت اختیار ہے۔ پہاڑوں نے زمین نے آسمان نے انکار کیا انسان نے فرط محبت سے خود قبول کر لیا۔ عقل پر محبت نے غلبہ پالیا۔ کچھ نہ سوچا یہ بار اٹھالیا۔ اس لئے آگے فرمایا ليعذب الله المنافقين (آیت) (انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین کو سزا دے گا) اسی سلسلے میں فرمایا: کہ اکثر عارفین کے نزدیک امانت سے مراد عشق ہے اور آگے جو ارشاد ہے کہ انه كان ظلوماً (وہ ظالم اور جاہل ہے) بعض اہل لطائف نے کہا کہ یہ عنوان میں تو قدح ہے۔ لیکن دراصل مدح ہے کہ اس نے بڑا ہی ستم کیا کہ جھٹ کھڑا ہو گیا اور عشق کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑا نادان ہے۔ یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب کی ہے اور حافظ شیرازی نے بھی اپنے شعر میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے

آسمان بار امانت تو انت کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان جس بار امانت (حکومت) کو نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

شیطان کے مردود ہونے کا سبب

شیطان اسی لئے مردود ہوا کہ اس کو فناء نفس حاصل نہ تھی۔ کیونکہ محبت سے کورا تھا اور ملائکہ میں محبت تھی اس لئے وہ فوراً سجدہ میں گر پڑے کیونکہ وہاں نفس نہ تھا اور ملائکہ سے زیادہ انسان میں محبت ہے اسی لئے یہ امانت کا حامل ہوا۔ جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے قرآن کی امانت کو زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن فابین ان یحملنہا و اشفقن منها و حملہا الانسان

سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور (زمین) اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملہا الانسان آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ بدوں عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آ رہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی اور یہی جواب اس اشکال کا ہے کہ بعض لوگوں نے

واذ قلنا للملائكة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس

جب اللہ نے تمام ملائکہ کو سجدہ آدم کے لئے کہا تو تمام نے فرمان بجالایا مگر شیطان نے انکار کیا پر شبہ کیا کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ واذ قلنا للملائكة اسجدوا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔ نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے شاید کبھی رات کو ہم بستر ہوئے ہوں گے۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدم ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے الا ابلیس میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفا باللاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ یہاں عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ حملہا الانسان میں اس کا ذکر موجود ہے یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اس کا اصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجازاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی واذ قلنا للملائكة والابلیس اسجدوا یہ جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات پر پیش کی۔ امانت سے

مراد احکام تکلیفیہ ہیں جن کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اگر امتثال ہوا تو ثواب ملے گا اور نافرمانی پر عذاب ہوگا۔ عذاب کو سن کر سب ڈر گئے مگر انسان نے ہمت کی اور تحمل کے لئے آمادہ ہو گیا۔

محققین نے لکھا ہے کہ اور مخلوق میں عشق کا مادہ نہ تھا۔ انسان میں عشق کا مادہ تھا۔ یہ خطاب الہی کی لذت سے مست ہو گیا اور اس لذت کے لئے اس نے احتمال عذاب کی بھی پروا نہ کی اور کہہ دیا کہ حضرت یہ امانت مجھے دی جائے میں اس کا تحمل کروں گا۔ بس وہی مثل ہوئی کہ چڑھ جاسولی پر اللہ بھلی کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جس امانت کی ابتدا یہ ہے کہ کلام و خطاب سے نوازے گئے اگر اس کو لے لیا تو پھر تو روز کلام و سلام و پیام ہوا کریگا بس ایک سلسلہ چلتا رہے گا کہ آج کوئی حکم آ رہا ہے کل کو دوسرا آ رہا ہے۔ کبھی عنایت ہے کبھی عتاب ہے تو اس چھیڑ میں بھی بڑا مزہ ہے۔

چھیڑ خواہاں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حمل امانت کا راز یہی بتلایا ہے کہ اس کا منشاء محبت کی دیوانگی تھی۔ فرماتے ہیں۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ نہ زدند

علاج النفس

بعض لوگوں نے اس راز کو قرآن سے بھی ثابت کرنا چاہا۔ انہوں نے انہ کان ظلوما جھولا (وہ ظالم ہے جاہل ہے) کو اسی پر محمول کیا ہے اور اس کی مدح کہا ہے کہ چنانچہ بعض صوفیائے ظلم کی تفسیر میں لکھا ہے اس کے معنی ظلم و نفسہ ہیں مطلب یہ ہے کہ انسان میں فنائے نفس کی صفت تھی مگر میں اس تفسیر کو نہیں مانتا کیونکہ ظلم و نفسہ بھی تو شریعت میں محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے کفار کے باب میں فرمایا ہے کانوا انفسہم یظلمون وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو کیا وہ بھی فانی تھے؟

اگر آج کل ایک جماعت نکلی ہے جو نفس کی دشمن ہے۔ کہتے ہیں اس کو خوب مارو۔ اس پر خوب ظلم کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کافر بھی کہتے ہیں حالانکہ سارے بدن میں اگر تلاش کرو تو مومن یہی نکلے گا تو حضرت آپ نفس کو کافر کہہ کر خود اپنے ہی کو کافر کہتے ہیں پھر تمہارا کیا اعتبار پس نفس پر ظلم کرنا یہ کچھ تصوف نہیں ہے۔ حضور کا تصوف تو یہ ہے

ان لنفسک علیک حقواں لعینک علیک حقواں لجسدک علیک حقواں
تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے ہے اور تیری آنکھوں اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

نفس کے بھی تمہارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ بس ظلم ہی پر کمر باندھ لو۔ بلکہ اس کے ساتھ بچہ کا سا معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں۔ اگر اس سے نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس وہ چپت وہ چپت۔ صاحب قصیدہ بردہ فرماتے ہیں

النفس کا لطف ان تحملہ شب علی حب الرضاع وان تطفمہ بنظم

بس اس کے حظوظ کو تو پورا نہ کرو باقی حقوق ادا کرتے رہو۔ خوب کھلاؤ پلاؤ اور اچھی طرح کام لو۔

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی کے حوالے کر دو۔ وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رانی

ورنہ جو لڑکا اپنے ہاتھ سے چپت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور محقق سزا کافی دے گا مگر حقوق تلف نہ کرے گا۔ بہر حال نفس کو کافر کہنا گویا اپنے کو کافر کہنا ہے۔ شاید یہ لوگ تو اضعا اپنے نفس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ مگر ایسی بھی کیا تو واضح کہ مسلمان سے کافر بن گئے۔

سُورَةُ سَبَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ

ترجمہ: اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

تفسیری نکات

حضرت سلیمان علیہ السلام پر خصوصی انعامات

یہ ایک آیت ہے اس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جو سلیمان علیہ السلام کو دی گئی تھیں وہ آیت یہ ہے۔
ولسلیمن الريح غدوها شهر ورواحها شهر واسلناله عين القطر و من الجن من يعمل بين يديه باذن ربه و من يزغ منهم عن امرنا نذقه من عذاب السعير يعملون له ما يشاء من محاريب و تماثيل و جفان كالجواب و قدور رسيئت اعلموا آل داود شكراً و قليل من عبادي الشكور (اور سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں بعض وہ تھے جو ان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے اور ان میں سے جو شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا اس کو دوزخ کا عذاب چکھا دیں گے وہ جنات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے جو ان کو منظور ہوتا اور بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے داؤد (علیہ السلام) کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو) اس کے بعد سلیمان علیہ السلام کو اس آیت میں خطاب ہے اور

غیرت مند نوکر اس بات سے زمین میں گڑ جائے گا۔ اس سے بھی یہ بات معلوم ہوگئی کہ شکر فقط زبان سے ہی نہیں ہوتا کیونکہ زبان سے تو اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے ہر آدمی کہہ دیتا ہے اگر شکر کی یہی حقیقت ہوتی تو حق تعالیٰ اتنی بڑی شکایت فرماتے کہ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہیں معلوم ہوا کہ شکر کا تعلق عمل سے ہے اور بیشک عمل کرنے والے بہت تھوڑے ہیں اس لئے یہ شکایت کی گئی (تحقیق الشکر ص ۶۲۲)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

ترجمہ: بے شک اس (قصہ) میں ہر صابر و شاکر (مومن) کے لئے بڑی عبرتیں ہیں

تفسیری نکات

اس میں نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر اور شاکر ہو۔ یہ جملہ ایک آیت طویلہ کا جزو ہے اس سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں اور اس کا تتمہ اس جملہ کو قرار دیا ہے اور اس مختصر جملہ میں فضیلت اور مدح کے ساتھ دو بڑی چیزوں کا ذکر ہے۔

حاصل مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض آیات قدرت کو بیان فرما کر فرماتے ہیں ان فی ذالک لآیات لکل صبار شکور یعنی ہم نے جو اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں ان کو دیکھتے تو سب ہیں لیکن ان کو آیات قدرت سمجھنا پھر اسے سمجھنے سے منتفع ہونا ہر ایک کے لئے نہیں۔

انتفاع کی دو شرطیں

بلکہ اس انتفاع کی دو شرطیں ہیں ایک کو لفظ صبار سے تعبیر فرمایا اور دوسری کو شکور سے یعنی جس شخص کے اندر دو صفتیں ہوں اول صبر دوسرے شکر وہی ہماری آیات قدرت سے نفع حاصل کرتا ہے یہ ہے اس آیت کا حاصل اس مقام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفتوں کی کس درجہ مدح فرمائی ہے کہ ان کو آیات قدرت سے منتفع ہونے کا موقوف علیہ قرار دیا ہے اور اسی سے دونوں صفتوں کا وجوب بھی مفہوم ہو گیا ہوگا کیونکہ واجب کا موقوف علیہ واجب ہے اور آیات الہیہ سے اعتبار کا واجب ہونا ظاہر ہے۔

صبر کی حقیقت

سمجھ لینا چاہئے کہ صبر کی حقیقت ہے ضبط النفس علی ماتکرہ یعنی ناگوار امر پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا آپے سے باہر نہ ہونا اور وہ ناگوار امر خواہ کچھ ہو خواہ کسی کا مرنا ہو یا کوئی اور ناگوار امر ہو چنانچہ مواقع صبر کو کسی قدر سہ کے ساتھ عنقریب بیان کیا جاوے گا اس سے اس کی تعمیل سمجھ میں آجائے گی اور شکر کہتے ہیں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر

کرنا خواہ وہ نعمت کھانا ہو یا پانی یا اور شے ہو اور قدر کرنا دل سے بھی اور زبان سے بھی اور دیگر جوارح سے بھی۔ لوگ شکر کی حقیقت صرف اتنی ہی سمجھتے ہیں کہ زبان سے کہہ لیا الحمد للہ یا اے اللہ شکر ہے پس شکر ادا ہو گیا۔

شکر کی حقیقت

شکر یہ ہے کہ قلب اس کا معترف ہو اور منعم حقیقی کی نعمتوں سے متاثر ہو اور زبان اور دیگر جوارح پر بھی اس کا اثر ہو۔ آگے اس کے مواقع بھی بیان کئے جاویں گے۔ اب مواقع صبر و شکر کو سمجھ لیجئے دونوں کی تعریف سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا ہوگا کہ صبر کا موقع مصیبت ہے اور شکر کا محل نعمت ہے۔ اتنی بات تو سب کو معلوم ہے لیکن اس میں غلطی یہ واقع ہوئی کہ صبر کا موقع ایک خاص مصیبت اور شکر کا ایک خاص نعمت کو سمجھا ہے اس لئے ان دونوں یعنی مصیبت و نعمت کی حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے۔

نعمت کی حقیقت

نعمت کی حقیقت یہ ہے النعمة حالة ملائمة للنفس نعمت وہ حالت ہے جو نفس کے لئے خوش گوار ہو۔

مصیبت کی حقیقت

اور مصیبت کہتے ہیں حالة غیر ملائمة للنفس مصیبت وہ حالت ہے جو نفس کو ناگوار ہو جس کا تعلق دو چیزوں سے ہوا مصیبت سے بھی اور عبادت سے بھی مصیبت میں تو صبر یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرنا اور عبادت میں یہی ہے کہ باوجود ناگواری کے نفس کو اس پر جمانا اور ناگواری کی پروانہ کرنا چاہئے چنانچہ دونوں کی نسبت ارشاد ہے یا ایہا الذین امنوا الصبروا و صابروا و رابطوا اصبروا تو مصائب میں صبر کرنا اور صابروا دوسروں کو صبر کی تعلیم کرنا اور رابطوا عبادت کے اندر جمار ہنا۔

رابط کی تفسیر

چنانچہ رابط کی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کی انتظار میں بیٹھے رہنا اور یہ یہی مفہوم صبر کا ہے مصیبت میں اس کا نام صبر ہوا اور عبادت میں اسی کو رابط سے تعبیر فرمایا۔ پس صاف معلوم ہو گیا کہ صبر کے دو محل ہیں مصیبت اور عبادت۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ

أَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَ

هُمْ فِي الْغُرُفِ آمِنُونَ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ: اور تمہارے اموال اور اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنادے (یعنی مؤثر و علت قرب کی بھی نہیں) مگر ہاں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سبب قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دو نابلہ ہے اور وہ (بہشت کے) بالا خانوں میں چین سے بیٹھے ہوں گے

تفسیری نکات

قرب کا مفہوم

قرب کے معنی یہ نہیں جو دریا و قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے۔ بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجے ہیں ایک تو قرب علمی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کیساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تَبْصُرُونَ اور ارشاد ہے وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ اور ایک قرب رضا کا ہے اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضا مراد ہے قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مومن اور صالح کے ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے وَمَا أَمْوَالُكُمْ إِلَّا يَتْلُو عَنْكُمْ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ جَسَدٌ كَالْخِطِّ الْمُرْتَمِلِ یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہو سکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضا کا کیسے بن سکتا ہے۔

دین کے شعبے

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم و عمل دائم حال اور دین کے یہی شعبے ہیں۔ سوا اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوا اور اگر علم نہیں تو اگرچہ بظاہر عمل کا ہونا

کافی معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقاء کی امید نہیں اور حال سے مراد ملکہ ہے۔ اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہو جاوے اور اس کو کھلاؤ پلاؤ و ایک تو یہ حالت دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگی پہلی حالت عمل ہے دوسری حالت حال ہے اور پہلی حالت یعنی نرا عمل بلا حال پائیدار نہیں اور حال ہو جانے کے بعد پائیدار ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کرتا ہے اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلب نہیں ہوتا اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت نماز بھی چھوٹ جاوے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں۔

بر دل سالک ہزار براں غم بود
گر زبان دل خالے کم بود

حواشی قشریہ میں ہے کہ التصوف تعمیر الظاہر والباطن اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک عقیدہ اور دوسرے اخلاق ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے مگر صوفیہ نے اس کو تصوف سے تعبیر کیا ہے قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے ثمرہ اس کا یہ ہے تقربکم عندنا زلفی (طریق القرب ص ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲)

سُورَةُ فَاطِر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلِكَةِ رُسُلًا

أُولَىٰ أَجْنَعَةٍ مَّمْنَىٰ وَثُلُثَ وَرُبْعَ يُزِيدُ فِي الْخُلُقِ مَا يَشَاءُ

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

ترجمہ: تمام تر حمد اسی اللہ کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیام رساں بنانے والا ہے جن کے دودو تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیری نکات

اقسام توحید و رسالت

اس میں انہوں نے اپنی ان صفات و افعال کا بیان کیا ہے جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں پس اس کا تعلق توحید صفاتی و توحید افعال دونوں سے ہوگا اس کے بعد فرمایا ہے یا ایہا الناس اذکروا نعمت اللہ علیکم هل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض لا اله الا هو فانی توفکون۔ اس میں توحید ذاتی و توحید صفاتی و توحید افعالی تینوں کا تعلق توحید ہے یہاں توحید کے بعد حق سبحانہ نے مسئلہ رسالت کو بیان فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ان یکذبوک فقد کذبت رسل من قبلک والی اللہ ترجع الامور اس کے بعد معاد کا بیان فرمایا ہے۔

تین امہات مسائل

اور ارشاد فرمایا ہے یا ایہا الناس ان وعد اللہ حق فلا تغرنکم الحیوة الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور۔ (یہ تینوں مسئلے امہات مسائل میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ حق سبحانہ نے قرآن پاک میں ان تینوں کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ان پر زبردست براہین قائم کی ہیں امام رازی نے اس پر بجا تنبیہ کی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تینوں مسئلے اصل ہیں اور باقی مسائل ان کو فروغ اور یہ مضمون بالکل ٹھیک ہیں جو شخص بامعان نظر قرآن کریم کا مطالعہ کرے گا اس کو اس کی قدر ہوگی اور وہ اس کی تصدیق کرے گا ان تینوں میں سب سے اہم مسئلہ توحید ہے اس کے بعد مسئلہ رسالت اس کے بعد مسئلہ معاذ اس لئے حق سبحانہ نے اس مقام پر اول مسئلہ توحید کو بیان فرمایا اس کے بعد مسئلہ رسالت کو اسکے بعد مسئلہ معاد کو۔ اس گفتگو کا تعلق تو نوعیت مضمون آیت سے تھا اب اس کا مضمون شخصی بیان کیا جاتا ہے اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے مایفتح اللہ للناس من رحمۃ فرمایا ہے جس میں انہوں نے کلمہ بالاستعمال فرمایا ہے جو ابہام کے ساتھ عموماً کا فائدہ دیتا ہے پھر اس ابہام کی توضیح میں من رحمۃ فرمائی ہے۔ پس حاصل اس جملہ کا یہ ہوگا کہ حق سبحانہ جس رحمت کو بھی کھول دیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کمال غلبہ و قدرت

اس سے حق سبحانہ کا کمال قدرت و غلبہ ظاہر ہوا اور معلوم ہو گیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی قوت اور قدرت والا نہیں جو اس کا مزاحم ہو سکے اور گو واقعی طور پر اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا مگر سطح نظر میں اور محض احتمال عقلی کے طور پر شبہ ہو سکتا تھا اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ فتح حق سبحانہ کے بعد کوئی روکنے والا نہیں لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے روکنے کے بعد کوئی کھول بھی نہیں سکتا اس لئے حق سبحانہ نے اس احتمال کو ہی دفع کر دیا اور فرمایا وما یمسک فلا مرسل لہ یعنی جس کو وہ روک لیں اس کو کوئی چھوڑنے والا بھی نہیں۔ اب یہی ایک احتمال عقلی باقی تھا وہ یہ کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ اس کے فتح اور امساک کے بعد اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود فتح و امساک کی حالت میں بھی اس کا کوئی مزاحم ہو سکتا ہے یا نہیں اس احتمال کے اٹھانے کے لئے فرمایا وهو العزیز یعنی عزت و غلبہ عین منحصر ہیں اس کی ذات میں اور وہی ہر حیثیت سے سب پر غالب ہے اس پر کسی طرح بھی کوئی غالب نہیں اب تمام احتمالات کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا تفرد بالغلبہ با کمال وجہ ظاہر ہو گیا یہ تو ہو گیا مگر اس پر ایک شبہ اور ہو سکتا تھا وہ یہ کہ جب اس کو ایسی قدرت اور قوت حاصل ہے اور اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا تو شاید اس کی بھی وہی حالت ہو جو با اقتدار انسانوں کی ہوتی ہے کہ بلا لحاظ مصلحت و منفعت جو جی میں آیا کر بیٹھے اس کے دفع کے لئے الحکیم بڑھا دیا اور ظاہر کر دیا کہ ہمارے افعال لا ابالی حکام و سلاطین کے سے نہیں بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہم کو مصلحت و حکمت

ملفوظ ہوتی ہے سبحان الذی تکلم بهذا الکلام البلیغ الدقیق الاسرار.

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ جملہ مایمسک فلا مرسل له اور وهو العزیز الحکیم یہ دونوں جملہ تاکید میں مضمون مایفتح اللہ للناس من رحمة فلاممسک له کہ جن سے مقصود تمام اوہام و شکوک کو زائل کر اپنی کمال قدرت و حکمت کا ظاہر کرنا ہے جو اصل مقصود ہے اس آیت کا تو یہ بیان تھا حق سبحانہ کے عموم و کمال قدرت کا جو کہ اس آیت سے مقصود ہے اب سنئے کہ رحمت کے لغوی معنی رقت قلب اور نرم دلی ہیں حق سبحانہ چونکہ دل اور نرمی سے جو کہ ایک خاص قسم کا تاثر اور انفعال ہے پاک اور منزہ ہیں اس لئے یہ لفظ اس مقام پر یا جہاں کہیں وہ حق سبحانہ کے لئے استعمال کیا جاوے جیسے رحمن رحیم وغیرہ اپنے معنی لغوی میں مستعمل نہیں ہو سکتا بلکہ مجازاً بعلیۃ سببیت اثر رقت قلب یعنی فضل و انعام احسان مراد ہوگا اس مقام پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حق سبحانہ نے مایفتح اللہ للناس من رحمة فرمایا اور من خیر نہیں فرمایا حالانکہ مطلب من خیر کا بھی وہی ہے جو من رحمة کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت میں اشارہ ہے اس طرف کہ حق سبحانہ کے تمام انعامات بلا استحقاق منعم علیہم پر ہیں اور یہ اشارہ لفظ خیر میں نہ تھا اس لئے اس کے بجائے اس کو اختیار کیا چونکہ اس مضمون کو سن کر کہ حق سبحانہ کے تمام احسانات بلا استحقاق منعم علیہم پر ہیں کسی کو خلجان ہوتا اس لئے میں اس کو بھی زائل کئے دیتا ہوں یہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حق سبحانہ کے انعامات کو بندوں کے انعامات کے مماثل سمجھا گیا ہے اور اپنی طاعت کو طاعت عباد کی مانند خیال کیا گیا لیکن خود یہ قیاس ہی غلط ہے کیونکہ آدمی جب بندہ کی خدمت کرتا ہے تو وہ اپنے قوی اور اعضاء وغیرہ کو ایک ایسے شخص کے کام میں لگاتا ہے جو اس کے مملوک و مصنوع ہیں اور اس لئے اس کو ان سے انتفاع کا کوئی حق بھی نہیں ہے اس بنا پر خادم مخدوم سے معاوضہ کا مستحق ہوتا ہے بخلاف اس کے کہ جب وہ حق سبحانہ کی خدمت اور اطاعت کرتا ہے تو وہ خود حق سبحانہ کی مملوک چیزوں کو اس کے کام میں لگاتا ہے اور وہ خود بھی حق سبحانہ کا مملوک ہے ایسی صورت میں وہ اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ مملوک من حیث ہو مملوک کا مالک پر کوئی حق نہیں یہ مضمون آپ کی سمجھ میں یوں آسانی سے آجائے گا کہ جب کوئی شخص کسی کی ملازمت کر لیتا ہے تو اب وہ من حیث الخدمت اس کا مملوک ہو جاتا ہے خواہ عارضی ہی طور پر سہی پس جب وہ کوئی اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہے تو اس کے معاوضہ میں وہ کسی معاوضہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا ایسی حالت میں اگر آقا اس کی خدمت کا کوئی صلہ دے تو وہ اس کا انعام اور احسان سمجھا جاتا ہے اور اپنی خدمت کو اپنا فرض منصبی خیال کیا جاتا ہے پس جب کہ اس کمزور اور برائے نام ملک کا یہ اثر ہے تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ملک حقیقی پر اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا کیا حق رکھ سکتا ہے اب ہم کو یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ بندہ حق سبحانہ کا مملوک محض ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کی کوئی چیز کسی کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے کیونکہ وہ ابتدا میں معدوم محض اور اپنے تمام کمالات حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بھی

عاری تھا ایسی حالت میں اس کی کوئی چیز خود اس کی ذاتی کیسے ہو سکتی ہے پس لامحالہ اس کی تمام چیزیں کسی دوسرے کی مملوک ہیں اور خدا کے سوا اگر کوئی اس کے مالک ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے تو اس کے ماں باپ ہو سکتے ہیں کیونکہ ان سے زیادہ اس کی ہستی میں کسی کو دخل نہیں ہے حتیٰ کہ اسی دخل کی بنا پر بعض لوگوں کو شبہ ہو گیا اور وہ اپنا خالق اپنے ماں باپ کو سمجھ بیٹھے ہیں۔

آیت متلوہ کی عجیب و غریب تفسیر

کہ حق سبحانہ نے جس طرح اس آیت میں اپنے عموم قدرت و قہر غلبہ کو صراحتاً بیان فرمایا ہے یوں ہی انہوں نے اس میں اپنے کمال جود و کرم کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں جملہ اولیٰ میں فتح کے مقابلہ میں امساک لائے ہیں اور امساک کے مقابلہ میں فتح اور جملہ ثانیہ میں امساک کے مقابلہ میں ارسال لائے ہیں اور ارسال کے مقابلہ میں امساک۔

پس اس میں دو امر خلاف ظاہر ہیں ایک تو جملہ اولیٰ میں فتح کے مقابلہ میں امساک اور امساک کے مقابلہ میں فتح لانا کیونکہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک اور امساک کا مقابلہ ارسال ہے نہ کہ فتح اور دوسرا یہ کہ جملہ ثانیہ مقابل ہے جملہ اولیٰ کا اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک۔

پس جملہ اولیٰ میں ما یفتح اللہ فرمایا اور اس کے مقابلہ میں جملہ ثانیہ میں ما یمسک فرمانا خلاف مقتضائے تقابل ہے اس بنا پر آیت مذکورہ پر شبہ ہوتا ہے کہ اس میں رعایت نہیں رکھی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ رعایت معنوی چونکہ رعایت لفظی پر مقدم ہے اور رعایت معنوی عدم لحاظ تقابل میں تھی اس لئے اس کا لحاظ نہیں کیا گیا تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح اظہار کمال قدرت مقصود ہے یوں ہی اس میں غایت کرم اور کمال جود کی طرف بھی اشارہ ہے پس جملہ اولیٰ میں بجائے لفظ ارسال کے فتح کا لفظ اس واسطے استعمال کیا گیا ہے کہ گو یہ دونوں لفظ اطلاق پر دلالت کرتے ہیں مگر جود دلالت اطلاق پر لفظ فتح کرتا ہے وہ دلالت لفظ ارسال نہیں کرتا اس لئے ما یفتح اللہ میں اشارہ ہوگا اس طرف کہ جب حق سبحانہ کسی پر رحمت کرتے ہیں تو بہت اور بے دریغ کرتے ہیں اور یہ اشارہ ارسال میں نہ تھا اس لئے بجائے ارسال کے فتح لایا گیا اور بجائے غلق کے امساک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جس قدر کمال قدرت نفی مسک سے ظاہر ہوتا ہے اس قدر نفی غلق سے ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ غلق خاص ہے اور امساک عام اور نفی عام تو نفی خاص کو مستلزم ہے مگر نفی خاص نفی عام کو مستلزم نہیں اور جملہ ثانیہ میں لفظ امساک بجائے غلق کے اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ دلالت کرتا ہے کرم پر کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق سبحانہ جب کسی پر انعام نہیں کرتے تو یہ اس کا بند کرنا نہیں ہوتا کہ نہر جاری نہ ہو بلکہ کسی وجہ سے عارضی طور پر روک لینا ہوتا ہے اور زوال عارض کے بعد پھر اس کا اجرا ہو جاتا ہے ما یفتح اللہ للناس من رحمة فلا غلق لہا اس لئے نہیں کہا کہ اس میں گو کثرت جود کی طرف اشارہ ہے مگر اس سے کمال قدرت کا

اظہار نہیں ہوتا کیونکہ نفی غالق کے لئے نفی ممسک لازم نہیں اور مایرسل اللہ للناس من رحمة فلاممسک لہا اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے مگر اس سے کمال جو مفہوم نہیں ہوتا اور مایرسل اللہ للناس من رحمة فلاقالغلق اس واسطے نہیں فرمایا کہ نہ اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے اور نہ کمال جو کی طرف اشارہ اور مایغلق فلاقالغلق لہ اس واسطے جو کہ ادنیٰ ہے غلق سے نیز اس میں کمال قدرت پر بھی دلالت نہیں ہے کیونکہ نفی فاتح مستلزم نفی مرسل نہیں ہے۔

مایغلق فلامرسل لہ اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت پر دلالت ہے مگر حق سبحانہ غلق رحمت نہیں فرماتے اور مایمسک فلاقالغلق لہ اس واسطے نہیں فرمایا کہ اس میں کمال قدرت پر دلالت نہیں ہے اس تفصیل کے بعد آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حق سبحانہ جب کسی پر کوئی عنایت کرتے ہیں تو بے دریغ کرتے ہیں اور خود ان کی طرف سے کوئی روک نہیں ہوتی اور جس کسی پر وہ عنایت کرتے ہیں اس کا کوئی بند کرنے والا تو درکنار روکنے والا بھی نہیں ہوتا اور جس پر وہ رحمت نہیں کرتے تو وہ اس کو بند نہیں کرتے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے روک لیتے ہیں اور اگر وہ عارض زائل ہو جاوے تو پھر جاری فرما دیتے ہیں اور فلامرسل لہ من بعدہ میں مضاف مخدوف ہے ای من بعد امسا کہ چونکہ مضاف بلا ذکر بھی سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کو حذف کر دیا گیا غرضیکہ قرآن میں لفظی و معنوی دقاتق بے انتہا ہیں۔ اس آیت میں یہ فرما دیا کہ وہ بڑے قادر ہیں جو کام بند ہو اس کو جاری بھی کر سکتے ہیں اور اگر بند ہونے میں یہ شبہ ہو کہ اس سے تو دین میں نقصان ہوگا تو حکیم میں فرما دیا کہ ہم حکیم بھی ہیں اگر بند ہی کر دیں تو اسی میں حکمت ہوگی۔

فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا

ترجمہ: تو تمام تر عزت خدا ہی کے لئے ہے

تفسیری نکات عظمت خداوندی

کیونکہ ایسی بڑائی تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے کہ ان کے ذمہ کسی کا حق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہے ولہ الکبرياء فی السموات والارض یعنی بڑائی تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ یہاں بڑائی کا حصر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کے لئے کیونکہ اس آیت میں لہ معمول مقدم ہے اور معمول کا مقدم کرنا حصر کے لئے مفید ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے حصر کی۔ تو ترجمہ اس آیت کا یہ ہوا کہ خدا ہی کے لئے بڑائی ہے اوروں کے لئے نہیں۔ اس طرح ایک جگہ ارشاد ہے فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا وہاں بھی للہ کو حصر ہی کیلئے مقدم فرمایا گیا ہے اور یہاں ایک شبہ بھی ہو سکتا

ہے اسکو بھی رفع کئے دیتا ہوں کیونکہ ممکن ہے کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ وہ شبہ یہ ہے کہ جہاں ایک جگہ یہ فرمایا ہے **فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا** وہاں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا کہ **وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ** یعنی عزت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے تو عزت کا حصر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کے لئے کہاں رہا وہ تو رسول کے لئے بھی اور مؤمنین کے لئے بھی ثابت ہو گئی جواب یہ ہے کہ دوسروں کے لئے جو عزت ہے تو کیوں ہے وہ اس تعلق ہی کی وجہ سے ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ غرض عزت بالذات تو حق تعالیٰ ہی کیلئے ہے لیکن چونکہ ان دوسروں کو تعلق ہے ایک عزت والے کے ساتھ اس لئے اس عزت کی نسبت ان کے ساتھ بھی ہو گئی تو اصل میں تو عزت حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے لیکن چونکہ رسول کو اور مؤمنین کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہے اس لئے وہ ان کو بھی حاصل ہو گئی ہے جیسے اصل میں نور تو آفتاب ہی کا ہے لیکن جن دوسروں چیزوں سے اسکو محاذات کا تعلق ہے وہ بھی منور ہو گئیں۔ اب خود پرستوں نے ان اصولوں کو تو غائب کر دیا اور بس یہ ناز ہے کہ ہم بڑے ہیں شیخ ہیں رئیس ہیں۔ خاک پتھر ہیں۔ اگر اپنے آپ کو مٹایا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھئے لو ہے کو بہت دیر تک آگ میں رکھے تو وہ سرخ اور گرم ہو کر آگ کی شکل اور اسکی صفات اختیار کر لیگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آگ ہو گیا لوہا نہ رہا بلکہ دیر تک آگ میں رہنے سے لوہے کو اوصاف بدل گئے گو ماہیت نہیں بدلی اسی طرح فنا کے اندر ذات نہیں بدلتی اوصاف بدلتے ہیں کیونکہ بہر حال حادث حادث ہی رہتا ہے اور ممکن ممکن ہی۔ اسی کی ذات نہیں بدلتی اوصاف بدلتے ہیں۔ جیسے لوہا آگ میں رہنے سے آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی رنگ کو کہتے ہیں **صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً** اس ناز پر یاد آیا ایک نوجوان اینٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا ایک بزرگ نے اسکو نصیحت کی کہ بھائی اینٹھ کر نہ چلو سنبھل کر چلو وہ کوئی بڑا آدمی تھا اس کو ان کا یہ کہنا ناگوار ہوا کڑک کر جواب دیا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں میں خوب جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ اولک نطفة مذکورہ۔ و آخرک جيفة قدورہ۔ دامت بین ذلک تحمل العذرة۔ یعنی تمہاری شروع کی حالت تو ایک ناپاک نطفہ کی ہے اور اخیر کی حالت ایک گندی لاش ہے اور ان دونوں کے درمیان کی حالت یہ ہے کہ پانچ سیر پاخانہ بھی شکم شریف میں ہر وقت موجود ہے میں آپ کو خوب پہچانتا ہوں (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۶۶، ۲۶۷)

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۝۲۸

ترجمہ: خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔

تفسیری نکات

علماء صاحب خشیت ہیں

بعض نے اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملا دیا۔ ذلک لمن خشی ربہ (یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے) جس کا حاصل یہ ہوا کہ علماء صاحب خشیت ہیں اور صاحب خشیت کے لئے جنت اور رضائے حق حاصل ہوتی ہے تو علم سے جنت اور رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ حساب تو واقعی درست ہے مگر یہ حد اوسط پہلے متحقق ہونا چاہیے کہ واقع میں بھی تو خشیت ہو ورنہ محض باتوں سے کیا ہوتا ہے کہیں باتوں سے بھی خشیت پیدا ہوئی ہے و جائزۃ دعوی المحبة فی الهوی ولكن لا ینحفی کلام المنافق۔

خشیت کی علامت

پس خشیت کے متعلق بھی حدیث و قرآن سے معلوم کرنا چاہیے کہ شریعت نے حصول خشیت کی علامت کیا بتلائی ہے سنیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اسئلک من خشیتک ماتحول به بینی و بین معاصیک

(میں تجھ سے اتنے خوف کی درخواست کرتا ہوں جو میرے اور میرے معاصی کے درمیان حائل ہو جائے) اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہ ہے جس سے گناہوں میں حیلوت ہو جائے۔ پس جس کو یہ حیلوت حاصل نہیں اسے خشیت مطلوبہ حاصل نہیں اور جب خشیت نہیں تو اس کے پاس علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں جس پر وہ علم کا دعویٰ کر سکے۔ بعض علم مطلوب گو کتابی علم حاصل ہو مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے وہ یہ کتابی محض نہیں ہے بلکہ علم مطلوب وہ ہے جو دل میں اتر جائے اور اس علم کے لئے خشیت لازم ہے۔

گو اس آیت کا اول نظر میں یہ مدلول نہیں بلکہ اس کا مدلول تو عکس ہے یعنی خشیت کے لئے علم لازم ہے کیونکہ وہ خشیت کا موقوف علیہ ہے اور وجود موقوف کا مستلزم ہے وجود موقوف علیہ کو تو اس آیت سے علم خشیت کے لئے مستلزم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک حمیق تحقیق سے جو کہ ختم بیان کے قریب مذکور ہوگی۔ خود آیت سے بھی اور قطع نظر اس تحقیق کے دوسرے دلائل سے یہ استلزام ثابت ہے کہ اگر خشیت حائلہ بین العاصی

وبین المعاصی (گناہ گار اور گناہوں کے درمیان حائل ہونے والی) حاصل نہ ہو تو اسے علم مطلوب بھی حاصل نہیں چنانچہ حدیث۔

لا یزنی الزانی وهو مومن (کوئی زانی زانیہ نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مومن ہو) اس کی دلیل ہے۔
باقی اور اصل مقصود وہ علم ہے جس کے ساتھ قلب میں خشیت بھی پیدا ہو۔ اس کا حاصل کرنا بھی ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے۔ مگر عادتاً یہ بدوں صحبت شیخ کے حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے قال و قیل کو کچھ دنوں کے لئے ترک کرنا اور کسی شیخ کی جوتیاں سیدھی کرنا شرط ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت حالے امالہ ہے حالا کا
از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق می کنم
(مدرسہ کے قیل و قال سے اب میرا دل رنجیدہ ہو گیا۔ اب کچھ دنوں شیخ کامل کی خدمت کرتا ہوں)
قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کا ملے پامال شو
(یعنی قال کو چھوڑو حال پیدا کرو۔ یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ)
مگر اس میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ ترتیب ہر شخص کے لئے جدا ہے اس کو میں اس مجلس میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کو صحبت شیخ پر رکھو جب تم کسی سے رجوع کرو وہ خود ترتیب بتلا دے گا۔

ایک علمی اشکال

اب میں ایک طالب علمانہ اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اس آیت پر وارد ہوتا ہے۔ یہ جواب ابھی کوئی دس بارہ دن ہوئے قلب پر وارد ہوا ہے اس سے پہلے اس کی طرف ذہن نہیں گیا۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ میں نے تو اب تک خشیت کو لوازم علم سے کہا تھا کہ علم جب ہوگا خشیت ضرور ہوگی اور انتفاء خشیت انتفاء علم کی دلیل ہے کیونکہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم ضروری ہے مگر آیت کے الفاظ اس کو مفید نہیں کیونکہ۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (اللہ تعالیٰ سے عالم ہی اس کے بندوں میں سے ڈرا کرتے ہیں)
میں انما لفظ حصر ہے جس سے یہ معنی حاصل ہوئے کہ خشیت من اللہ علماء میں منحصر ہے یعنی جہلاء کو خشیت نہیں ہوتی (کیونکہ بقاعدہ بلاغت یہاں قصر صفت علی الموصوف ہے جیسے انما یقول زیداً اور انما یتذکر اولوا الالباب میں۔ کہ مثال اول میں قیام زید کا اثبات اور اس کے ماسوا کی نفی ہے کہ عمرو بکرو غیرہ قائم نہیں ہیں اور مثال ثانی میں تذکر کا عقلاء کے لئے اثبات ہے او غیر عقلاء سے تذکر کی نفی ہے اسی طرح یہاں خشیت کا علماء کے لئے اثبات اور غیر علماء سے خشیت کی نفی ہے (۱۲)

حاصل جس کا یہ ہوا کہ خشیت علم کے بغیر نہیں ہوتی یعنی خشیت کے لئے علم شرط ہے علت نہیں اور وجود

شرط سے وجود مشروط لازم نہیں۔ ہاں انتفاء شرط سے مشروط معدوم و منتفی ہو جاتا ہے اور علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے اور انتفاء علت سے انتفاء معلول لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری علت سے اس کا وجود ہو گیا ہو۔ معلول واحد کے لئے علل متعددہ ہو سکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت بھی ضرور ہو تو آیت سے یہ ثابت نہ ہوا کہ علم خشیت کو مستلزم ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ خشیت علم کو مستلزم ہے کیونکہ وجود مشروط وجود شرط کو مستلزم ہے حالانکہ عام طور پر اس آیت سے علم کی فضیلت اس تقریر سے ثابت کی جاتی ہے کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے جو کہ ضروری ہے اور اب اس کے برعکس یہ تقریر ہوئی کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ بدوں اس کے خشیت پیدا نہیں ہوتی۔ تو مشہور تقریر صحیح نہ ہوئی۔

یہ اشکال ذہن میں عرصہ دراز سے تھا مگر جواب ابھی دس بارہ دن ہوئے ذہن میں آیا ہے۔ نہ معلوم اب تک ذہن میں یہ اشکال کیوں رہا۔ کیا جواب کی طرف التفات نہیں ہوا جواب شافی اب تک نہ ملا تھا۔ بہر حال اب جواب ذہن میں آ گیا ہے۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ قرآن کا نزول محاورات کے موافق ہوا ہے۔ اسالیب معقول پر نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن سے قضایا عقلیہ کی نفی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ قضایا عقلیہ سے قضایا نقلیہ کا تعارض جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے دلالات قرآنیہ میں محاورات کا لحاظ کیا گیا ہے اصطلاحات معقول کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب معقول سے ایک کلام کی دلالت کسی خاص معنی پر ہو اور اسلوب محاورہ سے دوسرے معنی پر دلالت ہو اور مقصود ثانی ہونہ کہ اول پس بطریق اسلوب معقول تو وہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر بطریق اسالیب محاورات یہ اشکال نہیں پڑتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ گونا گوں میں اس ترکیب سے خشیت کا مستلزم علم ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ علم کا مستلزم خشیت ہونا۔ مگر محاورات میں اس ترکیب سے علم کا مستلزم خشیت ہونا بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر دوسری آیت میں ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كانه ولي حميم وما يلقها الا الذين صبروا
بدی کو اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ پھر دفعۃً وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی گویا خالص دوست ہو جائے گا اور یہ بات انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صابر ہیں۔

یعنی بدی کا بدلہ بھلائی سے صابرین ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی ترکیب جو انما یخشی اللہ من عباده العلماء (اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرا کرتے ہیں) میں ہے۔ کیونکہ نفی کے بعد استثناء موجب حصر ہے مگر اس آیت سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خال دخل ہے اور یہ کہ صبر ہی سے یہ بات

حاصل ہوتی ہے ورنہ بظاہر اسلوب عقلی کے مطابق تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ صبر کے بدوں یہ بات نصیب نہیں ہوتی گویا صبر اس صفت کے لئے شرط ہے اور وجود شرط کافی ہے مگر کمال ایمان کے واسطے یہ خشیت کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لئے خشیت عالی کی ضرورت ہے جس میں ہر وقت عظمت و جلال خداوندی کا استحضار رہتا ہے جہنم کا عذاب ہر دم پیش نظر رہتا ہے اور اسی درجہ کمال سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مومن

(نہیں زنا کرتا زانی جب کہ مومن ہو یعنی زنا کی حالت میں ایمان نہیں رہتا)

یہاں محض ایمان اعتقادی مراد نہیں جس کے ساتھ اعتقادی خشیت ہوتی ہے بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے اب مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن زنا نہیں کر سکتا اور ہم بہت سے مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس میں مومن اعتقادی مراد نہیں بلکہ مومن حالی مراد ہے۔

غرض اس آیت میں علماء کی بھی اصلاح ہو گئی اور عوام کی بھی اصلاح ہو گئی اور میری تقریر سے سالکین کے شبہات بھی رفع ہو گئے اور مخالفین اسلام کے بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دلالت حکمیہ کے اعتبار سے تو اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ علم خشیت کو مستلزم ہے اور دوسری ترکیب سے جس کو دلالت لفظیہ کہنا چاہیے یہ معنی ہوئے کہ خشیت علم کو مستلزم ہے گویا طرفین سے تلازم ہے اگر کسی میں علم ہے تو ان شاء اللہ علم سے خشیت پیدا ہو جائے گی اور کسی میں خشیت ہے تو وہ خشیت علم کی طرف متوجہ کر دے گی تو یہ تلازم ایسا ہو گیا جیسا ایک شاعر نے کہا ہے

بخت اگر مدد کندا منش آرم بکف گر بکشد ذہ طرب و رکشم زہ شرف

(خوش قسمتی ہے کہ ان کا دامن ہاتھ آ جائے اور پھر وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہے ہم کھینچ لیں تب بھی)

مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے علم کو مقدم کر دیں اور خشیت کو مؤخر چاہے برعکس اور ایک حقیقت یہاں ایسی ہے کہ اس کے اعتبار سے اگر چاہیں دونوں کو ساتھ کر دیں کیونکہ دو چیزوں میں تقدم و تاخر بالذات اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ایک علت ہو اور ایک معلول ہو اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کسی تیسری شے کے معلول ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں معاً موجود ہوتی ہیں تقدم و تاخر باقی نہیں رہتا تو یہاں بھی ایک تیسری شے ایسی ہے جو علم و خشیت دونوں کی علت بن سکتی ہے وہ کیا ہے جذبہ حق عنایت حق اگر جذبہ حق متوجہ ہو جائے تو اس صورت میں یہ دونوں ایک دم سے پائے جائیں گے۔ علم بھی اور خشیت بھی تو اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ دونوں کو ایک دم ہی سے عطا فرمادیں۔

خشیت کی ضرورت

صرف ایک جزو آیت کارہ گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک مختصر بات کہہ دوں کہ اسکے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان اللہ عزیز غفور بے شک اللہ تعالیٰ زبردست بہت بخشنے والے ہیں۔
 اوپر تو علم کی فضیلت مذکور تھی کہ علماء ہی حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اب اس جملہ میں خشیت کی ضرورت بیان فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے ڈرنے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں۔ یہ تو ترہیب تھی آگے ثمرہ خشیت مذکور ہے کہ وہ غفور ہیں۔ اپنے سے ڈرنے والوں کو بخش دیتے ہیں اس میں بتلادیا کہ خشیت کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اس سے مغفرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ترغیب ہے یا یوں کہا جائے کہ عزیز میں اپنا مالک ضرر ہونا بتلایا ہے اور غفور میں مالک نفع ہونا اور ان دونوں سے خشیت کی ضرورت یوں ثابت ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ سے ڈرنا اس لئے ضروری ہے کہ ضرر و نفع سب ان کے ہاتھ میں ہے کہیں وہ تم کو مضار میں مبتلا اور منافع سے محروم نہ کر دیں۔

علم اور خشیت

چنانچہ حق تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں انما یخشى الله من عباده العلماء اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ لا یخشى الله من عباده الا العلماء جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ”لا خشية الا بالعلم نہ کہ لا علم الا بالخشية پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا صلوة الا بطهور کہ نماز بدوں وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا بدوں وضو کے نہ ہوگا یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدوں علم کے اس کو بھی نہیں ہوتی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت لازم ہو کیونکہ خشیت علم کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلوم کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود مشروط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء شرط انتفاء مشروط کو بیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدوں علم کے ہو گیا ہو تو علم لوازم خشیت سے ہو انہ کہ خشیت لوازم علم سے۔

خشیت کے لئے علم ضروری ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ جس وعظ پر میں آج کل نظر اصلاحی کر رہا ہوں اس میں انما یخشى الله من عباده العلماء کی تفسیر میں نے بیان کی ہے۔ علم کے لئے خشیت لازم سمجھتے ہیں یہ آیت کا مدلول ہی نہیں

اور وقوعاً بھی صحیح نہیں تخلف مشاہد ہے البتہ خشیت کے لئے علم شرط ہونے کی وجہ سے لازم ہے اور یہی مدلول ہے آیت کا غرض یہ تو ممکن ہے کہ علم ہو اور خشیت نہ ہو مگر یہ ممکن نہیں کہ خشیت ہو اور علم نہ ہو خواہ وہ علم درس سے حاصل نہ ہوا ہو۔ آخر جب کسی خوف کی چیز کو جانتا ہی نہیں اس کا علم ہی نہیں تو خوف کس چیز سے ہوگا خلاصہ یہ ہے تقریر کا کہ علم خشیت کی شرط ہے اس کی علت نہیں جب یہ بیان ہو رہا تھا طلبہ منہ تک رہے تھے کہ یہ کیا بیان ہو رہا ہے بعد وعظ کے بعض طلبہ نے کہا کہ ہم تو بڑی غلطی میں مبتلا تھے میں نے کہا تم کیا بعض بڑے بڑے علماء اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ علم صحیح دل میں ڈال دیتے ہیں۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ

ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ يُآذِنُ

اللَّهُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا کے بندوں سے) پسند فرمایا پھر بعضے ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے والے اور بعضے ان میں خدا کے حکم سے نیکیوں میں ترقی کئے جاتے ہیں یہ بڑا فضل ہے۔

تفسیری نکات

نفس کی اہمیت

ظاہر ہے کہ منہم ظالم لنفسہ و منہم مقتصد سابق بالخیرات الذین اصطفینا کی قسم ہیں اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے پس اصطفیٰ ظالم لنفسہ کو بھی شامل ہوا بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفیٰ باقی رہتا ہے تو ضروری اشتغال دنیا کیسے منافع دین ہو سکتا ہے بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کے کتے ہیں ہم سے دین کا کام کیا ہو سکتا ہے تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس ذلت و بے حیثیتی کا اقرار کیا جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی نہیں کیا اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے ہیں اہل دین کے لئے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں جیسے مسجد کے مینڈھے اس پر بطور جملہ معترضہ کے ہنسی کی حکایت یاد آگئی ایک طالب علم کو کسی متکبر نے کہہ دیا مسجد کا مینڈا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں اور اس کے جواب میں

لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے مگر دنیا کا یہ کتا اقراری لقب ہے اور المریوخذ باقرارہ بالجملہ ایسے القاب اپنے لئے یا غیر کے لئے تراشنا ممنوع ہے قال اللہ تعالیٰ لاتنازوا بالاللقاب بنس لاسم الفسوق بعد الایمان حدیث شریف میں آیا ہے لیس لنا مثل السوء عجیب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو انکسار اور تواضع سمجھتے ہیں۔

مقتصدین کی مدح

بس انسان کا بڑا کمال اقتصاد و اعتدال ہے تمام حکماء کا اس پر اتفاق ہے انہی لوگوں کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے یعنی مقتصدین کی چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں فمنہم مقتصدو ما یجحد بآیاتنا الا کل ختار کفور اس مقام پر اہل کتاب کے بارہ میں ارشاد ہے منہم امة مقتصدو و کثیر منہم ساء ما یعملون ایک مقام پر ارشاد ہے و کذلک جعلناکم امة و سطا

اس سے صاف معلوم ہوا کہ اقتصادی توسط ہی بڑا کمال ہے اور یہی مطلوب ہے پس قرآن و حدیث سے ثابت ہو گیا ہے اقتصاد ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ اب میں ایک شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جو قرآن ہی سے پڑ سکتا ہے مگر ان لوگوں کو جو محض ترجمہ دیکھ کر مولانا بن جاتے ہیں اشکال یہ ہے کہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم اور ثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا فمنہم ظالم لنفسہ و منہم مقتصد و منہم سابق بالخیرات باذن اللہ پھر ہم نے وارث کئے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنا اور کوئی ان میں سے نیچ کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہے خوبیاں لے کر اللہ کے حکم سے۔

یہاں امت محمدیہ کی تعریف کی گئی ہے کہ امم سابقہ کے بعد ہم نے اپنے ان بندوں کو کتاب الہی کا وارث بنایا جن کو ہم نے برگزیدہ کیا ہے پھر ان میں بعض تو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی گناہ گار ہیں اور بعض میانہ رو مقتصد ہیں اور بعض سابقین بالخیرات ہیں۔ یہاں امت محمدیہ کے لئے کیسی بشارت ہے کہ ان کے گنہگار بھی برگزیدہ بندوں میں داخل ہیں تو یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتصاد اعلیٰ درجہ نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک درجہ ہے جن کو سابقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ذرا اس اشکال کا جواب وہ لوگ بیان تو کریں جو محض لیڈری سے مولانا بن گئے ہیں۔ فہم القرآن آسان نہیں اس کے لئے پورے قرآن کا احاطہ ضروری ہے اور علوم قرآن سے واقف ہونا لازمی ہے اس کا جواب لیڈر نہیں دے سکتے۔ بلکہ یہ شبہ عربی داں علماء ہی سے حل ہو گا۔ ان کے یہاں اس کا جواب بہت سہل کہ قرآن کے محاورہ میں اقتصاد کبھی اعتدال کے معنی میں آتا ہے اور کبھی توسط بین الاعلیٰ والادنی کے معنی میں آتا ہے اور سورۃ فاطر کی آیت مذکورہ میں دوسرے معنی مراد ہیں اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اقتصاد بالمعنی الاول بھی اعلیٰ درجہ نہ ہو۔

أَوَلَمْ نَعْمَرَكُمْ قَالَتْ ذَكَرْ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ النَّذِيرُ

ترجمہ: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے۔ اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا۔

تفسیری نکات

جوانی کی عمر بھی تذکر کے لئے کافی ہے

اولم نعمرکم اور جاءکم النذیر میں عطف من قبیل عطف الخاص علی العام ہے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو اتنی عمر دی تھی جس میں تذکر ممکن تھا اور اتنی عمر ملنا جوانوں کو بھی عام ہے پھر اس میں بعض پر تو بڑھا پا بھی آ گیا اس سے اس خیال کا رد ہو گیا کہ آیت کے مخاطب بوڑھے ہی ہیں جوان نہیں ہیں خوب سمجھ لینا چاہیے۔

نذیر کی تفسیر

ایک قول یہ ہے کہ نذیر سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ناسین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن سے تبلیغ احکام الہی ہوتی ہے دوسرا قول یہ ہے جو ایک حدیث کے موافق ہے گویا وہ حدیث اس کی تفسیر کرتی کہ نذیر بڑھا پا ہے خواہ حدیث میں تمثیلاً ہو یا تعیناً ہو یہ ضرور ثابت ہوا کہ بڑھا پا بھی ڈرانے والا ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جوانی تو کھوئی ہی تھی بڑھاپے میں بھی تمہاری غفلت نہ گئی اور آنکھ نہ کھلی کہ کچھ سامان آخرت کا کر لیتے۔

آیت میں سب غافلین کو خطاب ہے

یہ خطاب عبارة النص سے خواہ کفار ہی کے لئے ہو مگر بدالالت النص خواہ بالقیاس باختلاف مراتب تمام ان اشخاص کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو بناء خطاب یعنی غفلت میں شریک ہیں۔

اصلاح کے لئے ایک مراقبہ

اس میں حق تعالیٰ نے اصلاح کے لئے ایک مراقبہ کی تعلیم فرمادی کہ عمر جلد جلد گزرنے اور ختم ہونے کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظُهُرِهِمْ دَابَّةً

وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ

كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ۝۱۵

ترجمہ: اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی تنفس کو زمین پر نہ چھوڑتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک معاد معین (یعنی قیامت) تک مہلت دے رہا ہے سو جب ان کی وہ معاد آ پہنچے گی (اس وقت) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا۔

تفسیری نکات

عجیب و غریب ربط

بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے ہیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ بَشَرٍ

کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے۔

نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے سو بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور زے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جوتیاں لگائیں مگر قدر و منزلت ہیں گھٹائی بھلا ایسا آ قائل سکتا ہے ایسے آقا کا یہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کر رہے ہیں؟

سُورَةُ يٰس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يٰس ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

ترجمہ: یٰس ۝ یسین قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بے شک آپ منجملہ پیغمبروں کے ہیں

سورة یسین کی تلاوت کی فضیلت

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایک مرتبہ جو شخص سورہ یسین شریف پڑھے اس کو سات قرآن شریف پڑھنے کا ثواب ملتا ہے فرمایا کہ سات نہیں دس کا ثواب ملتا ہے عرض کیا کہ مجھ کو سات ہی یاد تھا مگر عرض کرنے سے غرض یہ ہے کہ ایک شخص نے تو صرف سورہ یسین شریف پڑھی اور ایک شخص نے دس قرآن شریف پڑھے تو کیا اس کا اور اس کا ثواب برابر ہوگا جواب میں فرمایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ (یسین شریف پڑھنے سے) اجر تو دس ہی قرآن شریف پڑھنے کا ملے گا مگر وہ انوار میسر نہ ہوں گے جو کامل دس قرآن پڑھنے سے ہوں گے اور صاحب غیب کی کس کو خبر ہے انا عند ظن عبدی بی کیا کچھ عطا فرماؤں کوئی ان چیزوں میں ضابطہ تھوڑا ہی ہے۔

سُبْحَنَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ

أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ: وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے۔ اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو (تمام لوگ) نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

قرآن کوئی طب اکبر نہیں

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تخم میں

ایک نر اور ایک مادہ ہوتا ہے میں کہتا ہوں خبر یہی ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے یا نہیں۔ کئی مہینے تک سوچتا رہا لیکن کہیں نہ ملا۔ سبحان اللہ! صاحب قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے جیسا کوئی طب اکبر میں جوتا بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے۔ وہی فتویٰ اس کی نسبت بھی دینا چاہیے۔

غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی جب اس نے یہ آیت پڑھی۔

ازواج کا معنی

وہ ذات پاک ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات کے قبیل سے بھی تو بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صراحتہ موجود ہے۔ تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص یہاں میاں بیوی اور نر و مادہ کے سمجھے۔ حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑ کے ہیں خواہ کسی چیز کا جوڑ ہو حتیٰ کہ زوجی الخف والنعل بھی کہتے ہیں۔ زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ میاں بیوی کو بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھالاؤ یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھالاؤ تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھالاؤ۔ پس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کئے ہیں کہ اگر ایک انا رکھنا ہے تو دوسرا بیٹھا ہے علیٰ ہذا۔ لیکن ان مجتہد صاحب نے ان ازواج کا ترجمہ زن و شوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰﴾

”وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات سے زمین کے قبیل سے بھی اور ابن آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔“

کسی نے قرآن سے دانہ کا نر مادہ ہونا ثابت کیا ہے

ایک صاحب نے قرآن شریف سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ دانہ میں نصف مادہ اور نصف نر ہوتا ہے یہ بھی سائنس جدید کی تحقیق ہے اس کے لئے ان کو یہ آیت مل گئی۔ سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض و من انفسہم و مما لا یعلمون معلوم ہوا کہ مما تنبت الارض میں بھی ازواج یعنی میاں بی بی ہیں جو جس کو سمجھ میں آتا ہے وہ کہتا ہے نہ معلوم یہ لوگ واذا النفوس زوجت کے کیا معنی کہیں گے ترویج تفصیل ہے زوج سے اس کے معنی ان کی تقریر کے موافق میاں بی بی بنانے کے ہوئے تو یہ معنی ہوئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے نکاح کرائے جائیں گے۔

سائنس کو دین کے مطابق کرنا چاہئے نہ بالعکس

قرآن شریف کو کیا کھیل بنایا ہے لوگوں نے نہ معلوم عقلیں کیسی مسخ ہوئی ہیں۔ یہ طرف داری دین کی ہے یا سائنس کی۔ موٹی سی بات ہے کہ دین کی طرف داری تو جب ہوتی کہ دین کو تسلیم کر کے سائنس کو اس کے مطابق کرتے یہ طرف داری دین کی کیسی ہوئی کہ سائنس کو تسلیم کر کے دین کو اس کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے علماء اہل حق اور آجکل کے لوگوں کی روش میں علماء اسلام نے بھی احکام شریعت میں عقلی مصالح دریافت کی ہے اور اس بحث پر کتابیں لکھی ہیں جن سے یہ لوگ بھی استدلال کرتے ہیں کہ علماء حال کا جمود اور تعصب ہے کہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں جب ہم عقلی اور نقل کو مطابق کر کے دکھاتے ہیں حالانکہ ان کے علماء نے بھی ایسا کیا ہے یہ صرف مغالطہ ہے۔

سائنس کو قرآن میں داخل کرنا ہدم دین ہے

اگلے علماء نے دین کو مقدم رکھ کر عقل سے اس کی مصلحتیں دریافت کی ہیں اور یہ لوگ عقل کو مقدم رکھ کر دین کو اسکے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ سائنس کو قرآن میں داخل کرنا چند روز میں دین کو بالکل منہدم کرنا ہے کیونکہ سائنس کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں آج جو بات بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے وہ کل کو ایسی غلط ثابت ہوتی ہیں کہ اس پر وہ ہی لوگ ہنستے ہیں جن کی وہ تحقیق تھی۔ آج اگر قرآن کو بھی اسکے مطابق کر لیا تو جس وقت اس کی غلطی ثابت ہوگی اس وقت قرآن کریم کا غلط ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ پھر قسمت کو روئو! لوگ ادھر ادھر کے مسائل کو قرآن شریف سے ثابت کرنے کو فخر سمجھتے ہیں۔

قرآن کا فخر یہ ہے کہ غیر دین اس میں نہ ہو

قرآن کا فخر یہ ہے کہ اس میں غیر دین نہیں ہے جیسا کہ طب اکبر کے لئے فخر ہو سکتا ہے۔ تو یہ ہی کہ اس میں جو تیاں گانٹھنے کا بیان نہیں ہے نہ یہ کہ اس میں کہیں جو تیاں گانٹھنے کی ترکیبیں بھی درج ہیں۔ اگر کوئی طب اکبر میں یہ صنعت بھی شامل کر دے تو واللہ کوئی اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ میں نے بکثرت وعظوں میں اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ لوگ ان کو خشک مضامین کہتے ہیں اور تر مضامین وہ ہیں جن میں ڈوب مرنا پڑے گا آجکل کے حامیان اسلام حامیان اسلام نہیں ماحیان اسلام ہیں ان کی یہ حالت ہے

یکے بر سر شاخ دین مے برید خداوند بستاں نگہ کردو دید

بگفتا گریں مرد بد میکند نہ بامن کہ بانفس خود میکند

فروغی مسائل اسلام تو عقل سے ثابت کرتے ہیں اور اس کی خبر نہیں کہ اس طرح جڑ اسلام کی کٹتی جاتی ہے۔ اس مرض میں ہمارے بھائی بند بھی یعنی مولوی لوگ بھی مبتلا ہیں اور اس کی وجہ صرف حب شہرت اور بعض میں حب مال اور اپنی ضرورتوں کو اہل دنیا کے پاس لیجانا ہے ان کے عطایا لینے کے بعد ان سے دہنا پڑتا ہے اور ان کی حسب خواہش دین کو سائنس کے ساتھ مطابق کرنا پڑتا ہے ورنہ ان کی نظروں میں وقعت نہ ہو اور عطایا میں کمی ہو جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس نے ناس کر رکھا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۶ تا ۱۸۷)

سُورَةُ الصَّافَاتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يُبْنِيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ قَالَ

يَا بَنِيَّ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿١٠﴾

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّاهُ لِلْبَجِيِّينَ ﴿١١﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا بُرْهِيمُ ﴿١٢﴾ قَدْ

صَدَّقْتَ الرَّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾ إِنَّ هَذَا لَهُوَ

الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٤﴾ وَقَدَيْنَاهُ بِذُبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾

ترجمہ: (برخوردار) اسماعیل علیہ السلام) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں سو تمہاری کیا رائے ہے وہ بولے ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے غرض جب دونوں نے تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو کروٹ پر لٹایا اور ہم نے کہا اے ابراہیم (علیہ السلام) تم نے خواب کو سچ کر دکھایا وہ وقت بھی عجیب تھا جب ہم مخلصین کو بدلہ دیا کرتے ہیں حقیقت میں تھا بھی بڑا امتحان اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ ان کے عوض میں دیا۔

تفسیری نکات حقیقت قربانی

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصلی فعل ذبح ولد تھا اور ذبیحہ کا ذبح کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ اور فدیہ تھا باقی اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ وہ ولد ذبح کون ہے اسماعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ

السلام ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اسمعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح ہے جس کی دلیل تو یہ ہے کہ ذبح ولد کا قصہ بیان فرما کر حق تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے وبشر ناه باسحق نبیامن الصلحین (اور ہم نے ان کو اسحق (علیہ السلام) کی بشارت دی کہ نبی ہو کر صالحین سے ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بشارت اسحاق سے مقدم ہے۔

سنت ابراہیم کا مصداق

اور اگر لفظ سنت پر نظر کی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت نہیں کیونکہ سنت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے۔ پس سنت ابراہیم کا مصداق وہ فعل ہونا چاہیے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلامی نفس ہے یعنی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کو فنا کہتے ہیں یہی حضرت ابراہیم کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا اذ قال له ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین اور ذبح ولد اس کی صورت تھی گو اسلام نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ ان کو قتل نفس کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتل نفس سے بھی اشد ہے چنانچہ ہر صاحب حس سمجھتا ہے خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کلفت سے سہل ہوتی ہے اولاد کی حفاظت کے لئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور ذبح ولد عمر کا سانحہ ہے۔

استعداد نبوت

فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو حضرت اسمعیل علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ انسی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ اگر حضرت اسمعیل راضی نہ ہوئے تو میں اپنے ارادے سے باز رہوں گا بلکہ مقصود امتحان تھا کہ ان کا جواب سنیں مگر سبحان اللہ حضرت اسمعیل علیہ السلام بھی آخر نبی ہونے والے تھے اگرچہ اس وقت کم سن تھے لیکن استعداد نبوت سے بلا تاثر یہ جواب دیا کہ یا بت افعل ماتو مر ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین

اصل مقصود تسلیم و رضا ہے

فرمایا کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے اس جواب سے کہ ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین ایک عجیب مسئلے پر استدلال ہو سکتا ہے جو کہ ذکرین کے لئے بے حد مفید ہے یعنی اکثر ذکرین اپنے ذکر میں طالب لذت ہوتے ہیں اور وہ خدا کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ لذات کے طالب ہوتے ہیں حالانکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ تسلیم ہو اور طلب رضا ہو گو لذت نہ ہو یہ مسئلہ من الصبرین سے مفہوم ہو اور مخفی امتثال بر صبر ہو ورنہ اگر لذت مقصود ہوتی تو بجائے من الصبرین کے من المثلذ ذین فرماتے مگر من الصبرین فرمایا اور صبر ہمیشہ مخفی اور نیمزگی ہی میں ہوتا ہے اس سے لذت

کا غیر مقصود ہونا ثابت ہو گیا بلکہ بعض محققین کا قول ہے کہ جس عبادت میں لذت نہ ہو وہ ایک حیثیت سے لذت والی عبادت سے افضل ہے کیونکہ جب عبادت میں لذت مقصود ہوئی تو ممکن ہے وہ بوجہ لذت کے ادا کی گئی ہو اور امتحان اور کمال اس امر میں ہے جو خلاف طبع ہو مگر آج کل طالبین کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شیوخ میں خود خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں حالات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں میں سے اور مشائخ میں سے اکثر خود بھی فن تصوف سے بے خبر ہیں مگر جبہ مشیخت زیب تن ہے اور تعلیم دیتے ہیں ان کو یہی خبر نہیں ہوتی کہ اصل مرض طالب میں کیا ہے اور اس کا علاج مناسب کیا ہے حالانکہ یہ نہایت ضروری ہے دیکھو اگر طبیب جسمانی مرض سے واقف نہ ہو تو اس کا علاج ہمیشہ مضر ہوتا ہے اسی طرح ان خام کاروں سے مدۃ العمر مریدوں کی تشویش دور نہیں ہوتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان

اس کی نسبت بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یا بست افعل ماتو مر کہ اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو یہ شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ تردد تھا

کارپا کاں را قیاس از خود بگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر و شیر یکساں ہیں)

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال ماذاتری (تمہاری کیا رائے ہے) میں اور ان کے جواب افعل ماتو مر (وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا) میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں تصریح تنقیص ہے۔

وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام میں کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا اس واسطے وہ اسی درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے مگر اس توجیہ سے میرا تو رونگلا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب درنگ و خال و حظ چہ حاجت روئے زیبارا

(یعنی جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خدو خال کی احتیاط نہیں)

نا تمام اس معنی کو کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی نور محمدی کے جدا ہو جانے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاف (تخمینی) اور رجم بالغیب ہے غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا وہ نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے۔ آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا کہ اس کے منتقل ہونے کے بعد ابد الابد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں جو ان جزافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔

اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سوخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا اس واسطے فرمایا فانظر ماذا تری (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں

يَا بَتِ افْعَلْ مَا تَوْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

(اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے دیکھیں گے) اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں ان شاء اللہ کہ اگر خدا کو منظور ہوا پس یہی تو کمال ہے ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں

شبابش آں صدف گر چناں پرورد گہر آباد از و کرم و اینا عزیز تر
ان کی اولاد بھی خدا کی عاشق تھی چنانچہ حضرت اسماعیل نے فرمایا

يَا بَتِ افْعَلْ مَا تَوْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

کہ اے باپ جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالئے ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے یعنی میں تحمل و استقلال سے کام لوں گا فلما اسلما و تلہ للجبین

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پیشانی کے بل ڈال کر ذبح کرنا شروع کیا اور پورا زور لگا دیا مگر وہاں اثر بھی نہ ہوا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم تھا اذبح اور سکین کو حکم تھا لا تذبح (مبینا للمفعول) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھلا کر چھری سے کہا کہ تجھے کیا ہوا کاٹتی کیوں نہیں اس نے کہا اے ابراہیم تم اپنا کام کرو میں اپنا کام کروں گی مجھے اور حکم ہے تم کو اور حکم ہے۔

واقعی ظاہر میں یہ اسباب مؤثر نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں سوائے حضرت حق کے کوئی مؤثر نہیں یہ اسباب بھی ان کے حکم کے بعد ہی کام کرتے ہیں مولانا اسی کو فرماتے ہیں

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال سکین کو حکم تھا کہ کند ہو جاوہ کند ہو گئی اور حضرت ابراہیم کو حکم تھا کہ ذبح کرو وہ ذبح کی کوشش میں تھے کہ غیب سے آواز آئی: یا ابراہیم قد صدقت الرؤیا
اے ابراہیم واقعی تم نے اپنے خواب کو سچا کر دیا

اصل مقصود عمل ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل مقصود عمل ہے ترتب نتیجہ مقصود نہیں یہ سالکین کے بہت کام کی بات ہے کیونکہ آج کل بہت سالکین ثمرات کے منتظر رہتے ہیں اور جب اعمال پر کیفیات و ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو وہ عمل کو بے کار سمجھتے ہیں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا فعل ناقص تھا؟ آپ کے مذاق پر تو ناقص ہی ٹھہرے گا کیونکہ ان کو حکم تھا ذبح کا اور ذبح پر ثمرہ کا ترتب و وقوع کہاں ہوا صرف قصد ذبح و سعی فی الذبح کا تحقق ہوا تھا معلوم ہوا کہ مقصود عمل ہے نتیجہ مقصود نہیں کیونکہ عمل تو کسی درجہ میں آپ کے اختیار میں ہے اور نتیجہ صرف حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان سے وہی شے مقصود ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہو پس کار خود کن کار بیگانہ ممکن

تم اپنے کام میں لگے اور نتیجہ کی فکر میں نہ رہو بلکہ نتیجہ کے متعلق یہ مذاق پیدا کرو

یا ہم اور ایانیا ہم جتوئے من کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

غرض ابراہیم علیہ السلام کے فعل پر نتیجہ ذبح مرتب نہیں ہوا لیکن پھر بھی حق تعالیٰ نے ان کے فعل کی نہایت تحسین ظاہر فرمائی ہے کیونکہ جب انہوں نے اپنی طرف سے سب کچھ کر لیا تو بڑا کام کیا وہ جس وقت ذبح ولد کے لئے تیار ہوئے تھے اور ان کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اس وقت تو ان کو یہ علم نہ تھا کہ چھری کو لا تذبح کا حکم ہو جائے گا اور وہ اپنا کام نہ کرے گی بلکہ وہ تو یہ سمجھ کر تیار ہوئے تھے کہ چھری پھیرتے ہی بچہ کا کام تمام ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کو خوب تیز کر چکے تھے اب اس کے بعد نتیجہ کا مرتب نہ ہونا ان کے اختیار سے باہر تھا پس واقعی انہوں نے بہت بڑا کام کیا۔

ابتداء قربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا کذلک نجزی المحسنین ان هذا لهو البلاء المبین وفلینہ بذبح عظیم اس کے بعد ایک دنبہ اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہو کر آ گیا اور اس کو بجائے ان کے ذبح کیا گیا۔ یہ قربانی کی ابتداء ہے۔

سُورَةُ ص

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اجْعَلِ الْاِلَهَةَ الْهَآ وَاحِدًا اِنَّ هَذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ

ترجمہ: اور کیا یہ شخص سچا ہو سکتا ہے کہ اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی یہ عجیب بات ہے۔

تفسیری نکات جعل کے دو معنی

آیۃ اجعل الالهة الها و احدا ان هذا لشيء عجاب

جو لوگ وحدۃ الوجود کے متعارف معنی کے قائل ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں حاصل اس استدلال کا یہ ہے کہ کفار نے جعل الالهة الها و احدا پر ہمزہ استفہام داخل کر کے اس جعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تو ضرور ہے کہ آپ سے اس اتحاد کا دعویٰ کبھی صادر ہوا ہو ورنہ اس نسبت پر قرآن میں انکار ہوتا تو مستدللین کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جو لا الہ الا اللہ کی تبلیغ فرمائی ہے اس کلمے کے معنی یہی اتحاد ہیں کہ کوئی معبود باطل غیر اللہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) سب عین اللہ ہے اور چونکہ اس باب میں اللہ باطل او غیر آلیہ میں کچھ فرق نہیں لہذا ہر وہ چیز بھی جس کو ہم غیر اللہ کہتے ہیں سب گویا نعوذ باللہ عین اللہ ہوں گی قائلین وحدۃ الوجود کا یہ استدلال ہے میں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ معنی اس جعل کے یہ ہیں کہ غیر اللہ کی معبودیت کو نفی کر کے صرف ایک خدا کو معبود کہا مگر اس پر یہ قدح کیا گیا کہ آیت میں جعل کے دو مفعول ہیں جس کا مدلول ایک شے کو دوسری شے بنادینا خواہ صنعت یا زعماً لیکن اس قدح کے باوجود بھی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ معنی آیت کے یہی ہیں لیکن کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی سو بجمہ اللہ اب سمجھ میں آگئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

ومن جعل همومہ ہماً واحداً کفاه اللہ همومہ کلہا اس حدیث میں ظاہر ہے کہ جعل کے یہی معنی ہیں کہ تمام ہموم دنیاوی کو چھوڑ کر صرف ایک آخرت کے ہم کو اختیار کرے نہ یہ کہ ہم دنیا کو ہم آخرت بنا دے۔
اجعل لا الہ الا الہاً واحداً سے بعض غلاۃ فی التوحید نے اپنی توحید مزعوم پر استدلال کیا ہے کہ کفار اہل لسان کے اس انکار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وحی کا دعوے سب الہ کو الہ واحد کے ساتھ متحد قرار دینے کا تھا۔
جواب یہ ہے کہ یہ جعل تصویر کے لئے نہیں کہ مفید مدعاے مذکور ہو بلکہ اس کا حاصل مفعول اول کا ابطال اور مفعول ثانی کا اثبات ہے اس محاورے کی نظیر حدیث ہے من حصل العموم ہما واحداً ہم الاخرۃ کفاه اللہ همومہ کلہا ظاہر ہے کہ حدیث میں اتحاد ہموم کا ہم واحد کے ساتھ مقصود نہیں بلکہ ہموم دنیویہ کی نفی اور ہم آخرت کا اثبات مقصود ہے۔ (مقالات حکمت ص ۱۷۶، ۱۷۵)

إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَجَّةً وَلِي نَجَّةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ
اكَفُلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝۱۶

ترجمہ: پھر ایک شخص بولا کہ صورت مقدمہ کی یہ ہے کہ یہ شخص میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنیاوی ہیں اور میرے پاس (صرف) ایک دنیوی ہے۔ سو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور بات چیت میں سمجھ کو دباتا ہے۔

تفسیری نکات

حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ امتحان

اب تمہیں واقعہ کی تحقیق کرنا چاہیے اور یہیں سے آپ کو حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ کی ایک لطیف تفسیر معلوم ہو جائے گی جو قرآن میں مذکور ہے۔ ان ہذا اخی له تسع و تسعون نعمة و لی نعمة جس کے متعلق واعظوں نے ایک بڑا طومار اختراع کیا ہے اور ریا کا قصہ بیان کیا ہے سو خوب سن لیجئے کہ تفسیر قرآن میں اس واقعہ کا کچھ دخل نہیں بلکہ وہ قصہ ظاہر اُشان نبوت کے بھی خلاف ہے اسی لئے محققین نے اس کو رد کر دیا ہے اور اس کو اسرعیلیات میں سے کہا ہے اس آیت میں جو حضرت داؤد کا امتحان مذکور ہے اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ ان کے پاس دو شخص مدعی و مدعی علیہ بن کر آئے ایک نے دعویٰ کیا کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنیاوی ہیں اور میرے پاس ایک دنیوی ہے یہ میری دنی چھین کر اپنے پاس سو پوری کرنا چاہتا ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے صرف مدعی کا بیان سن کر یہ فرمایا اس نے تجھ پر ظلم کیا اور واقعی اکثر شرکاء کی یہی

حالت ہے کہ زبردست کمزور کو دباننا چاہتا ہے اگرچہ داؤد نے یہ کلام بطور جملہ شرطیہ کے فرمایا تھا۔ فیصلہ کے طور نہیں فرمایا تھا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر یہ بیان صحیح ہے تو تجھ پر ظلم ہوا مگر چونکہ صورت وہ جملہ حملیہ سے شرط نہیں اور شرطیہ بھی ہوتا تب بھی مجلس قضاء کے مناسب نہ تھا بلکہ اول مدعی علیہ سے دریافت فرماتے پھر شہادت یا حلف کے بعد فیصلہ فرماتے مگر اس لغزش پر بہت جلد تنبیہ ہوئی اور سجدہ میں گر پڑے و ظن داؤد انما فتنه فاستغفر ربہ و خراکعہ و اناب (اور منشاء اس لغزش کا ایسا امر تھا جس میں ان مرافعہ کرنے والوں کی بھی غلطی کو دخل تھا وہ یہ کہ ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے یہ مرافعہ برسر اجلاس نہیں کیا بلکہ ایسے دن اور ایسے موقع پر مرافعہ کیا کہ اس دن اور اس موقع پر حضرت داؤد علیہ السلام فصل مقدمات کے عادی نہ تھے کیونکہ یہ دن ان کی عبادت کا تھا جس میں وہ مقدمات کا فیصلہ نہ کرتے تھے اور یہ موقع اجلاس کا موقع نہ تھا بلکہ عبادت گاہ تھی جس کے دروازے بند تھے مدعی اور مدعی علیہ دیوار سے پھاند کر آئے داؤد علیہ السلام کو ان کے اس طرح بے قاعدہ آنے سے وحشت و پریشانی بھی ہوئی و هل اتک نساء الخصم اذ تسور المحراب اذ دخلوا علی داؤد ففزع منهم قالو الاتخف ان تمام امور کے اجتماع سے یہ اثر ہوا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کے ساتھ اس طرح گفتگو فرمائی جس طرح نجی ملاقات میں گفتگو کیا کرتے ہیں چونکہ اجلاس فصل مقدمات کا نہ یہ موقع تھا نہ دن تھا نہ اہل مقدمات اس طرح آیا کرتے تھے اس لئے آپ سے لغزش ہو گئی گفتگو میں ان قواعد کا استحضار نہ تھا جو فصل مقدمات اور اجلاس کے وقت ضروری ہوتے تھے پس ہر چند کہ حضرت داؤد علیہ السلام معاملہ میں امور مذکورہ بالا کی وجہ سے معذور بھی تھے مگر انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان ہے ان کو ایسے عوارض کی وجہ سے بھی احکام میں ذہول نہ ہونا چاہیے اس لئے فوراً تنبیہ ہوا کہ مجھ سے لغزش ہوئی اور اس سے استغفار و توبہ کی۔

يٰۤاٰدُۢمُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ: اے داؤد (علیہ السلام) بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفسانی کا اتباع نہ کرو یہ تم کو اللہ کے راستہ سے بے راہ کر دے گی بیشک جو لوگ اللہ کی راہ سے گم ہوئے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا بسبب اس کے کہ وہ یوم آخرت کو بھول گئے۔

تفسیری نکات

اتباع ہوی کی مذمت

اس آیت شریفہ میں ہر چند کہ خطاب داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے کچھ داؤد علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ داؤد علیہ السلام کی طرف خطاب کرنے سے معنی اس مضمون کے اور زیادہ تقسیم ہو گئے اس لئے کہ جب بڑوں کو کسی امر کا خطاب کیا جاتا ہے اور ان کو باوصف ان کی صفت کے اس امر پر وعید کی جاتی ہے تو چھوٹے بطریق اولی مخاطب ہو جاتے ہیں طبیب اگر صحیح قوی کو کہے کہ فلاں شے نہ کھاؤ تم کو مضر ہوگی تو مریض ضعیف کو بطریق اولی اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت مفہوم ہوگی اسی طرح سے یہاں داؤد علیہ السلام کو خطاب ہے گویا مطلب یہ ہے کہ جب داؤد علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے اس حکم کے مامور ہیں اور مضمون بھی کوئی خصوصیات نبوت سے نہیں تو اوروں کو تو بطریق اولی اس حکم کی پابندی کرنی چاہیے اور وہ حکم جو کہ داؤد علیہ السلام کو اس آیت شریف میں کیا گیا ہے اتباع ہوی سے نہیں ہے اتباع ہوئی کی مذمت ہے یعنی اپنی جی چاہی بات پر عمل کرنا۔ اب ظاہر ہے داؤد علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی صاحب کتاب کہ زبور شریف ان پر نازل ہوئی ہے اور پیغمبر علیہ السلام عموماً اور ان میں جو صاحب کتاب ہیں خصوصاً ان کے تمام ملکات محمود اور جذبات طاہر مطہر اور نفوس نہایت مہذب ہوتے ہیں جب باوجود ان کے ان کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا حالانکہ ان کا نفس بالکل مہذب ہے اگر اس میں خواہش بھی ہوگی تو ظلمانی نہ ہوگی تو ہم تو جو کہ سر سے پائے گند درگند ہیں اگر خواہش نفسانی کی پیروی کریں گے بالکل ہلاک ہو جائیں گے اللہم احفظنا (اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ)

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرُوا أَلْوَالِ الْأَلْبَابِ ﴿۱﴾

ترجمہ: یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اسی واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

تفسیری نکات نزول قرآن کی غرض

اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم و عمل کا فائدہ حاصل کریں۔ لیدبرو اس علم کی طرف اشارہ ہے اور لیتذکر میں عمل کی طرف رب ہب لی ملکالا ینبغی لاحد من بعدی یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کیلئے ملنا مناسب نہ ہو۔

ضعفاء کے حق میں عین رحمت

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہر اس سے حرص و حسد کا شبہ ہوتا ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انہوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ من بعدی میں بعدیت زمانہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لئے خواہ مخواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لئے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر و تکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے من معی بلکہ من قبلی (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت و رسالت میں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں۔

ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے مطابق ہے

فرمایا کہ ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو وہ معجزہ دے کر بھیجا گیا جس کی جنس کا شیوہ اس زمانہ میں زیادہ تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر کا زور تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا زور تھا۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں سلطنت کا زور تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی رب ہب لی ملکالا ینبغی لاحد من بعدی یہ دعا طلب معجزہ ہے کیونکہ معجزہ میں دوسرے کی شرکت نہیں ہوتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں فصاحت و بلاغت زوروں پر تھی اس لئے حضور ﷺ کو باوجود اُمی ہونے کے فصاحت کا معجزہ دیا۔

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۸۹﴾

ترجمہ: یہ ہمارا عطیہ ہے سو خواہ دو یا نہ دو تم سے کچھ دارو گیر نہیں

ایک وعظ میں ان خاص لوگوں کے لئے فرمایا جو کہ خالص توبہ کر کے ذکر و شغل میں مشغول ہوں کہ بار بار گناہ کا یاد کرنا ان لوگوں کی حالت کے مناسب نہیں کیونکہ توبہ تو ہو چکی ہے جس کی قبول کی امید غالب ہے اب پھر بار بار کے گناہ کے یاد کرنے سے ذکر میں ایک قسم کا حجاب حائل ہو جاتا ہے اور ذکر میں نشاط نہیں رہتا۔ ہر چند کہ گناہ کا یاد کرنا فی نفسہ امر محمود ہے۔ مگر اسکی بھی ایک حد ہے۔ حد سے آگے کیسا ہی امر محمود ہو محمود نہیں رہتا۔ دیکھیے طبیب اگر کسی بیمار کے نسخے میں چھ ماشے سنا لکھے اور وہ مریض یہ خیال کر کے کہ یہ چیز مفید ہے جب طبیب نے لکھی ہے تو جتنی بڑھائی جائے گی فائدہ ہوگا تو لہ بھر اس سے زیادہ ڈال لے تو ظاہر بات ہے کہ سنا فائدے کی چیز تھی اور طبیب نے مفید سمجھ کر لکھی تھی مگر خاص ہی مقدار تک مفید ہے اور اس سے زائد مریض کے لئے سخت مضر ہوگی یہی حال اعمال باطنی کا ہے۔ نصوص میں تدبیر کرنے سے اسکا پتہ لگتا ہے چنانچہ اسی بناء پر حضرت شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ارشاد ہے کہ قبول توبہ کی علامت گناہ کا بھول جانا ہے یعنی اسکا خیال پر غالب نہ رہنا۔ مگر بعد توبہ ہو اور اگر قبل ہے تو وہ غفلت ہے اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ جن دوستوں میں کبھی مخالفت رہ چکی ہو اگر دوستی میں اسکا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ایک دوسرے کے دل پر میل آ جاتا ہے اور عورتوں میں یہ عادت زیادہ ہے کہ اتفاق و محبت کی حالت میں دشمنی کے زمانہ کے تذکروں کو لئے بیٹھتی ہیں جس سے محبت مکدر ہو جاتی ہے اور وہ نصوص جن میں غور و فکر کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہے یہ بین لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر اس میں ایک توبہ بحث ہے کہ ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ صاحب نبوت کے حق میں جو کہ معصوم ہے یہ بحث جدا گانہ ہے اسکو مسئلہ مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ پہلے گناہوں کی معافی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن پچھلے گناہوں کی معافی جو ابھی تک ہوئے ہی نہیں کیا معنی۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ خوف و خشیت کا غلبہ تھا اگر آپ کو آئندہ گناہوں کی معافی دے کر تسلی نہ دی جاتی تو اندیشہ تھا کہ غلبہ خوف سے اسی فکر میں آپ پریشان رہتے کہ کہیں آئندہ کوئی امر خلاف مرضی نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ کو آئندہ کے لئے بھی مطمئن کر دیا گیا۔ دوسری آیت اسکی موید یہ ہے کہ حق جل و علی سلیمان علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ هذا عطاءنا فامنن او امسک بغیر حساب اکمیں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بغیر حساب کو عطاءنا کے متعلق کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ عطا بے حساب ہے یعنی کثرت سے ہے اور دوسرا احتمال اور وہ بہت موجب معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ بغیر حساب کو فامنن اور امسک دونوں کے متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک رکھنے میں کوئی حساب اور مواخذہ نہیں چونکہ سلیمان علیہ السلام کو بوجہ غالبہ خوف کے ہر عطاء و امساک

میں یہ خیال رہتا کہ شاید یہ اعطاء یا امساک بر محل ہوا ہے یا نہیں۔ کہیں دین میں اسراف یا امساک میں بخل نہ ہو گیا ہو اور یہ خلجان مانع حضور خاص تھا تو اس لئے سلیمان علیہ السلام کو مطمئن کر دیا کہ اعطاء و امساک میں مطلقاً آپ سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا آپ اس کی فکر نہ کریں اور اصل کام میں لگے رہیں۔ مگر ایسے اشارات اہل خوف کے لئے ہیں کیونکہ اس سے خلاف امر اور بھی عصیان کھدور ہی مستبعد ہے۔ اب اس سے زیادہ خوف ان کے حق میں مضر ہے اس لئے ان کو اطمینان دلایا جاتا ہے۔
لا تَخَوْا هَيْسَتَ نَزْدَ خَانِقَانَ

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے استغفار میں و مانت اعلم بہ منی یا استغفرک مما تعلم ولا اعلم مطلب یہ کہ جو گناہ مجھ کو معلوم ہیں ان سے بھی معافی چاہتا ہوں اور جو معلوم نہیں اور آپ ان کو جانتے ہیں اس سے بھی۔ تو معلوم ہوا کہ توبہ کے وقت تمام گناہوں کا استحضار ضروری نہیں کہ خواہ نخواہ کرید کرید کر تلاش کیا جائے کہ یہ خود ایک مشغلہ مانع حضور ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ سب گناہ سے اجمالاً مغفرت مانگ لے اور توبہ کر کے اپنے کام میں لگے۔ دوسری جگہ آنحضرت ارشاد فرماتے ہیں۔ دعا میں کہ ومن خشیتک ماتحول بیننا و بین معاصیک یعنی اے اللہ اس قدر خشیت چاہتا ہوں کہ مجھ میں اور تیری نافرمانی میں آڑ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ خشیت مقصودہ کی بھی ایک حد ہے اس سے زیادہ یا تو مضر بدن ہے کہ آدمی مرجائے یا مضر روح ہے کہ مایوس ہو جائے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے اسئلک شوقا الی لقاءک فی غیر ضراء مضرة ولا فتنہ مضلة چونکہ شوق اور عشق کا غلبہ کبھی ہلاکت اور مضرت کی نوبت پہنچاتا ہے جس سے اعمال میں خلل پڑ جاتا ہے اور اصل مقصود اور ذریعہ قرب اعمال اور امتثال اوامر ہی ہے اور کبھی غلبہ شوق میں ادب کی حد سے گزر جاتا ہے اور حسن بے ادب جیسے اکثر عشاق غلبہ حالت میں کہتے ہیں کہنے لگتا ہے اور یہ بے ادبی موجب ضرر دین ہے۔ گو غلبہ کی حالت میں عفو ہو مگر کمال نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع ہیں ادب و اطاعت و محبت کے۔ اس لئے دعا میں فرماتے ہیں کہ اسئلک شوقا الی لقاءک فی غیر ضراء مضرة اس سے تو ضرر اول کی نفی ہو گئی جو سبب انقطاع اعمال ہو جائے اور اس کے بعد فرمایا ولا فتنہ مضلة اس سے ضرر ثانی کی نفی ہو گئی جو بے ادبی کی طرف مقتضی ہو جائے۔ ان سبب آیات احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر چیز محمود اپنی خاص تک ہے۔ حد سے بڑھ جائے تو محمود نہیں رہتی۔ بس شیخ اکبر کی تحقیق کا ماخذ درحقیقت غور اور تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث ہی ہے البتہ سخن شناسی اور فہم صحیح کی ضرورت ہے۔

چو بشنوی سخن اہل دل گولہ کہ خطاست
و کم من غائب قولا صحیحا
سخن شناس نہ دلیرا خطا اینجاست
وافۃ من اطع القیم

وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لَّيُؤْبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۚ

ترجمہ: جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزاد پہنچایا ہے

تفسیری نکات

آداب اسناد

بظاہر یہاں شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے فال حقیقی کو چھوڑ کر فاعل مجازی کی طرف فعل کی نسبت کی اس مصیبت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے لگے۔ حالانکہ صوفیہ کی بعض حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اسناد الی غیر بھی شرک ہے چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا انتقال ہوا اور وہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے تو سوال کیا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انہوں نے بہت سوچ کر عرض کیا کہ تو حید لایا ہوں ارشاد ہوا اما تذکر لیلۃ اللبن وہ دودھ کی رات یاد نہیں رہی قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک رات آپ نے دودھ پیا تھا صبح کو پیٹ میں درد ہو گیا تو ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا کہ رات دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر مواخذہ ہوا کہ اسی برتے پر تو حید کا دعویٰ کرتے ہو کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کرتے ہو مگر اس طریق کے آداب بہت ہیں واقعی ایک وقت میں غیر کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے اور ایک وقت فاعل حقیقی کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے چنانچہ آدم علیہ السلام فرماتے ہیں ربنا ظلمنا انفسنا انہوں نے ظلم کی اسناد اپنے نفس کی طرف کی سیر میں ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ تم نے اس فعل کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا آدم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا۔

لیک من پاس ادب نکذاشتم گفت من ہم پاس آنت داشتم

یعنی میں نے ادب کی رعایت کی اس لئے سیہ کو اپنی طرف منسوب کیا آپ کی طرف منسوب نہ کیا اس پر جواب عنایت ہوا کہ پھر میں نے تمہارے ادب کی رعایت کی ہے۔

سُورَةُ الزُّمَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى

اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۚ إِنَّ

اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ۝

ترجمہ: اور جن لوگوں نے خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلاف کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو (قوالاً) جھوٹا اور (اعتقاداً) کافر ہو۔

تفسیری نکات

شرک پر وعیدیں اور مشرکین کی حالت

ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے غرض یہ دونوں مشرک ہیں اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کمی کی بالکل یہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہو سکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے ان میں سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایت کرتے ہیں کہ ماقدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے

خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہیے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی میں ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مؤمنین کو جنت ملے گی غرض حق و باطل پر اس اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کما حقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں اول تو قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا ہے کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کو بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ ہوگا باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچہ سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونے والا ہے اور ایسی ایسی قمچیاں لائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلا دبلائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس کے بعد بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاوے گا کہ کس قدر دلیر اور بدطینت ہے کہ علم اول تو ایسے ہی قدر کی چیز ہے بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے کہ بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اس کو علم سکھانا ہے اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اسی کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیز ہیں توحید و رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے **الْم يٰۤاَتِكُمْ رَسُلٌ مِّنْكُمْ** یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ **بَلٰی وَلٰكِنْ حَقَّتْ کَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلٰی الْکٰفِرِیْنَ** یعنی پیغمبر آئے تو بیشک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا ان کی بات کو نہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے تو تینوں اصول دین اس آیت میں مذکور ہیں اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خدا تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اس لئے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ سید العارفین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **اَنْتَ کَمَا اَنْثِیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ**

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ ۙ

ترجمہ: وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں

تفسیری نکات

ہر شے کو مقصود کے حصول سے سکون ملتا ہے

اور دوسری وجہ عاشقانہ ہے وہ یہ کہ ہر شے کو مرکز پر پہنچ کر سکون ہو جاتا ہے چنانچہ ڈھیلا پھینکو تو زمین پر آتا ہے اور توجہ الی مرکز کرتا ہے اور جب تک خاص نقطہ پر نہ پہنچے اس وقت تک تقاضائے حرکت باقی رہتا ہے اور مرکز پر پہنچ کر جنبش نہیں کرتا اب قلب کا مرکز دیکھنا چاہئے کہ کیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ہر شے کو اس کے مقصود کے حصول سے سکون ہوتا ہے۔ پھر مقاصد بھی مختلف ہیں ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ غیر حقیقی میں گو سکون ہوتا ہے مگر وہ عارضی ہوتا ہے مثلاً بیٹے سے ملاقات ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوا مگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر سے وہ سکون عارضی زائل ہو گیا۔

مقصود حقیقی حاصل کرنے کا طریق

اور سکون تام مقصود حقیقی پر پہنچ کر ہو سکتا ہے اور مقصد حقیقی حق تعالیٰ ہیں پس سکون کامل حق تعالیٰ تک پہنچنے ہی پر حاصل ہو سکتا ہے اب یہ سمجھو کہ ان تک پہنچنے کے کیا معنی وہ جسم تو ہے نہیں کہ جسم چل کر جس سے جا ملے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام ہو جائے پس یہ توجہ تام قلب کا مرکز پہنچ جانا ہے جب مرکز پہنچ جائیں گے تو سکون تام حاصل ہوگا اور توجہ تام کا مبداء خدا کے ملنے کا اعتقاد ہے اس سے توجہ الی اللہ ہوگی اور سیر الی اللہ یہی ہے پھر اس سے سیر فی اللہ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا پس تمام مقصود کیسے آسانی سے ختم ہو گیا اس سے زیادہ کوئی آسانی کا طریقہ نہیں غرض حق تعالیٰ ہمیشہ ہر حکم کے ساتھ طریق تحصیل و تسہیل بھی بتلا دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت انما يتذکر اولو الالباب میں دو چیزوں کا امر ہے ایسے عنوان سے کہ طریق عمل بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں علم اور عمل اور اپنے فائدہ میں ہر ایک کو دوسرے کی طرف احتیاج ہے چنانچہ علم عمل کے لئے شرط ہوتا ہے اور بغیر عمل کے علم بیکار ہوتا ہے تو دونوں چیزوں کی حاجت ہوئی اور یہ کوئی دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مقصود میں ان ہی دونوں کا دخل ہے۔ مثلاً تجارت میں خسارہ ہوتا ہے یا بوجہ عدم علم کے یا بوجہ عدم عمل کے مثلاً ہمارے وطن میں ایک نے تجارت کی تھی چاولوں کی اور گھروالوں کو حکم دے دیا کہ خوب کھایا کرو یا گنگوہ میں ایک شخص نے کپڑے کی تجارت کی تھی اور جو عمدہ تھان آتا اس میں گھروالوں کے جوڑے بنتے ایسے لوگوں کو ضرور خسارہ ہوگا کیونکہ یہ تجارت کے اصول کے خلاف تھا بلکہ تجارت کے اصول کا تو حاصل یہ

ہے کہ کوئی شے گھر میں بھی بلا قیمت کے نہ جائے خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کام بلا اصول کے نہیں ہوتا اور اصول کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک یہ کہ اصول کا علم ہو دوسرے یہ کہ اس پر عمل ہوا اگر علم نہ ہوا تو عمل ہو نہیں سکتا اور عمل نہ کیا تو علم کا نفع ہی نہیں ہوتا پس ہر مقصود کے لئے ان دو چیزوں کی ضرورت مسلم ہوگی۔

اِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ①

ترجمہ: مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے حساب ملے گا

تفسیری نکات

یوفی کے معنی

تنبیہ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ اجر اگر غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد ہو تو (یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب) میں یوفی کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ توفیہ کی حقیقت اتمام ہے اور اتمام پر زیادت متصور نہیں۔ جواب یہ ہے کہ توفیہ اور اسی طرح اتمام کے معنی یہ ہیں کہ جو اجر جس عمل کا مقتضی ہے اس میں کمی نہ ہوگی اور صیام کا اجر دلیل سے وہی اجر ہے جو غیر متناہی ہو پس اس سے کمی نہ ہوگی اور تناہی کمی ہے پس تناہی نہ ہوگی حاصل یہ کہ توفیہ میں کمی کی نفی ہے نہ کہ زیادت کی۔

تنبیہ: ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ بغیر حساب حسابا کے ساتھ جو کہ سورہ نبا میں ہے کس طرح جمع ہو سکتا ہے۔ جواب: یہ ہے کہ وہاں حساب کے معنی ضابطہ اور قاعدہ کے ہیں یعنی جن اعمال کے اقتضاء میں جو تفاوت ہے عطاء ثواب میں اس تفاوت کا لحاظ رہے گا قلت و کثرت کے اعتبار سے بھی اور تناہی و لاتناہی کے اعتبار سے بھی پس بغیر حساب اور حسابا اس طرح جمع ہو سکتا ہے۔

انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب ”مستقل رہنے والوں کا صلہ بے شمار ہی ملے گا“ میں متنبہ بھی فرمایا ہے۔ وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان وزمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے۔ اوکما قال

یہ اس لئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہو گی کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان وزمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ میزان بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑے گا میزان اعلیٰ سے۔ خصوص طالب علموں کو ایسے اشکالات بہت ہوتے ہیں۔ (الجبر بالصبر ملحقہ مؤاعظ فضائل صبر و کرم ص ۳۲۲-۳۲۳)

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۖ

ترجمہ: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ مجھ کو بجانب اللہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اس کیلئے خاص رکھوں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ سب مسلمانوں میں اول میں ہوں۔

تفسیری نکات

عبادت مع الاخلاص ہی مقبول ہے

اور شروع سورت میں الا اللہ الدین الخالص سے اس کا مامور بہ ہونا اس کے ضروری ہونے کی دلیل ہے۔ اس میں عبادت مع الاخلاص کا حکم دیا گیا ہے عبادت گوئی نفسہ خود بھی ایک امر مقصود ہے مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس وقت معتبر ہے جبکہ اخلاص کے ساتھ ہو کیونکہ ان اعبد اللہ امرت کا معمول ہے اور مخلصا قید ہے اور مقید میں محط فائدہ قید ہوا کرتی ہے اس آیت سے مقصود بالامر اخلاص ہو یعنی مطلق عبادت نہیں بلکہ عبادت مع الاخلاص کا حکم کیا گیا ہے اسی لئے امرت ان اعبد اللہ مخلصا فرمایا کیونکہ اگر امرت ان اخلص فرماتے تو اس سے یہ نہ معلوم ہوتا کہ اخلاق اتنی ضروری شے ہے کہ عبادت بھی اس کے بغیر معتبر نہیں۔

اس آیت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ مخلصا العبادہ نہیں فرمایا جیسا کہ ان اعبد اللہ ہے مناسب ظاہر ایہی تھا حالانکہ مراد یہی ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ عبادت اسی کے لئے خالص ہو بلکہ یہ فرمایا کہ مخلصا الدین جس سے معلوم ہوا کہ عبادت دینی جب ہی ہے کہ جب اس میں اخلاص ہو کسی چیز کی آمیزش نہ ہو اب اپنے برتاؤ کو دیکھئے کہ آپ کے ساتھ جب کوئی محبت ظاہر کر رہا ہے تو آپ اس کی نیت بھی دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اگر ایک شخص نذر بھی دے اور پھر کہے کہ میری سفارش کر دیجئے تو کیا آپ یہ نہ سمجھیں گے کہ یہ نذر اپنی غرض کے لئے تھی یا مثلاً کوئی آپ کی دعوت کرے اور چلتے وقت یہ کہے کہ میرے ذمہ قرضہ ہے کیا آپ کو یہ دعوت ناگوار نہ گزرے گی غرض کہ صبح شام تک اپنے معاملات پر نظر کیجئے کہ جو محبت خالص ہوتی ہے اسی کی قدر ہوتی ہے آپ بھی اسی دوستی کو پسند کرتے ہیں جس میں آمیزش نہ ہو تو خدا تعالیٰ جو کہ طیب ہے آمیزش دار عبادت و محبت کی کیونکر قدر کریں گے۔ افسوس محبوبان دنیا کے واسطے تو کوشش کی جاتی ہے کہ ہدیہ خالص ہو اس میں کسی چیز کا میل نہ ہو اور خدائی دربار میں جو عبادت پیش کی جاتی ہے اس کے خالص ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی غرض عقلی اور نقلی طور پر اخلاص کی ضرورت ثابت ہوگی اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں اخلاص بھی ہے یا نہیں کیونکہ جب وہ ضروری چیز ہے تو اس کا دیکھنا ضروری ہے جب قرآن میں اس کا تاکید حکم ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کو فرض نہ سمجھئے

فان كنت لم تدري فتلك مصيبة وان كنت تدري فالمصيبة اعظم

یعنی اگر جانتے نہ ہو تو ایک ہی مصیبت ہے اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ دوسری مصیبت ہے اس کا کوئی بھی تدارک نہیں کیونکہ جتنے افعال اختیاریہ ہیں سب قصد پر مبنی ہیں بدوں قصہ و ارادہ کے متحقق نہیں ہوتے اخلاص بھی انہیں میں سے ہے اگر ارادہ ہی نہ کرو گے تو اخلاص کیسے حاصل ہو جائے گا۔ یہ غلطی بعض طالبان باطن کو بھی پیش آتی ہے کہ درخواست کیا کرتے ہیں کوئی دعاء کر دیجئے کہ ہماری اصلاح ہو جائے کوئی ایسا تعویذ دے دیجئے کہ دل سے خطرات دور ہو جاویں ان حضرات سے کوئی پوچھے تو کہ فقط درخواست ہی کرنی آتی ہے یا کبھی اس کی فکر بھی ہوتی ہے اصلاح کا قصد بھی کیا ہے حالت دیکھو تو سبحان اللہ کسی ادا سے معلوم نہیں ہوتا کہ ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہے اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو اول پختہ ارادہ کر کے اس کے ذرائع بہم پہنچاؤ تا کہ تصفیہ میسر ہو۔

صوفی نشود صافی تادر نکشد جاے بسیار سفر باید تا پختہ شود خاے

(ترجمہ) صوفی اس وقت تک پکا صوفی نہیں بن سکتا جب تک عملاً اپنی اصلاح نہ کرتا رہے یہ راستہ بہت لمبا ہے بہت محنت کرنے کے بعد ہی کوئی طالب منزل پاتا ہے۔

بہر حال اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی غرض نفسانی اپنی نہ ہو رضائے حق مطلوب ہو اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اور علاج یہ ہے کہ کوئی کام کرنا ہو تو پہلے دیکھ لیجئے کہ میں یہ کام کیوں کرتا ہوں اور اگر کوئی نیت فاسد ہو تو اس کو قلب سے نکال دیجئے اور نیت خالص خدا کے لئے کرنی چاہیے اور علاج کی آسانی کے لئے بہتر یہ ہے کہ مخلصین کی حکایات دیکھا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اول قل فرمایا جس میں حضور کو حکم ہے کہ یہ بات کہہ دیجئے۔

اور یقینی بات ہے کہ اگر قل نہ بھی فرماتے جب بھی تو حضور بیان فرماتے ہی جہاں اور احکام کی تبلیغ آپ نے فرمائی اس کی بھی تبلیغ فرماتے ہی اس کے لئے لفظ قل کا زیادہ فرمانا بتلا رہا ہے کہ کوئی مہتمم بالشان حکم ہے۔ دوسرے انی امرت (تحقیق مجھ کو حکم ہوا ہے) فرمایا انی میں دوسری تاکید ہے پھر امرت (مجھ کو حکم ہوا ہے) تیسری تاکید اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی محبوبیت میں نہیں تو ظاہر ہے کہ اگر احکام میں رعایت ہوتی تو حضور کی سب سے بڑھ کر رعایت ہونی چاہیے اور رعایت یہ ہوتی کہ بعض احکام سب پر واجب ہوتے اور آپ پر نہ ہوتے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو اس آیت میں ظاہر بھی فرمایا ہے۔

ليغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وماتأخر ”یعنی تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں“

تو باوجود اس کے جب انی امرت فرمایا کہ مجھ کو حکم کیا گیا ہے۔ اب یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ دوسروں پر واجب نہ ہو البتہ اگر تخصیص کی دلیل موجود ہو تو دوسری بات ہے اور یہاں مقتضی تخصیص کی کوئی چیز نہیں تو

جب ایسی ذات بابرکات کو بھی یہ فرمایا گیا کہ سنا دو مجھ کو حکم ہوا ہے اس بات کا تو سمجھ لیجئے کہ دوسرے لوگ تو کس حساب میں ہیں ان پر تو یقیناً یہ فرض ہوگا۔

اخلاص کی اہمیت

یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر حکم کو ضروری ظاہر فرماتے تھے۔ آپ رسول تھے اور رسول کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کو مخلوق کی طرف پہنچائے۔ لہذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالیٰ خاص طور پر کسی حکم کے لئے یہ فرمائیں کہ اس کو پہنچا دو۔ مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچا دو۔ تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتمم بالشان ہونا سمجھا جائے گا چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو لفظ قل سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہہ دیجئے ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آئندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے پھر اس کے بعد اخلصو انہیں فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ اخلاص کیا کریں بلکہ اس کے بجائے امرت ان اعبد اللہ فرمایا کہ یوں کہہ دو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اس جملہ سے حضور کا مامور بالا خلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت بہت بڑھ گئی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا بہت ہی مہتمم بالشان اور ضروری ہوگا کہ رسول اور محبوب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مخلصا لدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل یہی ہے کہ عامل کی قید اور اس کے تابع ہوتا ہے الابدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا معلوم ہوا کہ عبادت اصل ہیں اور احوال و کیفیات و اخلاق ان کے تابع ہیں اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام و عبادت کو بے کار کہے سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے جا بجا عبادت کی تاکید اور ان کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ
 الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۖ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ
 أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ ۖ وَآلَٰئِكَ هُمُ أُولَٰئِكَ الْأَكْبَابُ ۝۱۸

ترجمہ: جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (مراد غیر اللہ کی عبادت ہے) اور (ہمہ تن) اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ مستحق خوشخبری سنانے کے ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام الہی کو کان لگا کر سنتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں۔

تفسیری نکات

طاغوت کا مفہوم

ارشاد ہے وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ الخ لفظ طاغوت طغیان بمعنی تجاوز عن الحد سے ہے اس کا اطلاق شیطان اور بت اور نفس پر آتا ہے مشترک معنوی ہے مشترک لفظی نہیں ہے اور انابت بمعنی رجوع ہے مجھ کو مقصود بیان سے صرف لہم البشریٰ تک ہے باقی آیت تسمیم فائدہ کے لئے پڑھ دی ہے کیونکہ اصل تو مجھ کو انابت یعنی توجہ الی اللہ اور اس کے ثمرہ کو بیان کرنا ہے اور وہ لہم البشریٰ تک ہے باقی انا بوکا جو معطوف علیہ تفسیری کے طور پر اجتنبوا الطَّاغُوت ہے جس میں نفی ہے اس کی ضد کی وہ بھی اس حیثیت سے مقصود ہے کہ انا بوکی توضیح اس پر موقوف ہے اس لئے کہ شے اپنی ضد سے خوب واضح ہوا کرتی ہے پس حاصل ترجمہ کا یہ ہوا کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں طاغوت سے یعنی شیطان اور بتوں اور نفس سے اور اجتناب ان سے کرنا ہر چند کہ واضح تھا اس لئے کہ ہر ایک کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جو معاملہ ان سے پہلے سے کیا جاتا ہو ان سے بچیں لیکن حق تعالیٰ نے چاہا کہ کلام پاک میں ذرا سا بھی ابہام نہ رہے اور مقصود بالکل متعین ہو جاوے چنانچہ اسی اسطے ان یعبودھا فرمایا گویا یوں فرماتے ہیں کہ اجتناب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مثلاً ان کو ہاتھ نہ لگاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پرہیز کرتے ہیں ان کی عبادت کرنے سے سبحان اللہ قرآن مجید باوجود معجز ہونے کے کوئی ضروری امر اس میں نظر انداز نہیں کیا گیا ان یعبودھا بدل ہے طاغوت سے اگر بت مراد ہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں بتوں کی عبادت کرنے سے اور اگر طاغوت سے شیطان مراد ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ پرہیز کرتے ہیں شیطان کی عبادت کرنے سے۔

مراتب نکلیں گے وہ سفل کی جہت میں ہوں گے یعنی اگر انابت ادنیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت اس کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی چنانچہ اس کا بیان اوپر آچکا ہے اور اگر انابت اعلیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت کا مرتبہ جو اس کے مقابلہ میں ہوگا وہ ادنیٰ درجہ کی عبادت طاغوت ہوگی انابت کا ادنیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا اعلیٰ درجہ تو ہم بیان کر چکے اب انابت کا اعلیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا ادنیٰ درجہ جو اس کے مقابلہ میں ہے اس کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ قاعدہ مقررہ مسلمہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادھا اس لئے اول عبادت طاغوت کا درجہ بیان کیا جاتا ہے اس سے انابت کا اعلیٰ درجہ خود سمجھ میں آجائے گا جاننا چاہئے کہ صوفیہ کرام فرماتے ہیں کل ما شغلک عن الحق فهو طاغوت یعنی جو شے تجھ کو خدا سے غافل کر دے وہ تیرا بت ہے اس سے معلوم ہوا کہ غفلت کو بت پرستی سے تعبیر فرماتے ہیں جتنی دیر غفلت ہوگی اسی قدر گویا بت پرستی میں مشغول رہے گا اسی بنا پر اکثر صوفیہ کرام کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بت پرست مشرک لکھتے ہیں چنانچہ شیخ عبدالقدوسؒ کے مکتوبات میں تو جابجا یہ الفاظ دیکھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

بہرچہ ازدوست و امانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں

بہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(ہر وہ بات جو دوست سے قریب کرے خواہ وہ ظاہر اکفر کی بات لگے وہ وچہ زیبا پسندیدہ ہے اور ہر وہ

چیز جو دوست سے دور کرنے کا سبب بنے خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو وہ بری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں

ہرچہ جز ذکر خدائے احسن است گر شکر خواری ست آں جان کندن است

(اللہ کریم کے ذکر کے سوا خواہ کوئی چیز کتنی بھلی ہو وہ بھی جان نکالنے کی برابر ہے)

تحصیل علم واجب ہے

یہ ہے بشری جس کی نسبت فرمایا ہے لہم البشریٰ الحمد للہ میرا دعویٰ دلائل عقلیہ سے نقلیہ سے مشاہدہ سے ہر طرح ثابت ہو گیا یعنی یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ توجہ الی اللہ ہی وہ دولت ہے کہ جس سے دنیا اور آخرت دونوں ملتی ہیں۔ آگے فرماتے ہیں فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ یعنی میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو بات توجہ سے سنتے ہیں پھر اچھی بات کا اتباع کرتے ہیں اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ تحصیل علم واجب ہے اس لئے کہ استماع قول کا حاصل علم ہی حاصل کرنا ہے اس لئے ضروری ہے کہ توجہ الی اللہ کے ساتھ علم دین بھی حاصل کرو میں یہ نہیں کہتا کہ سب مولوی بنو بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسائل سے واقفیت حاصل کرو اور دو کے رسائل ہی سہی اور اب تو بہت کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور اگر اردو نہ پڑھ سکو تو کم از کم ان کتابوں کو سن ہی لو آگے ارشاد ہے اولئک الذین ھداهم اللہ واولئک ہم اولوا الالباب یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ عقل والے ہیں ہدایت

کا استعمال اکثر نقل میں اور لب کا عقل میں آتا ہے مطلب یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً توجہ الی اللہ اور تحصیل علم دین ضروری ہے عقلاً تو اس لئے کہ عقلاً زمان دنیا میں جو کام کرتے ہیں راحت کے لئے کرتے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا کہ راحت توجہ الی اللہ میں ہے اور نقلاً خود ثابت ہی ہے نیز ہداهم اللہ ایک بشری عاجلہ ہے اور نہایت عظیم خوشخبری ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دل خوش کن بات نہیں ہے اس لئے دلائل صحیحہ سے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں بے راہ نہیں ہیں تو اس سے بڑا بھاری اطمینان ہوتا ہے۔

صراط مستقیم پر ہونا بہت بڑی نعمت و بشارت ہے

اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں میں ایک مرتبہ سہارنپور سے لکھنؤ جانے کے واسطے ریل میں سوار ہوا میرے سوار ہونے کے ساتھ میرے ایک ہم وطن بھی سوار ہوئے اور اسی درجہ میں بیٹھے جس درجہ میں میں تھا میں سمجھا کہ یہ بھی لکھنؤ جاتے ہوں گے میں دوسرے ساتھیوں سے جو پہنچانے آئے تھے باتیں کرتا رہا اس خیال سے کہ یہ تو اب ریل میں آ ہی گئے ان سے تو گاڑی چھوٹنے کے بعد فراغت سے باتیں کریں گے اس لئے ان سے کوئی بات نہیں کی جب ریل چھوٹ گئی اس وقت میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں کہا میرٹھ میں نے کہا جناب یہ گاڑی تو لکھنؤ پہنچے گی میرٹھ تو دوسری گاڑی جاوے گی یہ سن کر حیران ہو گئے اور جاڑے کا موسم تھا نہ رضائی نہ مکمل وہ اس خیال میں تھے کہ چند گھنٹہ میں میرٹھ چلا جاؤں گا اس زمانہ میں میرٹھ میں انہوں نے ایک اخبار جاری کیا تھا جب یہ سنا کہ لکھنؤ جاوے گے سخت پریشان ہوئے میں نے کہا کہ اب پریشانی سے کیا فائدہ گاڑی تو اب رڑکی سے ورے کہیں ٹھہرے گی نہیں اب خواجواہ آپ پریشان ہوتے ہیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا باتیں کر لو اس وقت میری تو یہ حالت تھی کہ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی تھی میری مسرت بڑھتی تھی اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ مقصود قریب ہوتا جاتا ہے اور میں راہ پر چل رہا ہوں اور ان کی پریشانی بڑھتی تھی اس لئے کہ مقصود سے دور ہوتے جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میں بے راہ چل رہا ہوں اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اپنے راہ پر ہونے کا علم سے بھی بڑی مسرت ہوتی ہے آخرت کی نعمت تو جب ملے گی جب ملے گی لیکن اگر ہم کو یہاں دلائل صحیحہ سے معلوم ہو جاوے کہ ہم راہ پر ہیں یہ بھی بڑی بشارت اور نعمت ہے یہاں ہی سے اولنک علی ہدی من ربہم و اولنک ہم المفلحون (یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب) کے معنی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ ہدایت سے مراد تو اس آیت میں دنیا میں اس کا علم ہونا ہے جو کہ بشری عاجلہ ہے اور فلاح سے مراد اخروی فلاح ہے خلاصہ یہ ہے کہ توجہ الی اللہ نہایت ضروری ہے ہم اور آپ مل کر توجہ الی اللہ کو اپنا سرمایہ سمجھیں اور اس کے مراتب میں سے اگر اعلیٰ نہ ہو تو متوسط درجہ (یعنی جو کام کرو حق تعالیٰ کی رضا کے لئے کرو یا کم از کم خلاف رضائے حق نہ ہو) تو ضرور حاصل کریں۔

متقین کیلئے بشارت

ربط اس کا ماسبق سے یہ ہے کہ اس سے پہلے کفار کے خسران و عذاب کا ذکر تھا
 قل ان الخسرين الذين خسروا انفسهم واهليهم يوم القيمة الى قوله ذلك
 يخوف الله به عباده يعباد فاتقون.

اس کے بعد متقین کے لئے بشارت ہے اور تقویٰ کا طریق بتلایا گیا ہے
 والذين اجتنبوا الطاغوت ان يعبدوها وانا بوا الى الله لهم البشرى
 کہ جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت سے بچتے ہیں اس ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا کہ ان
 يعبدوها الطاغوت سے بدل ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے جو ہر شیطان کو شامل ہے خواہ شیطان الانس ہو
 یا شیطان الجن جن کا منہی ابلیس ہے کیونکہ شیطن و طغیان میں وہ سب سے بڑھا ہوا ہے پس جو شخص کسی شیطان
 الانس کی اطاعت کرتا ہے وہ بھی ابلیس ہی کی عبادت کر رہا ہے اور شیطان کی عبادت ہر شرک میں ہے کیونکہ
 جس قدر شرکیات ہیں سب کا وہی امر کرتا ہے یہاں پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ مشرکین تو عبادت شیطان کے
 مقرر نہیں بلکہ وہ بھی اپنے زعم میں خدا ہی کی عبادت کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شیطان کی اطاعت اس
 طرح کرتے ہیں جو عبادت کی حد میں پہنچ گئی ہے۔

اقسام اطاعت

کیونکہ اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک اطاعت مطلقہ ایک اطاعت مقیدہ مقیدہ اطاعت مقیدہ تو یہ ہے جیسے
 مسلمان امام اور مجتہد کی اطاعت کرتے ہیں جو اس شرط سے مقید ہے کہ امر الہی کے موافق ہو اور اطاعت
 مطلقہ یہ ہے کہ ایسی اطاعت کی جائے جس میں موافقت امر الہی کی بھی شرط نہ ہو مشرکین اپنے پیشواؤں کی ایسی
 ہی اطاعت کرتے ہیں اور ایسی اطاعت مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے دوسرے کا حق نہیں جب انہوں نے
 غیر حق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق تھا تو وہ مشرک اور شیاطین کے عابد ہوئے گوزبان سے
 اس کا اقرار نہ کریں اسی لئے حق تعالیٰ نے اہل کتاب کو اس امر کی تعلیم دی ہے۔

ولا يتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله

کیا ایک دوسرے کو رب نہ بنائے حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم نے عرض کیا یا رسول اللہ
 ہم نے تو اپنے علماء کو معبود نہیں بنایا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا

اليس كانوا يحلون لكم ويحرمون فتاخذون بقولهم قال نعم قال هو ذالك

یعنی کیا یہ بات نہ تھی کہ تمہارے علماء جس بات کو حلال کر دیتے تم اس کو حلال مان لیتے اور جس کو وہ حرام کر دیتے اس کو حرام مان لیتے تھے کہاں ہاں یہ تو ہوا ہے حضورؐ نے فرمایا کہ بس اس سے تم نے اپنے علماء کو اللہ کے سوا رب بنالیا تھا مطلب حضورؐ کا یہی ہے کہ تم نے ان کی اطاعت مطلقہ کی تھی اور اطاعت مطلقہ عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے بحمد اللہ اہل اسلام کسی کی اطاعت مطلقہ نہیں کرتے غیر مقلدوں کا اہل تقلید پر یہ الزام ہے کہ ان مقلدوں نے بھی اپنے ائمہ و مجتہدین کو ارباب بنالیا ہے کہ یہ بھی ان کی اطاعت مطلقہ کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے

بگذر از ظن خطاے بدگماں ان بعض الظن اثم را بخواں

کہ یہ محض بدگمانی ہے مقلدین اطاعت مطلقہ کسی مجتہد کی نہیں کرتے بلکہ ان کے اقوال کا اتباع اس قید کے ساتھ کرتے ہیں کہ اللہ و رسول کے حکم کے موافق ہوں اسی وجہ سے وہ ایسے شخص کا اتباع کرتے ہیں جس کی نسبت ان کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ یہ اللہ و رسول کا پورا متبع ہے اور خلاف حکم شرعی کوئی بات نہیں کہتا۔

علم اور اتباع

اس کے بعد ارشاد ہے وانا بوا الی اللہ یہ تقابل بدیع ہے یعنی وہ لوگ شیطان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود و معبود سمجھتے ہیں اس کے بعد مبتدا کی خبر ہے لہم البشری کہ جن کی یہ شان ہے وہ بشارت سنانے کے مستحق ہیں جیسا مفہوم ہے لام کا اس کے بعد ہے فبشر عباد الذین یستمعون القول کہ اچھا پھر ان کو بشارت سناہی دیجئے سبحان اللہ قرآن بھی کس قدر بلیغ ہے کہ اول تو ان کا مستحق بشارت ہونا بیان فرمایا پھر بشارت سنانے کا حکم دیا کہ ان کو بشارت سناہی دیجئے۔

اس طرز تشویش کا جس درجہ مخاطب پر اثر ہوتا ہے اہل ذوق پر مخفی نہیں اب یہ سمجھئے کہ یہاں عباد الذین یستمعون القول سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ شیطان سے بچتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ عربیت کا قاعدہ ہے کہ

اذا اعيدت المعرفة معرفة كانت الثانية عين الاولى

(وہ قاعدہ کلیہ ان لم یعارضہا معارض) کہ جب معرفہ کو دوبارہ معرفہ ہی بنا کر اعادہ کیا جائے تو ثانی سے مراد وہی ہوگا جو اولیٰ سے مراد ہے مگر اعادہ معرفہ کی بھی ظاہر صورت یہ تھی کہ یہاں ضمیر لائی جاتی یا اسم اشارہ یعنی فبشرہم یا بشرہولاء فرمایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ضمیر کو چھوڑ کر وضع لفظ ہر موضع المضمّر اختیار کیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس عنوان سے تحصیل کمالات کا طریقہ بتلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تحصیل کمالات میں ترتیب ہے حاصل اس ترتیب کا یہ ہے کہ تم کو اول استماع القول لازم ہے جس کا حاصل طلب علم ہے جیسا کہ ابھی معلوم ہو جائے گا اسکے بعد اس کا اتباع لازم ہے اسی کا حاصل عمل ہے خلاصہ یہ ہوا کہ تحصیل کمال کا طریقہ علم و عمل ہے۔

رونمائے قرآن حکیم

اب سمجھئے کہ یہاں يستمعون القول قول سے مراد کلام اللہ ہے دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں لام عہد کا ہے اور یہاں معبود کلام اللہ ہی ہے دوسرے قاعدہ عربیت کا ہے۔

المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل

کہ مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پس یہاں بھی مطلق قول سے مراد قول کامل ہونا چاہیے اور قول کامل قرآن ہی ہے کیونکہ قرآن سے کامل ترکون سا قول ہوگا اسی لئے فرمایا ہے

ذالک الکتاب لا ریب فیہ

یہی کتاب کامل ہے اس میں کچھ شک نہیں (وہذا علی احدى التقادیر فی ترکیب الآیۃ)

اور یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں کہ بات تو یہ ہے کہ یعنی سچی اور کامل بات یہ ہے اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سوا اور کوئی بات بات ہی نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس کے برابر دوسری بات کامل نہیں ایسے ہی ذلک الکتاب کو سمجھئے کہ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ اس کے برابر کوئی کتاب نہیں کیونکہ قرآن معجز ہے لفظاً بھی معنی بھی مضموناً بھی حفظاً بھی۔

قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہاں احسنہ فرمایا جس کا مرجع قول ہے تو حاصل احسن القول ہوا اور احسن الحدیث و احسن القول کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اس سے (یعنی قرآن کو احسن الحدیث کہنے سے) یہ معلوم ہو گیا کہ فیتبعون احسنہ میں احسن کی اضافت تغایر کے لئے نہیں بلکہ بیانیہ ہے اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اتباع کرتے ہیں اس کی اچھی باتوں کا ہمارے محاورہ میں یہ عنوان اس بات کو بتلاتا ہے کہ اس میں سب ہی اچھی باتیں ہیں۔ قرآن بلا تشبیہ مصری کی ڈلی ہے اگر کوئی مصری کے بارہ میں یہ سوال کرے کہ کدھر سے کھاؤں تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ میاں مصری کی ڈلی ہے جدھر سے چاہو کھاؤ جدھر چاہو منہ مارو۔ مگر کوزہ کی مصری میں تو بانس کے ٹکڑے اور تنکے وغیرہ بھی ہوتے ہیں یہ ایسی مصری ہے جس میں کوئی تنکا اور لکڑی مطلق نہیں۔

قرآن کا ہر جزو احسن ہے

قرآن کا ہر جزو احسن ہے اور معنی حسن کو احسن سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ قرآن چونکہ سب کلاموں سے افضل ہے اس لئے اس کے حسن کو احسن کہنا چاہیے۔ یہاں تک یہ بات ثابت ہوگئی کہ طریقہ تحصیل کمال کا یہ ہے کہ اول علم قرآن حاصل کیا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھو

کہ علم قرآن کو استماع سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مراد صرف الفاظ کا سننا ہے معانی کا جاننا مطلوب نہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ آگے فیتبعون احسنہ بھی تو ہے اور اتباع الفاظ مجردہ کا نہیں ہو سکتا بلکہ اتباع بعد علم معانی کے احکام کا ہوگا اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ مراد تو علم معانی ہے مگر اس کو استماع سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ معانی کا سمجھنا۔ اس پر موقوف ہے کہ اول الفاظ کو غور سے سنا جائے جو شخص تحصیل علم کے وقت معلم کی تقریر کو توجہ سے نہیں سنتا وہ مراد بھی نہیں سمجھ سکتا اور جب يستمعون القول سے مراد علم معانی ہے تو اب یہ سمجھو کہ معانی قرآن کے بہت درجات ہیں بعض معانی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سمجھ سکتے ہیں غیر رسول نہیں سمجھ سکتا ان معانی کو حضورؐ نے بعض احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ اور بعض معانی کو حضورؐ کے بعد مجتہدین ہی سمجھ سکتے ہیں جن معانی کو مجتہدین نے سمجھا ہے وہ فقہ کی کتب میں مدون ہیں اور بعض معانی کو تمام اہل علم سمجھ لیتے ہیں اور بعض کو ترجمہ کے بعد عوام بھی سمجھ سکتے ہیں اسی کو عارف نے کہا ہے۔

جرف حش راست دربر معنی معنی در معنی در معنی

اور ایک عارف کہتے ہیں

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را
اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ حدیث فقہ بھی قرآن ہی ہے بعض احکام تو بلا واسطہ اور بعض بواسطہ کلیات مدلولہ قرآن کے جن سے حقیقہ حدیث و فقہ کی ثابت ہے پس سب قرآن ہوا مگر دوسرے لباس میں پس یوں کہنا چاہئے کہ
عبار اتناشتی و حسنک واحد و کل الی ذالک الجمال یشیر

پس حدیث و فقہ بھی قرآن ہی ہے گو لباس دوسرا ہے اور فقہ میں جو مسائل منصوصہ قرآنیہ ہیں وہ تو قرآن ہی میں مسائل قیاسیہ مستنبط من القرآن بھی قرآن ہی ہیں کیونکہ فقہاء فرماتے ہیں القیاس مظهر لامثبت کہ قیاس سے کوئی نئی بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ قرآن و حدیث کی مراد ظاہر ہوتی ہے اور کلیات کے واسطہ سے سب ہی قرآن ہیں جیسا اوپر مذکور ہوا اور اس مسئلہ کو تو امام ابو حنیفہؒ نے سب سے زیادہ سمجھا ہے غالباً طلبہ سمجھ گئے ہوں گے (کانہ اشارۃ الی تجویزہ القراء بالعمیۃ للعاجر عن العربیۃ ۱۲) پس يستمعون القول میں علم قرآن و علم حدیث و علم فقہ سب داخل ہیں اور یہ آیت عورتوں کو اس طرح شامل ہے کہ عبادی میں تغلیباً عورتیں بھی داخل ہیں کیونکہ یہ بات اجماعاً مسلم ہے کہ احکام کے مخاطب جس طرح مرد ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہیں باقی عورتوں کا صراحتہ ذکر نہ کرنا اس میں حکمت یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے تابع ہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں ان کے توابع بھی ان کے مخاطب ہیں (حاشیہ پس ہمیں چاہیے کہ خود بھی کامل بنیں اور اپنی عورتوں کو بھی کامل بنائیں جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے کہ اول علم دین حاصل کرو پھر عمل کا اہتمام

کر و اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب يستمعون القول سے مراد قرآن ہے اور قرآن میں سب دین داخل ہے اور سارے دین کا علم و عمل دفعۃً ہم کو حاصل نہیں ہو سکتا تو ہم کس وقت اس آیت کے مصداق بنیں۔ جواب یہ ہے کہ شریعت میں عزم اتباع بھی علم اتباع ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اس طرز میں یہ بات بتلا دی گئی ہے کہ عورتوں کے لئے پردہ ضروری ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ان کے ذکر میں اور خطاب کو مستور رکھا ہے چنانچہ قرآن میں عورتوں کا ذکر بالاستقلال بہت کم ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدح پر بشارت کو ختم فرماتے ہیں جو علم و عمل کا اہتمام کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے اولئک الذین ہدہم اللہ واولئک ہم اولو الالباب کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور یہی ہیں جو (درحقیقت) عقلاء ہیں اس میں دو کمالات مذکور ہیں ایک ہدایت یہ تو کمال شرعی ہے اور ایک عقل یہ کمال دنیوی ہے۔

ضرورت علم و عمل

خلاصہ یہ ہے کہ علم و عمل ہی سے کمال شرعی حاصل ہوتا ہے اور اسی سے کمال دنیوی یعنی عقل حاصل ہوتی ہے عقلاء حقیقت میں وہی ہیں جو علم و عمل کے جامع ہیں نہ وہ جن کو تم عقلاء سمجھتے ہو آج کل عقلمند وہ شمار ہوتا ہے جو چار پیسے کمانے کی قابلیت رکھتا ہو خواہ اس کو علم دین اور عمل حاصل ہو یا نہ ہو چنانچہ اسی لئے انگریزی پڑھنے والے اپنے کو عقلاء اور اہل علم کو غیر عاقل سمجھتے ہیں مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ علم دین حاصل کر چکے ہیں ان کے سامنے بڑے بڑے انگریزی داں جس نے علم دین حاصل نہ کیا ہو بیوقوف ہے اگر ان کو شک ہو تو ذرا کسی عالم سے گفتگو کر کے دیکھ لیں جو دو ہی منٹ میں اپنی بیوقوفی کا اقرار نہ کر لیں اور سب سے بڑی بات یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عقل مند ان ہی کو کہا ہے جو علم دین و عمل حاصل کر لیں اور ان کے سوا ان لوگوں کو جو دنیا کی ترقی اور قابلیت میں تم سے بھی دس قدم آگے تھے اللہ تعالیٰ نے اولئک کا لانعام بل ہم اضل فرمایا ہے کہ یہ جانوروں سے بھی زیادہ بیوقوف ہیں کیونکہ جانور بھی اپنے مصالح و مضار سے واقف ہیں اور یہ آدمی ہو کر اپنے مصالح و مضار سے ناواقف ہیں تو یہ جانور سے بھی بدتر ہیں اب بتلاؤ جس کو خدا عقلمند کہے وہ عقلمند ہے یا جس کو تم عقل مند کہو یقیناً خدا ہی کا قول سچا ہے پس ہدایت و عقل کا معیار علم و عمل ہے اسی پر ہدایت و عقل کا مدار ہے اور جو شخص علم دین اور عمل سے محروم ہے وہ یقیناً گمراہ اور بیوقوف ہے ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی اہل یورپ کو عقل مند کہتا تو نہایت برہم ہوتے اور فرماتے تھے کہ جو قوم خدا کو بھی نہ پہچانے وہ خاک عقل مند ہے ہاں یوں کہو کہ چاقو قینچی بنانا خوب جانتے ہیں یعنی کاری گرا چھ ہیں اور صنعت کو عقل سے کیا واسطہ عقل کا کام علم و معرفت ہے اس سے ان لوگوں کو مس بھی نہیں خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مستحق بشارت فرمایا ہے جو شرک سے بچتے اور توحید اختیار کرتے اور علم و عمل کا اہتمام کرتے ہیں اور ان ہی

کو اہل ہدایت اور عقلاء کا خطاب دیا ہے پس ہم کو ہدایت و عقل کا کمال حاصل کرنے کے لئے علم و عمل کا اہتمام کرنا چاہئے اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام الاستماع والاتباع للسعادة والاتباع تجویز کرتا ہوں اور لقب نوید جاوید رکھتا ہوں اس لقب کے جز و اول میں محرکہ کہ نام کی رعایت ہے نوید کے معنی بشارت کے ہیں اور بشارت قرآن میں جہاں بھی ہے دائمی ہے اس لئے اس کے ساتھ جاوید بڑھا دیا۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ انْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ

اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۳۰۸﴾

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

تفسیری نکات

طب روحانی میں کوئی مرض لا علاج نہیں

یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ طب روحانی میں کسی مریض کو جواب نہیں دیا جاتا کہ یہ مرض لا علاج ہے یا مرض کی طب کی کتابوں میں کہیں ذکر نہیں ہاں بعض مرتبہ بعض طبیب جسمانی جواب دے دیتے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرض ہے یا یہ مرض لا علاج ہے اور طب روحانی میں یہ کہیں نہیں چنانچہ سب سے بڑھ کر مرض کفر اور شرک کا ہے اس کا بھی علاج مذکور ہے اگر سو مرتبہ بھی ہو تو پھر بھی یہ ارشاد مذکور ہے۔

شان نزول

چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو بعض کفار نے یہی عذر کیا کہ ہم جانتے ہیں اسلام حق ہے مگر ہم اسلام بھی لے آئیں تو ان گناہوں کی تلافی کیونکر ہوگی جو ہم نے اب تک کئے ہیں اسلام لانے سے ان کو کیا نفع ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ انْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کیں ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت

ہو یقیناً خدا تعالیٰ تمام گزشتہ گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے) اس میں بتلا دیا گیا کہ اسلام لانے سے کفر بھی مٹ جائے گا اور کفر کی حالت میں جتنے گناہ کئے ہیں وہ بھی سب مٹ جائیں گے اور اس واقعہ سے آیت کا مطلب بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود اس آیت کا توبہ کی تعلیم ہے اور توبہ سے جو امر مانع تھا اس کو رفع کرنا ہے اس میں گناہ پر دلیری کی تعلیم نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے کہ وہ جرات علی المعاصی کے لئے اس آیت کو پیش کیا کرتے ہیں یہ بالکل غلط ہے اس آیت سے گناہوں پر دلیر نہ ہونا چاہئے ہاں جو شخص گناہ کر کے توبہ کرنا چاہے اور اس کو یہ خیال مانع ہو کہ میرے اتنے گناہوں کو توبہ سے کیا نفع ہوگا اس کو اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم اپنے پہلے گناہوں سے توبہ کر لو گے تو وہ سارے معاف ہو جائیں گے اور نامہ اعمال میں سے بھی مٹ جائیں گے وہ ایسے لکھے ہوئے نہیں ہیں جیسے چھپی ہوئی روشنائی کے حروف ہوں بلکہ ایسے لکھے ہوئے ہیں جیسے سلیٹ پر پتھر سے قلم ہے حروف لکھے ہوئے ہیں کہ لب لگا کر ان کو مٹا دیتے ہیں اس طرح توبہ کے بعد حق تعالیٰ سب گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔

شان نزول

بعض لوگوں کو آیت لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعا سے دھوکہ ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے کیونکہ یہاں لمن یشاء کی قید نہیں ہے، سو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا نزول ان لوگوں کے بارہ میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں؟ اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام سے ہی کیا فائدہ؟ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا لو اسلمنا فما یفعل بذنوبنا التی اسلفنا (او کما قالوا) کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں سب معاف ہو جائیں گے پس اس میں جو مغفرت کا وعدہ حتمی ہے وہ عام نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدوں عقاب کے معاف نہ ہوں گے۔ نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے یغفر ما دون ذالک لمن یشاء جس میں حتمی وعدہ نہیں بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید مشیت وعدہ حتمی کیا گیا ہے۔ یہ صرف نو مسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے۔

شانِ نزول سے نصوصِ عامہ کی تخصیص

شانِ نزول سے نصوصِ عامہ کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شانِ نزول سے ان کی تفسیر کی جاتی ہے جیسے لیس من البر الصیام فی السفر بظاہر عام ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں حالانکہ فتویٰ یہ ہے کہ اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور حدیث کو مقید کیا گیا ہے حالتِ مشقت کے ساتھ کیونکہ حضور نے یہ ارشاد ایسے موقع پر فرمایا تھا جبکہ آپ کا گزرا ایسے شخص پر ہوا جو سفر میں روزہ دار تھا اور ضعف کی وجہ سے بے ہوش و بدحواس ہو گیا تھا کہ لوگ اس پر سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ سے دماغ پر زیادہ گرمی نہ چڑھ جاوے۔ اس واقعے میں آپ کا یہ ارشاد فرمانا ان کا قرینہ ہے کہ مراد ایسا سفر اور ایسی حالت ہے کہ اس میں روزہ رکھنا خلافِ افضل ہے بلکہ اگر جان کا اندیشہ ہو تو حرام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس آیت کو شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد اور آیت میں یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم بظاہر سب کو عام ہے خواہ نو مسلم ہوں یا مسلم قدیم تو میں کہتا ہوں کہ آپ شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے تو دوسری آیت سے اس کو مقید کرنا پڑے گا اور ایک آیت کو دوسری آیت سے مقید کرنا اتحادِ واقعہ میں لازم ہے اور ظاہر ہے کہ آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء اور آیت یا عباد الذین اسرفوا علی انفسہم دونوں عصاۃ کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں اور ایک جگہ مغفرت بقید مشیت مشروط ہے اور دوسری جگہ مطلق ہے تو مطلق کا مقید پر حمل کیا جاوے گا۔

رہا یہ سوال کہ جب دونوں جگہ مشیت کی شرط ہے تو ایک آیت میں اطلاق کیوں رکھا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک جگہ تو قاعدہ اور قانون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لئے وہاں تو قید کو ظاہر کر دیا کہ حق تعالیٰ بدوں عقاب کے بھی اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے اور دوسری جگہ مایوسین کی یاس کا زائل کرنا مقصود ہے۔ وہاں شرط مشیت کے ظاہر کرنے سے یاس کا ازالہ نہ ہوتا۔ کیونکہ مایوس آدمی کو طرح طرح کے توہمات پیدا ہوا کرتے ہیں شرط مشیت کے اظہار سے اس کو اور وساوس پیدا ہوتے ہیں نہ معلوم میرے متعلق مشیت ہوگی یا نہیں تو اس کی یاس زائل نہ ہوتی اس لئے وہاں قید کو بیان نہیں فرمایا تاکہ آیت کو سنتے ہی اس پر رجاء کا غلبہ ہو جاوے اور یاس کا غلبہ جاتا رہے اور واقعی مایوس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ایک دفعہ کامل اطمینان دلا دیا جاوے۔ جب وہ حالت یاس سے نکل جائے پھر اس کو تدبیرِ سبباً اصل قانون سے مطلع کر دیا جاوے۔

اس کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن پر کبھی یہ حالت گزری ہو یہ تو حکمت ہے اس اطلاق کی اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس میں مانعِ اسلام کو بھی مریض کیا گیا ہے۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کفار کو سخت وسوسہ لاحق ہوتا اور وہ اسلام سے محروم رہتے اور یہ وسوسہ واقع بھی ہو چکا ہے۔ لہذا ان کو مطمئن کر دیا گیا کہ تم بے فکر ہو کر اسلام لے آؤ حق تعالیٰ تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے۔

گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ آیت لا تقنطوا میں صرف مایوسین کی یاس کا ازالہ مقصود ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اعمال کی ضرورت اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام لازم نہیں بلکہ لفظ لا تقنطوا ضرورت اعمال پر خود لالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں قنوط و یاس کی ممانعت ہے اور تجربہ ہے کہ معاصی میں قنوط و یاس پیدا کرنے کی خاصیت ہے رجاء بدوں اعمال صالحہ کے پیدا نہیں ہوتی مجرم کو اپنے جرم کا استحضار جس وقت ہوتا ہے اس وقت رجاء کا مضمون دل میں نہیں آ سکتا اور اگر کسی مجرم کو رجاء ہوگی بھی تو کسی عمل صالح کی برکت سے ہوگی کہ اس کے پاس کوئی نیک کام ضرور ہوگا جب قنوط سے بچنا واجب تو اسباب قنوط سے بچنا بھی واجب ہوگا لان مقدمة الواجب واجب سرکش غلام کو امید کا درجہ کبھی نصیب نہیں ہوتا جب چاہے تجربہ کر لیا جاوے۔

احب مناجاة الحبيب باوجه ولكن لسان المذنبين كليل

واقعی مجرم کی زبان مناجات سے بھی بند ہو جاتی ہے غرض اور افعال تو ایسے ہیں کہ بدوں ان کے کبھی نہ کبھی مغفرت اور نجات ہو جائے گی خواہ بعد عقاب یا قبل عقاب۔ مگر اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں ورنہ تعذیب کافر پر خدا تعالیٰ کا مضطر ہونا لازم آئے گا اور اضطراب منافی وجوب ہے او بدوں ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے ان الله لا يغفر ان يشرك به۔

مگر شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو شرک نہیں بلکہ موحد ہیں۔ مگر اسلام سے ابا کرتے ہیں ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟

توسیع دوسری جگہ مذکور ہے ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشرکین فی نار جہنم خلدين فيها اولئک هم شر البریہ اس میں کافر کو اہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہوگئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی مکث طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔

جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہوگا اور یہاں کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا اور یہ ممتنع ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان الذين كفروا قطع لهم ثياب من نار الى قوله تعالى كلما ارادوا ان يخرجوا

منها من غم اعید و افیہا اور ارشاد ہے والذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وہم کفار فلن یغفر اللہ لہم۔ پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے معذب ہونا صاف طور سے معلوم ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے مندفع ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہو گئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ جہنم خالداً فیہا کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدوں قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں نہ یہاں کوئی قرینہ ارادہ دوام کے لئے مرنج ہے۔ اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا (مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و آئمہ مجتہدین کا اس پر اجتماع ہو گیا کہ اس کی توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجتماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے لہذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لئے سزا ابدالاً آباد جہنم ہے۔

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ هو الغفور الرحیم۔

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دیگا۔ تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔ یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسی طرح اس مرض کا بھی علاج قرآن مجید میں موجود ہے گو مسلمانوں کا یہ اختلاف ایک مرض جدید تھا۔ اس عنوان سے تو جدید نہیں کہ خدا اور رسول کا کہنا نہیں مانتے مگر اس عنوان سے جدید ہے کہ ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے۔ یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی۔ تو اتنا جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی (ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرمادیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمہ

ضروری ہے۔ تو یہ کتنا عجیب و غریب قصہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے۔

پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک تو سب کے متبع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی متبع نہیں۔ پس ایک جماعت میں تفریط ہے اور ایک میں افراط ہے۔ حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں کہ واتبع سبیل من اتاب الی (یعنی جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو)

اتباع سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اتاب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس ونا کس کے معتقد ہو جانے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا معیار بتلادیا اور معیار سے مراد ہے صحیح معیار۔

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخُسْرَىٰ ۝

ترجمہ: اے عام مخاطب تو اگر شرک کریگا تو تیرا کیا کرایا کام غارت ہو جائیگا اور تو خسارہ میں پڑیگا۔

تفسیری نکات

لئن اشركت کی تفسیر بے نظیر

اور اس پر کوئی لفظ اوحی الیک سے اشکال نہ کرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ اوحی الیک میں تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اس کا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ ﷺ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ۔ لئن اشركت الخ کے مخاطب بھی آپ ہی ہوں گے کیونکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون ہوں تو سب کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشركت ایہا المخاطب لیحبطن عملک تاکہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کریگا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے تو لئن اشركت میں تو خطاب افراد امت کو ہوا اور لقد اوحی الیک الخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا بہر حال خطاب خواہ عام ہو یا خاص آحاد امت کو ہو۔ مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق و سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے چنانچہ فرماتے ہیں ما قدروا اللہ حق قدرہ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے۔

شُرک کا مفہوم

اس میں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس واسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے آدمی کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اس میں کما حقہ محنت نہیں کر سکتا غرض اس میں مالی یا جانی کمی ہے اسی کے پورا کرنے کیلئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال و آثار کمال میں تغیر نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدوں اسکے نہیں ہو سکتی کہ کمال یا اس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال و آثار کمال اس واسطے کہے کہ بعض کے اعتقاد درجہ کمال میں شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت وغیرہ میں خدا لے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جاوے مگر آثار میں شریک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کے برابر نہیں مانتے تھے ہاں اس کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اسی واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچادیں اور مقرب بنادیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں خدا کے تصرفات میں بعضوں کے دخیل مانتے تھے بلفظ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں کہا سات ہے ان میں سب سے بڑا تو آسمان میں ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے اس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کے لئے دوسرے معبود ہیں۔ دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کے لئے ان کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ (سورہ زمر ۳)

عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ

چنانچہ آیت مذکورہ میں ان کا وہی قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا

یہدی من ہو کاذب کفار ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے۔ غرض یہ دونوں مشرک ہیں۔ اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کمی کی بالکلیہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہو سکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شریک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایات کرتے ہیں کہ ماقدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری عظمت کرنی چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اسکی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا۔ (الشوق الی الشوق لمحقہ مؤاعظ حیات وعات ص ۷۹)

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہیے تھا حالانکہ ساری زمین ان کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

تفسیری نکات

عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ

فرماتے ہیں وماقدروا اللہ حق قدرہ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہیے تھا حالانکہ ان کی عظمت وہ ہے کہ والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیمۃ تمام زمین ان کی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ والسموات مطویات بیمینہ اور کل آسمان ان کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے یمین کا لفظ اور ایسے ہی قبضہ کا لفظ تشابہات میں سے ہے جن کا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلتایدی ربی یمین یعنی خدائے تعالیٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بائیں ضعیف ہوتا ہے تشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے مثلاً خدائے تعالیٰ

کے لئے شریعت میں ید کا اطلاق آیا ہے لہذا اس کا تو قائل ہو کہ ید ثابت ہے مگر اس کی کیفیت وغیرہ سے بحث نہ کرے۔ بس سیدھی بات ہے جیسا اللہ ویسا ہی اس کا ید ہم کو اللہ کی حقیقت کہاں معلوم ہے اور اس کا علم بالکنہ کہاں حاصل ہے بس ایسے ہی اس کے ید کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ تو قبضہ اور یمینہ کی بحث ہوئی اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر قدرت بیان کرنے کے لئے تو قبضہ فرمایا اور آسمانوں کے لئے مطویات یمینہ فرمایا۔ دونوں کے واسطے عنوانوں میں فرق کیوں کیا کہ زمین کی بابت تو فرمایا کہ مٹھی میں ہوگی اور آسمانوں کی نسبت فرمایا کہ لپٹے ہوئے ہاتھ میں ہوں گے گویا ہتھیلی پر رکھے ہیں سیدھی بات یہ تھی کہ یوں فرما دیتے: وَالْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتِ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ لِعَنَى زَمِينٍ وَآسْمَانٍ سَبَّاسِ کی مٹھی میں ہوں گے اس کا نکتہ ایک ان پڑھ آدمی کی سمجھ میں آیا بلکہ آدمی کے نہیں آدن کے سمجھ میں آیا۔ (یہ حضرت مولانا کی اہلیہ کبریٰ ہیں زاد اللہ فی درجتہا و رفع فی الجنة منزلتہا ورزقہا فی الدنیا عیشتہ نقیۃ طیبۃ سویۃ (آمین) جو مجھ سے ترجمہ پڑھا کرتی تھی اور مجھے وہ نکتہ بہت پسند آیا حتیٰ کہ میں نے اس کو اپنی کتاب میں درج بھی کر دیا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرق عنوانوں میں کیوں کیا گیا ہے کہا کہ زمین یہ نسبت آسمان کے چھوٹی ہے اور چھوٹی چیز کے لئے یہی عادت ہے کہ مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے مٹھی کو بند نہیں کیا جاتا اس واسطے زمین کے لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا اور آسمان کے لئے یہ دیکھئے۔ یہ علوم قرآنیہ ہیں ان میں خصوصیت پڑھے لکھوں اور علماء فضلاء کی نہیں ہے جس کو حق تعالیٰ چاہیں القاء کر دیں خدا کی دین ہے جس کو چاہے دیدیں بعض وقت ایک عام آدمی کی سمجھ میں وہ بات آ جاتی ہے جو ایک بڑے عالم کی سمجھ میں نہیں آتی اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ عام آدمیوں کی سمجھ میں دین کی بات آ جاتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ دین فطرت کے بہت قریب ہے جس کی فطرت میں سلامت ہو۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي

الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ

ترجمہ: اور (قیامت کے روز) صور میں پھونک ماری جائے گی سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔

تفسیری نکات

مشیت استثناء کا وقع

ایک آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے ارواح سب کی زندہ رہیں گی ہاں نفخ صور سے ارواح بے ہوش ہو جائیں گی چنانچہ نص میں ہے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ اور صعق کے معنی غشی اور بے ہوشی کے ہیں گو فناء بھی مراد ہو سکتا ہے مگر متبادر معنی اول ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ نفحات تین ہوں گے ایک سے ارواح بے ہوش ہو جائیں گی اور دوسری سے تمام عالم مع ارواح کے فنا ہوا جائے گا تیسری سے سب زندہ اور موجود ہو جائیں گے تو یہ دذعویٰ بلا دلیل اور بلا ضرورت ہے۔ بلا دلیل تو اس لئے کہ نصوص سے صرف دو نفخہ نفخہ اولیٰ سے جو فنا ہوگا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اجسام فنا ہو جائیں گے اور ارواح بے ہوش ہو جائیں پس فنا اجسام کے لئے ہے اور صعق ارواح کے لئے ہے اس تقریر سے بھی نصوص کا تعارض مرتفع ہو سکتا ہے پھر نفحات ثلاث کا قائل ہونا بلا ضرورت نیز اسی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ارواح بے ہوش بھی نہ ہوں گی چنانچہ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کے بعد الامن شاء الله مذکور ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت استثناء کا وقوع بھی ہوگا چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

فان الناس يصعقون يوم القيمة فاصعق معهم فاكون اول من يفيق فاذا موسى باطش بجانب العرش فلا ادري كان فيمن صعق فافاق قبلي او كان ممن استثنى الله متفق عليه۔
یعنی قیامت میں سب لوگ بے ہوش جائیں گے اور مجھے سب سے پہلے افاقہ ہوگا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو عرش کا پایہ پکڑے ہوئے دیکھوں گا اسکے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ بھی سب کے ساتھ بے ہوش ہوں گے پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آجائیں گے یا وہ بے ہوش ہی نہ ہوں گے (کیونکہ وہ ایک بار طور پر بے ہوش ہو چکے ہیں اس کے عوض آج صعقہ سے محفوظ رہے کمافی رولیت) اور ان لوگوں میں داخل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور احتمال کے موسیٰ علیہ السلام کو ان

لوگوں میں داخل فرمایا ہے جو صعق سے مستثنیٰ ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مشیت استثناء کا وقوع ہوگا ورنہ احتمال ثانی صحیح نہ ہوتا یہ تو ایک اشکال علمی تھا جس کو میں نے رفع کر دیا۔

صعقہ موت

یہاں صعقہ سے صعقہ موت مراد ہے اس کے بعد استثناء ہے الا من شاء اللہ کہ جس کو حق تعالیٰ چاہیں گے وہ اس صعقہ سے مستثنیٰ بھی ہوگا۔ پس ارواح الامن شاء اللہ میں داخل ہے ان کو موت نہ آئے گی۔

مگر ہم اس جواب پر مجبور و مضطر نہیں بلکہ ہم تسلیم کے بعد دوسرا جواب دیتے ہیں کہ اگر نفخ صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع حیات لازم نہیں آتا کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کے لئے ہوگا ممتد نہ ہوگا اور امور عادیہ میں زمان لطیف کا انقطاع مانع استمرار نہیں۔ موٹی بات ہے کہ اگر ایک شخص پانچ گھنٹہ تک تقریر کرے اور درمیان درمیان میں سیکنڈ سیکنڈ سکوت کرے تو یہ سکوت مانع استمرار تقریر نہیں۔ بلکہ محاورہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے پانچ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی۔ اس پر اگر کوئی کہنے بھی لگے کہ واہ صاحب اس نے درمیان درمیان دس دس پانچ پانچ سیکنڈ سکوت بھی کیا تھا۔ پانچ گھنٹہ مسلسل تقریر کہاں کی تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم اجتناب ہو کہیں دس دس سیکنڈ کے سکوت کا بھی اعتبار ہوا ہے۔

اسی طرح جب آپ چلتے ہیں تو حرکت کے ساتھ درمیان میں ایک زمان لطیف کا سکون ہوتا ہے کیونکہ ایک پیر کی حرکت کے بعد بدوں اس کے سکون کے دوسرے پیر کو حرکت نہیں ہو سکتی مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل بارہ کوس تک چلتے رہے۔

غرض احکام عرفیہ عادیہ میں استمرار و دوام کے لئے زمان لطیف کا تخیل مخل نہیں ہوتا تو نفخ صور کے وقت ارواح کا فنا تھوڑی دیر کے لئے یا ایک لمحہ کے لئے ہوگا محض تحلہ قسم کے طور جیسے قرآن میں ہے ان منکم الا وادھا کہ ہر شخص کو جہنم کا درود ضرور ہوگا درود بمعنی مرور بھی آتا ہے اس پر تو کچھ سوال بھی نہیں اور بمعنی دخول بھی ہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ بعض تو دخول سے محفوظ رہیں گے۔ تو اس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ بعضوں کا درود اگر بمعنی دخول بھی ہو محض تحلہ قسم کے لئے ہوگا جس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کی پشت پر پل صراط بچھایا جائے گا جس پر ہو کر سب مسلمان گزریں گے۔ بعض تو کٹ کر جہنم میں ہی گر پڑیں گے۔ یہ حقیقتاً درود ہوں گے اور بعض مثل برق خاطف کے گزر جائیں گے۔ ان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ جہنم کدھر کو بھی ان کا وارد تحلہ قسم کے لئے ہوگا کہ بس جہنم کی پشت پر سے گزر گئے اور راستہ میں جہنم پڑ گئی گو ان کو خبر بھی نہ ہوئی جیسے کوئی جلدی سے آگ کے اندر ہاتھ کو گزار دے اسی طرح تحلہ قسم کے لئے ارواح کا فنا بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقاء نہ ہوگا۔

یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمانہ آنات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے تو اب یہ کہنا سہل ہے کہ ارواح کا بقاء تو زمانی ہے اور فنا آنی ہے اور بقاء زمانی کا انقطاع فنا زمانی ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ فنا آنی ہے۔ اس تقدیر پر حقیقت میں بھی انقطاع بقاء نہ ہوگا۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا
وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ
وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ
عَلَى الْكَافِرِينَ ۖ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوًى
الْمُتَكَبِّرِينَ ۖ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا
وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۖ

ترجمہ: اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہائیں جائیں گے یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے اس وقت اسکے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا پھر (ان سے) کہا جائے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں رہا کرو (غرض خدا کے احکام سے تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے) اور وہاں محافظ فرشتے ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزہ میں ہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

تفسیری نکات

سوق کا اطلاق مسلمانوں سے مشا کلت کے طور پر ہے

وسیق الذین کفروا الی جہنم زمرا کہ وہ جہنم کی طرف باوجود کراہت کے پیچھے سے ہانک کر لے جائیں گے جیسے جانوروں کو لے جایا کرتے ہیں مگر شاید یہاں کسی کو اشکال ہو کہ اس کے بعد مسلمانوں کے واسطے بھی تو وسیق الذین اتقوا ربہم الی الجنة زمرا فرمایا گیا ہے تو کیا وہ بھی اسی طرح ہانک کر لے

جائے جائیں گے۔ اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ اس جگہ سوق کا اطلاق مشا کلّت کے طور پر ہے جیسے جزاء سینۃ سینۃ مثلہا اور مشا کلّت نہ ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سوق کے اصلی معنی تقاضا سے لے جانا ہے پھر کبھی تقاضا کے ساتھ تذلیل بھی ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرا شخص جانا ہی نہ چاہے اور کبھی محض تقاضا ہوتا ہے۔ تذلیل نہیں ہوتی جیسے آپ اپنے لڑکے کو ساتھ لے کر سفر میں جائیں اور وہ راستہ میں ہر شہر کی سیر کرنا اور ہر دوکان و بازار کو دیکھنا چاہے تو آپ تقاضا کرتے ہیں کہ میاں جلدی چلو یہاں کیا رکھا ہے منزل پر پہنچ کر ہر قسم کا سامان راحت مہیا ملے گا۔ اس صورت میں بھی سوق کا اطلاق ہو سکتا ہے اب سمجھئے کہ جنت میں جیسی لذت و راحت ہے وہ ظاہر ہے کہ جنت کا ارد گرد بھی پھول پھلوانی اور زینت و آرائش اس قدر ہے کہ دنیا میں کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی تو جس وقت مسلمان جنت کی طرف چلیں گے اس وقت وہ راستہ کی زینت اور آرائش کی سیر میں مشغول ہو جائیں گے اور اس کے دیکھنے کے لئے ٹھہر جائیں گے کہ بھائی یہ پھول پتی بڑی عجیب ہے ذرا اس کی بھی تو سیر کر لیں یہ باغ تو نہایت ہی بے نظیر ہیں۔ اس کو بھی تو دیکھیں۔ اس وقت فرشتے تقاضا کریں گے کہ تم کا ہے کی سیر میں لگ گئے تم جلدی سے جنت میں پہنچو۔ وہاں ان سب سے زیادہ عجیب و غریب پھول پھلوانی اور میوہ جات ہیں اور وہاں حوریں ہیں غلمان ہیں ذرا تم قدم اٹھا کر وہاں تو پہنچ جاؤ۔ پھر ان سب کو بھول جاؤ گے یہ سن کر مسلمان کچھ تیزی کریں گے کہ تھوڑی دور پر کوئی اور سیر گاہ نظر پڑے گی اس کی سیر کرنے لگیں گے فرشتے پھر جلدی چلنے کا تقاضا کریں گے کیونکہ وہ خیر خواہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ جنت کو دیکھ کر خود افسوس کریں گے کہ ہم نے خواہ مخواہ راستے کی چیزوں میں دیر کی جنت کے سامنے تو سب گرد ہیں اس واسطے مسلمانوں کے لئے بھی وسیع فرمایا کیونکہ ہم بھی تقاضے کے ساتھ لے جائے جائیں گے گوان کا تقاضا اور طرح کا ہے اور کفار کا تقاضا دوسری طرح کا ہے مگر معنی سوق کے دونوں جگہ متحقق ہیں۔

لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس (بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کی پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلانی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مر گل کر دو بارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دو بارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے

بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے۔ گفتگو معنی اور سوویت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف و اکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں ء انتم اشد خلقاً ام السماء بناها رفع سمکھا فسواها واغطش لیلھا واخرج ضحھا۔ (بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا) یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ثم استوی الی السماء فسواھن سبع سموات (وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان) جس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور ارشاد ہے وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض (اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا تمہارے لئے) اور وسخر لکم الشمس والقمر دائبین (اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں) اور وسخر لکم اللیل والنهار واتاکم من کل ماسالتموہ (اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو مسخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگی وہ تمہیں دیدی۔

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ①

ترجمہ: اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتے ہیں اور جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

دو گناہوں کا ذکر

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں آنکھوں کے گناہ بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے بد نگاہی۔

بد نگاہی کی سزا بیان نہ کرنے میں حکمت

اسی واسطے فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعين وما تخفي الصدور يعلم۔ کالفظ دال ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرمادی ہے اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جو توں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جو تیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے ان کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جائے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے

لیکن اس سے وہ گڑ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جب یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جاوے گا تو اور بھی زیادہ عرق عرق ہو جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ پیارا آتا ہے مجھ کو انشا ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے وہ دمدم عنایت

كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٌ ۝

ترجمہ: اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور و جابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے

رخصت کے وقت بھی مصافحہ درست ہے

ارشاد فرمایا مصافحہ متمم تحیات ہے اور ”ان من تمام تحیاتکم المصافحة“ اور جاتے وقت بھی تحیات ہے تو متمم بھی ہے اور ہمارے بزرگوں کے عمل در آمد رہا۔

كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار۔ یہاں موقع تھا علی قلب کل متکبر جبار کا۔ پس بعض تو قلب کے قائل ہوئے اور کسی نے کل اجتماعی کہا، میں کہتا ہوں کہ کل افرادی بہتر ہے متکبر جبار کے ایک مفہوم ہے۔ اس کے افراد ہے۔ سب پر طبع ہوتا ہے یہ توجیہ میری سمجھ میں آئی۔ یعنی جن قلوب پر صادق آتا ہے ”ہذا متکبر جبار“ ان کے قلوب پر طبع کرتے ہیں بالکل سیدھی بات ہے اور نکتہ یہ ہے کہ تعیم طبع کا بالذات ہوگا اور دوسری توجیہ میں بالتبع ہوگا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۹۳)

حسن سلوک کا اثر

ایک صاحب کہیں ملازم تھے وہاں ان کی کسی سے بنتی نہ تھی وہ شکایت کر رہے تھے فرمایا کہ بھائی برتاؤ وہ چیز ہے کہ دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں فاذا الذی بینک و بینہ عداوة کانه ولی حمیم یہ تو کلام مجید ہے اس میں تو کوئی بول ہی نہیں سکتا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۶ ص ۱۱۲)

دعا سب کی قبول ہوتی ہے یہاں تک کہ شیطان کی بھی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ دعا سب کی قبول ہوتی ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کچھ قید نہیں انسان کی بھی قید نہیں حتیٰ کہ جانوروں تک کی دعا قبول ہوتی ہے ایک نبی دعا کے لئے چلے بارش نہ ہوتی تھی دیکھا کہا ایک چیونٹی ہاتھ اٹھائے دعا کر رہی ہے ساتھیوں سے فرمایا چلو بھائی اب ضرورت نہیں رہی دعا کی اس کی دعا

قبول ہو چکی اور شیطان کو دیکھئے کٹ رہا ہے پٹ رہا ہے جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ لعنت کا طوق گلے میں ڈالا جا رہا ہے اس وقت دعا کی اور دعا بھی ایسی جو کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ قیامت تک زندہ رہوں اور اس پر وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ سب قبول کیا ٹھکانا ہے اس وسعت رحمت کا ناواقفوں میں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی مگر کونسی دعا اور کہاں کی دعا کچھ معلوم بھی ہے آخرت میں بیشک کافروں کی دعا نجات کے لئے قبول نہ ہوگی وما دعاء الکافرین الا فی ضلال۔ کے یہی معنی ہیں اس ہی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ خود نہ دیکھیں کسی عالم سے پڑھنا چاہیے سبقاً سبقاً اور عالم بھی حافظ ہوتا ہے اوپر نیچے کی آیت کو دیکھ کر سمجھ سکے مطلب یہ کہ سیاق و سباق معلوم کر سکے۔ (اشرف التفاسیر ج ۳ ص ۱۰۷)

وَمَا دُعَاؤُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

ترجمہ: اور کافروں کی دعا محض بے اثر ہے

تفسیری نکات

کیا کافر کی دعا قبول ہو سکتی ہے

عدم اجابت دعا کافر پر استدلال کرنا جیسا بعض کا قول ہے یہ شبہ سیاق و سباق پر نظر نہ کرنے سے پڑا ہے اس سے پہلے عذاب آخرت کا ذکر ہے وقال الذین فی النار لخنزیر جہنم ادعوا ربکم الی قولہ قالوا فادعوا پس کافر جہنم سے نکلنے کی اگر دعا کریں تو وہ دعا قبول نہ ہوگی ورنہ عام طور پر یہ حکم نہیں چنانچہ ابلیس کی دعا قبول ہونا منصوص ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنْ

اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کا (ابتدا) پیدا کرنا آدمیوں کے (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

تفسیری نکات

انسان عالم صغیر ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ حکماء انسان کو عالم صغیر کہتے ہیں اور صوفیہ کبیر کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت میں تصریح ہے انسان کے صغیر ہونے کی اور اس صورت میں حکماء اور صوفیہ کے کلام میں تعارض معلوم ہوتا ہے اور حکماء کی تائید کلام پاک سے ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اس لئے کہ انسان میں دو درجہ ہیں ایک کے اعتبار سے حکماء کا قول صحیح ہے اور ایک اعتبار سے صوفیا کا قول صحیح ہے یعنی مادہ کے اعتبار سے تو انسان عالم صغیر ہے جیسا لفظ خلق اس پر دلالت ہے اور روح کے اعتبار سے عالم کبیر ہے اور اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کے اکثر دقائق لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اس لئے ان کے اقوال کو بظاہر دلائل کے معارض سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت ہوتی ہے مثلاً اس وقت میں نے ہی حکماء اور صوفیہ کے قول کو بیان کیا بتلائے ان میں کیا تعارض ہے۔

ثبوت معاد

لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس سے شاید شبہ پیدا ہوا کہ۔ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرگل کر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف و اکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے فرماتے ۱ انتم اشد خلقاً ام السماء بناہا رفع سمکھا فسواہا واغطش لیلہا واخرج ضحہا یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ثم استوی الی السماء فسواہن سبع سموات۔

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ

عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: اور کہا تمہارے رب نے مجھے پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

تفسیری نکات

اہمیت دعاء

اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وقال ربکم حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرما دیا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی ہو جائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو پھر لفظ ربکم ارشاد فرمایا۔ اس میں بوجہ اظہار ربوبیت گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کر لینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں حتیٰ کہ بدوں تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے نہیں ضرور قبول کریں گے۔

مانبودیم و تقاضا مانبود لطف ناگفتہ مای شنود

آیت واذا نشاء کم من الارض واذا انتم اجنة فی بطون امہاتکم الخ میں اسی تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھے ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہو سکتے یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچے کو دودھ چوسنا سکھلایا۔ حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جب کہ خود طبیعت ہی کو وہ بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو اور کیا ہے۔

تیسرا اہتمام ربکم کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظر دوسری آیت میں اضافت ہے ولویؤاخذوا للہ الناس الی قوله کان بعبادہ بصیرا۔ حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیر یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب

کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے۔
 هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
 پیدا کی ہے۔ خواہ ان کا نفع بلا واسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ درواسطہ۔ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لئے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا جس کیلئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت ہے۔ جب آدمی نہ ہوں تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر اسباب سامان کس کام کے۔

البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بروں کو تو ان کے برے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدرے قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کو جینا و بال ہو جاتا۔ ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوتا اس سے بڑھ کر مقدمہ دعا میں اس آیت میں یہ اہتمام فرمایا کہ دعا نہ کرنے والوں کے واسطے ترہیب فرمائی کہ ان الذین يستكبرون الخ

ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ

اس موقع پر ایک فائدہ علمیہ کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ترہیب اعراض عن الدعاء پر ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو مادہ دعا کا اور ترہیب میں مادہ عبادت کا ذکر ہے چنانچہ يستكبرون عن عبادتی ہے يستكبرون عن دعائی نہیں ہے اور تطابق ضروری اس لئے یا تو دعا بمعنی عبادت کیا جائے یا عبادت بمعنی دعا قرار دیا جائے احتمال دونوں فی نفسہ برابر ہیں مگر چونکہ کلام مجید کا سمجھنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص زیادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مخاطب اول آپ ہی ہیں اس لئے اسکے تعین کے لئے حدیث کو دیکھا گیا۔ سو آں حضرت نے ارشاد فرمایا۔ الدعاء منخ العبادۃ دعا عبادت کا خلاصہ ہے۔
 او پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے ثابت ہوا کہ دعا اپنے معنی پر ہے اور عبادت سے مراد یہاں خاص دعا ہے ان اہتماموں سے دعا کی شان و عظمت کس درجہ ظاہر ہوتی ہے۔

سورة حم السجدة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ مِّنْ حِسَابِ

تَرْجَمَةٍ: اور ہم نے ان پر ایک ہوائے تندایسے دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے

تفسیری نکات

بدفالی بری چیز ہے

اکثر عورتیں بدھ کے دن کو منحوس سمجھتی ہیں اور غضب ہے کہ بعض مرد بھی اس میں ان کے ہم عقیدہ ہیں مثلاً عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی دن کو گھر میں بولے تو اس دن مہمان ضرور آتے ہیں اسی طرح اگر آٹے میں پانی زیادہ ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے اکثر جانوروں کو منحوس سمجھ رکھا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قمری منحوس ہے اس کو گھر نہ پالو بلکہ اگر شوق ہو تو مسجد میں پالنا چاہئے شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر اجڑا تو اللہ ہی کا گھرا جڑے۔ نعوذ باللہ۔

غرض جتنی چیزیں اپنے سے نکمی ہوں سب خدا کے لئے بعض عورتیں کیلے کے لگانے کو منحوس سمجھتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ درخت مردے کے کام میں آتا ہے اس لئے اس کو گھر نہ ہونا چاہیے کہ شگون بد ہے اور مردے کی چار پائی کو اس کے کپڑوں کو منحوس سمجھتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اس کے کپڑوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس کا قیمتی دوشاخے ہو یا اس کی جائیداد ہو تو اس کو منحوس نہیں سمجھتے حالانکہ اگر مردے کے ساتھ تلبس سے اس کے لباس میں نحوست آئی ہے تو اس تلبس سے اسکے قیمتی کپڑوں میں نحوست آنی چاہیے اور اگر مردے کی طرف نسبت سے ان چیزوں میں نحوست آئی ہے تو اسی نسبت سے اس کی جائیداد میں بھی نحوست آنی چاہیے۔ یہ عقیدہ بالکل مہمل وہم ہے مسلمانوں میں اس کا رواج ہندوؤں سے آیا اور بعض چیزوں کو مرد بھی منحوس سمجھتے ہیں

جیسے الوکی نسبت کہتے ہیں کہ یہ جس مقام پر بولتا ہے وہ مقام ویران ہو جاتا ہے اس لئے وہ منحوس ہے حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ الو منحوس ہے نہ اس کے بولنے سے کوئی جگہ ویران ہوتی ہے یاد رکھو وہ جو بولتا ہے تو خدا کا ذکر کرتا ہے تو کیا خدا کے ذکر سے یہ نحوست آئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذاکر تو ہے لیکن اس کا ذکر جلالی ہے اس لئے اس کا یہ اثر پڑتا ہے حالانکہ خود یہ تقسیم اور یہ کہ جلالی میں یہ خاصیت ہوتی ہے یہی بے اصل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ الو ایسے مقام کو تلاش کرتا ہے جہاں یکسوئی ہو اور اسکو اندیشہ نہ رہے اس لئے وہ ویرانوں میں بیٹھتا ہے اب یہ دیکھئے کہ وہ ویرانی جو پہلے سے ہے کہاں سے آئی سو وہ ہم لوگوں کے گناہ اور اعمال بد کی وجہ سے ہوتی ہے اس کے بعد الو اس مقام پر آتا اور بولتا ہے بس ویران کن ہم اور ہمارے گناہ ہوئے نہ کہ الو اور جب یہ ہے تو منحوس گنہگار ہوئے الو کیوں منحوس ہوا بعض پڑھے ہوئے لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے دن کے منحوس ہونے پر وارسلنا علیہم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات الخ (اور ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو ان کے حق میں منحوس ہے) کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں عادی عذاب نازل ہوا ہے وہ دن منحوس ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دن کون کون ہیں اس کا پتہ دوسری آیت کے ملانے سے چلے گا فرماتے ہیں کہ واما عاد فاهلکوا بریح صر عاتیہ سخرھا علیہم سبع لیل و ثمانیۃ ایام حسوماً (اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا گیا تیز و تند ہوا کے ذریعہ جو ان پر سات رات اور آٹھ روز مقرر کر دی گئی تھی) کہ آٹھ دن تک ان پر وہ عذاب رہا تو صاحبو! اس اعتبار سے تو چاہیے کہ کوئی دن مبارک ہیں نہ ہو بلکہ ہر دن منحوس ہو کیونکہ ہفتہ کے ہر دن میں ان کا عذاب پایا جاتا ہے جن کو ایام نحسات کہا گیا ہے تو کیا اس کا کوئی قائل ہو سکتا ہے اب آیت کے صحیح معنی سنئے مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان پر جن ایام میں عذاب ہوا وہ ایام بوجہ نزول عذاب خاص ان کے لئے منحوس تھے نہ کہ سب کے لئے اور وہ عذاب تھا بوجہ معصیت کے پس مدار نحوست کا معصیت ہی ٹھہری اب بحمد اللہ کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں نے قرآن شریف کی دوسری آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نحوست ہمیشہ کے لئے ہے قرآن شریف میں ہے فی یوم نحس مستمر (منحوس دن میں آندھی چلائی) مگر میں کہتا ہوں کہ مستمر کے دو معنی ہیں ایک دائم دوسرے منقطع دوسری تفسیر پر یہ معنی ہوں گے کہ وہ نحوست منقطع ہوگئی اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (جب کسی چیز میں شک پیدا ہو جائے تو اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں) اور اگر کسی کی خاطر سے ہم مان بھی لیں کہ مستمر کے معنی دائم ہی کے ہیں تو ہم وہی پہلا جواب دیں گے کہ نحس سے مراد نحس علیہم ہے اور ان کے حق میں بوجہ عذاب کے دائم ہونے کے وہ یوم ہمیشہ ہی کے لئے منحوس ہے عرض یہ اعتقاد کہ چیزوں میں نحوست ہے غلط ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
 الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي
 كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے
 ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم
 سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

تفسیری نکات

اقرار تو حیدور بو بیت بہ قلب

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا

اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر جے رہے (یعنی مرتد
 نہیں ہوئے) البتہ قالوا میں ایک قید بے شک ضروری ہے یعنی قالوا بقلوبہم کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی
 ربوبیت و تو حید کا اقرار دل سے کیا ہو پس قواعد شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے کیوں کہ بدوں تصدیق بالقلب کے
 ایمان معتبر نہیں۔ پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہے مگر اجراء احکام کے لئے زبان سے کہنا
 شرط ہے جس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں۔ اس کے حقوق
 ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں۔ اس کو اپنے اندر ملانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو ظاہری قواعد سے حکمت
 معلوم ہوتی ہے اور قواعد باطن سے اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے اسی
 طرح ظاہر کا بھی اثر باطن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے حفظ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان ہے زبان سے جس
 لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے وہ دل میں جم جاتا ہے اسی طرح ذکر باللسان کو زیادت اثر فی الباطن میں دخل ہے پس
 ان الذين قالوا ربنا الله کے معنی یہ ہیں الذين امنوا بالقلب و صدقوا باللسان جنہوں نے دل سے
 خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی اور ثم استقاموا کے معنی یہ ہیں کہ اقاموا علیہ ولم یرتدوا پھر اس پر
 جے رہے اور مرتد نہیں ہوئے جزو اول قالوا ربنا میں احداث ایمان ہے اور جزو دوم ثم استقاموا میں ابقاء ایمان
 ہے۔ یہ معنی ہیں استقامت کے سیدھے سادے۔ آگے اس پر تفریع ہے۔

تتنزل عليهم الملكة الا تخافوا ولا تحزنوا

کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں (کہ آخرت کے احوال سے) ڈرو مت اور دنیا کے فوت ہونے کا) غم نہ کرو! الخ یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہوگی کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے وہ مطلق استقامت پر متفرع ہے خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کر دیا۔ پس یہ تنہا ہی جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اکیلے ہی قلائچیں مارتے پھریں گے۔ مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں تو خود بھی نہ جائیں گے کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقویٰ سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھتے ہیں تو اس کے مواخذہ میں بھی اول مستحق کیسے ہو جاویں گے۔

استقامت آسان ہے

بعض لوگوں کو بعض نصوص سے اس کا شبہ ہو گیا ہے کہ استقامت دشوار چیز ہے چنانچہ بعض نے فاستقم کما امرت سے کما امرت کی قید دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے جب ہی تو اس کو کما امرت کے ساتھ مقدم کیا گیا ہے ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی اور یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے کیونکہ آگے ومن تاب معک بھی ہے جس سے مطلب یہ ہوا

استقم کما امرت ولیستقم من تاب معک کما امروا

کہ جس طرح کا آپ کو امر ہے اس طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں جیسے ان کو امر ہوا ہے اس طرح وہ مستقیم رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب کو امر الہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے اس سے کم درجہ کافی نہیں۔

تو سمجھنا چاہیے کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق میں غور نہیں کرتے اس لئے شبہ میں پڑ گئے۔ اگر ماسبق و لاحق کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے

ولقد اتینا موسیٰ الکتب فاختلف فیہ ولولا کلمة سبقت من ربک لقضیٰ بینہم

وانہم لفی شک منه مریب و ان کلالما لیوفینہم ربک اعمالہم انہ بما یعملون خبیر ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی۔ سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی۔ جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے اور بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں۔

کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے

فاستقم كما امرت و من تاب معك

جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے کہ اس آیت سے حضورؐ کا تسلیہ مقصود ہے گو تسلیہ صریح نہ ہوں مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضرور ہے کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریح میں بھی مذکور ہے حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو۔ کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے ہم نبٹ لیں گے چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے۔ کہ اول کفار کا حال بیان فرمایا کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور ہم ان کو ابھی سزا دیتے۔ مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے اس لئے دنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کیے کا بدلہ ملے گا اس کے بعد فرماتے ہیں فاستقم كما امرت۔

یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں۔ بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔ یہ حاصل ہے آیت کا بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو حدیث استقیموا ولن تحصوا سے شبہ ہوا ہے جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مستقیم رہو مگر تم سے احصار نہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس میں حضورؐ نے بتا دیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس کا احصار دشوار ہے مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہ اس کا مصداق ہے کہ حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء۔

صاحب! اگر ولن تحصوا کا متعلق وہی استقامت ہے جس کا امر کیا گیا ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضورؐ ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتا یہ تو لایکلف اللہ نفسا الا وسعها کے صریح خلاف ہے کہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ تم سے ہونہ سکے گی تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا۔ اس لئے یہ مطلب غلط ہے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ

استقیموا ما استطعتم ولا تتعمقوا فیہا فانکم لن تحصوها ولا یشار الدین احد الا غلبہ یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو۔ یہ تو مامور بہ ہے۔ باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو۔ کیوں کہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ تم سے نہ ہو سکے گا اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے کیوں کہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو مامور بہ نہیں ہے باقی جو مطلب حدیث

کا یہ لوگ سمجھتے ہیں وہ تو نص کے خلاف ہے حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا اور ہر موقع پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہو فوراً اشکال رفع کیا ہے۔ چنانچہ جب اتقوا اللہ حق تقاتہ (ترجمہ) اللہ سے ڈرو۔ جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ فرمایا تو صحابہ گواشکال ہوا کہ یہ کس سے ہو سکے گا اور ایسا تقویٰ جو حق الوہیت کے شایان ہو کون کر سکتا ہے؟ تو اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطيعوا ”یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہو سکے“

بعض صحابہؓ نے اس کو پہلی آیت سے کے لئے نسخ فرمایا ہے مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے اور خوب ہی فرمایا ہے کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تفسیر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے پس بعض صحابہؓ کا اس کو پہلی ہی آیت کے لئے نسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہو گئی اور بتلادیا گیا کہ حق تقاتہ سے مراد وہ تقویٰ ہے جو تمہاری استطاعت میں ہو جتنا تقویٰ تم سے ہو سکے کرو وہ حق تقاتہ ہی میں داخل ہے بحمد اللہ اشکالات سب رفع ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر مقرر ہیں وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی کیونکہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے۔

مگر اس پر اب شاید یہ اشکال ہو کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں کہ بس ایمان حاصل ہو اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں کہ ان اہل استقامت پر رحمت فرشتے کے نازل ہوتے ہیں بشارت سناتے ہیں خوف و حزن کو رفع کرتے ہیں فرشتے ان کے رفیق ہوتے ہیں اس میں صالح اور فاسق سب برابر ہو جائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہو گئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی۔ بس ایک شخص امنست باللہ زبان سے اور دل سے کہہ لے اور اس پر جمار ہے پھر جو چاہے اعمال کرتا رہے اس کے لئے رحمت بھی ہے۔ بشارت بھی ہے فرشتوں کی رفاقت بھی ہے حزن و خوف سے بے فکری بھی ہے۔

اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدہ کلیہ سے دیتا ہوں جو ہر مقام پر کارآمد ہے کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے جیسے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنا ہے کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں۔ اگر کسی کو وسعت نظر کا شوق ہو ان کا یہ شوق مبارک ہو ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیئے تھے جنہوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا۔ کیسا ہی اشکال ہو ان کی چند باتوں سے جو یاد ہیں رفع ہو جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ شارع نے جو اعمال کے فضائل بیان کئے ہیں وہ گویا خواص اعمال ہیں اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتقاع موانع سے مشروط ہوتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ادویات کی خاصیت بیان کرے تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ

اگر اس کے مخالف کوئی مضر چیز نہ کھائی جائے تو یہ نفع ظاہر ہوگا پس اگر کوئی خمیرہ گاؤ زبان عنبری پر دو تولہ سکھیا بھی کھالے اور مر جائے تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہو جائیں گے اسی طرح لا الہ الا اللہ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت ہے کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے بشارت سنائی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے مثلاً لا الہ الا اللہ کے بعد ان اللہ ثالث ثلثہ یا مسیح ابن اللہ وغیرہ نہ کہے اگر کلمہ ایمان کے بعد کلمہ کفر بھی کہہ دے گا تو اس کی وہی مثال ہوگی جیسے خمیرہ کے بعد سکھیا کھالے۔

منافی کی دو قسمیں

پھر منافی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پورا منافی ہو جیسے کلمہ ایمان کا مقابلہ کلمہ کفر ہے۔ یہ تو مبطل خاصیت ہے کہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کو بالکل باطل و زائل کر دے گا اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو بلکہ فی الجملہ منافی ہو جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں۔ ان سے کلمہ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی مگر کمزور ہو جاتی ہے نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤ زبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل ورگڑ اور سرکہ اور بینگن بھی کھائے جائیں کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت کمزور ہو جائے گی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔

اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہو گیا وہ یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا کہ یہ فضائل خواص اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے تو رسول اللہ کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا کہ یا رسول و ان زنی و ان سرق۔

مگر حضورؐ نے ان کو مضر نہیں مانا یعنی جب آپؐ نے فرمایا کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مر جائے دھولا یشرک باللہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو تو یہ شخص جنت میں جائے گا اس پر حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپؐ نے فرمایا و ان زنی و ان سرق۔

ہاں اگرچہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بد پرہیزی سے بچنے کے ساتھ مفید نہیں۔

تقریر گزشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا۔ کہ اس حدیث میں حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زنا و سرقہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لئے مبطل نہیں۔ حضرت ابوذرؓ اس کو مبطل سمجھتے تھے حضورؐ نے اس کی نفی کر دی۔

رہا یہ کہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا و سرقہ وغیرہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لئے مضعف اور اس کے لئے ظہور کے لئے مؤخر ہیں۔ یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاوے گا مگر دیر میں جائے گا یا یہ کہا جائے کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر مفروز جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہو

جاتا ہے تو مرکب کا مزاج دوسرا ہو جاتا ہے پس اگر ایمان اعمال صالحہ کے ساتھ مرکب ہو تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی کیوں کہ یہ اجزاء لا الہ الا اللہ کے مناسب ہیں اور اگر اعمال سیئہ سے مرکب ہو تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا یا یہ کہا جائے کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر عارض و موانع کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔

اور تنزل کا صیغہ بتلا رہا ہے کہ یہ نزول بتدریج کیے بعد دیگرے ہوگا تا کہ زیادت مسرت و انشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو جیسے ایک شخص مہمان ہو کر بادشاہ کے یہاں جائے تو اول تو اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں پھر تھوڑی دیر چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری و مبارک باد سنائے کچھ دیر کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارک باد اور خوشخبری سنائے تو اس میں زیادہ مسرت و اکرام ہے دفعۃً ہجوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے اس لئے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً کیے بعد دیگرے ہوگا پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے لا تخافوا ولا تحزنوا کہ آفات قیامت سے تم اندیشہ نہ کرو اور دنیا کے چھوٹے کارنچ نہ کرو۔ کیونکہ آگے تمہارے لئے امن و راحت اور نعم البدل ہے۔

وابشروا بالجنة التي كنتم توعدون

تم جنت کے ملنے پر خوش رہو۔ جس کا (پیغمبر کی معرفت) تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں تو اب دنیا کے چھوٹے کارنچ کا کیا رنج۔

حقیقت دنیا

یہ تو ایسا ہوا جیسا کسی کو اشرافی مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو جایا کرے جس کے بدلہ میں اشرافی مل جائے۔

اس کے بعد فرشتے کہیں گے نحن اولیاءکم فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة

کہ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اعمال صالحہ انسان کے دل میں القا کرتے ہیں۔ دوسرے مصائب کے وقت سکینہ و اطمینان نازل کرتے ہیں چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور چین بھی ہوتی ہے یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جہاد میں بھی ملائکہ سکین نازل کرتے ہیں چنانچہ نص میں ہے کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے اور ان کا کام یہ تھا فثبتوا الذین امنوا

کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوت دیں اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم بنائیں گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے مگر

اصل کام ان کا وہی تثبیت اور انزال سکینہ تھا تیسری رفاقت یہ ہے کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں نص میں ہے لہ معقبات من بین یدیه و من خلفه یحفظونه من امر اللہ و اذا اراد اللہ بقوم سوء افلا مردلہ

انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی اسکے دشمن جنات بھی ہیں اور فرشتے جنات سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جنات اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں۔ ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں تب وہ ٹل نہیں سکتی۔ اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے اور جنات یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے اور آخرت کی ایک رفاقت تو اوپر معلوم ہو چکی کہ مرتے ہوئے اور قبر میں اور حشر میں گھر سے نکلتے ہوئے بشارتیں سنائیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقع پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے یعنی جنت میں۔

یدخلون علیہم من کل باب۔ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارک باد دینے آئیں گے۔ ولکم فیہا ماتشتہی انفسکم ولکم فیہا ماتدعون۔

یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا اس کی یہ حالت ہوگی کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو گے تمہارے لئے وہاں موجود ہے۔ اس پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ لکم فیہا ماتشتہی انفسکم کے بعد لکم فیہا ماتدعون کی کیا ضرورت تھی کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع ہے جب وہاں ہر مشتمی موجود ہے تو اس سے ہر مدعی کا ہونا خود لازم آ گیا پھر اگر کسی وجہ سے اس کو بیان کیا گیا تھا تو بقاعدہ بلاغت ابلغ کو مؤخر کرنا چاہیے تھا کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی ماتشتہی انفسکم کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتمی اور مدعی تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ منہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں جیسے منہ مانگی مراد فوراً پوری ہوگی ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہوگی روایات میں ہے کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھ کر رغبت کرے گا تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آ جائے گا اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا۔ اس تسویہ کو بیان کرنے کے لئے دونوں کا ذکر ضروری تھا اور لکم فیہا ماتشتہی انفسکم کی تقدیم بھی اسی لئے ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے مثلاً کہا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے کہ مشتمی جنت میں مثل مدعی کے ہے ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کرنا مقصود نہیں کیوں کہ یہ مراد کے خلاف ہے اب اشکال رفع ہو گیا۔

آگے فرماتے ہیں نزلہ کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا بھیک منگوں کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا

بلکہ عزت و قدردانی کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا تو قاعدہ ہے کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے اور دور دور کی سوچھا کرتی ہے اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے نہ ہمارے اعمال اس لائق تھے ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کیے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مہمانی تھوڑی دیر کے لئے ہو پھر معاصی پر گرفت ہونے لگے اس لئے فرماتے ہی من غفور رحیم۔

کہ گو تم اس قابل نہ تھے مگر حق تعالیٰ بخشے والے ہیں انہوں نے تمہارے عیوب و نقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے کیونکہ وہ بخشے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جرم کو معاف فرما کر عنایت و رحمت بھی فرماتے ہیں وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں اس پر انعام بھی فرماتے ہیں خلعت و زاد راہ بھی عنایت کرتے ہیں۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ

إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں سے ہوں۔

تفسیری نکات

استفہام انکاری ہے یعنی اس سے اچھا کسی کا قول نہیں جو اللہ کی طرف بلاوے احسن سے معلوم ہوا کہ اچھی باتیں تو اور بھی ہیں مگر جتنی اچھی باتیں ہیں ان سب میں زیادہ اچھی بات دعوت الی اللہ ہے استفہام بقصد نفی ہے سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کہ پوچھتے ہیں کون ہے احسن از روئے قول کے اس میں مبالغہ زیادہ ہے کیوں کہ عادت ہے کہ جس جگہ پر تردد ہوتا ہے کہ کوئی خلاف جواب دے دے گا وہاں پوچھا نہیں کرتے۔

مثلاً یوں کہتے ہیں کہ میاں فلاں تجارت سے اچھی کون سی تجارت ہے یہ وہاں کہتے ہیں جہاں مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف نہ ہو اور جہاں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید مخاطب خلاف جواب دے دے وہاں پوچھا نہیں کرتے بلکہ یوں بتلاتے ہیں کہ میاں اس سے اچھی کوئی تجارت نہیں اور جہاں یہ احتمال نہیں ہوتا بلکہ اعتماد ہوتا ہے کہ مخاطب بھی پوچھنے پر یہی جواب دے گا وہاں پوچھا کرتے ہیں کہ تمہی بتلاؤ کہ کون سی بات زیادہ اچھی ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بدیہی اور حسی بات کا کوئی انکار نہیں کرتا اسی طرح اس دعوت الی اللہ کی فضیلت اتنی صاف بدیہی اور محسوس تھی کہ صرف پوچھنا کافی ہو گیا گویا یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس سے اچھی فلاں بات ہے تو استفہام میں تو یہ بلاغت ہے۔

احسن قولاً کی تحقیق

اب احسن قولاً کی تحقیق رہی سو یہ فعل التفصیل کا صیغہ ہے یعنی کس کی گفتگو سب سے اچھی ہے وجہ اس ترجمہ کی ظاہر ہے کیونکہ احسن باعتبار قصد کے صفت ہے قولاً کی اور اقوال ہی کے اعتبار سے اس کی تفصیل بھی ہے اور چونکہ مفضل جنس مفضل علیہ ہی سے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ سب قولوں سے اچھا اس شخص کا یہ قول ہے اور یہاں تک تو کوئی اشکال نہ تھا مگر آگے ارشاد ہے وعمل صالحاً اور عمل صالح بھی کرے۔ اس جملہ کو اس کے معطوف علیہ کے ساتھ ملانے سے حاصل یہ ہوا کہ سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے جو دعوت الی اللہ کرے۔ اور نیک کام کرے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کو تو احسنیت قولاً میں دخل ہو سکتا ہے کیونکہ وہ خود قول ہے اور سب سے احسن مگر عمل صالح کا اس میں کیا دخل کیونکہ وہ فعل ہے قول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ وہ قول نہیں مگر آداب و مکملات قول سے ہے اس لئے یہ بھی قول کے احسن ہونے میں دخل ہے تو حاصل یہ ہوا کہ صاحب قول احسن وہ ہے جو دعوت الی اللہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی خود عمل بھی اچھا کرے یعنی جو کچھ کہے اس کے موافق عمل بھی کرے تب وہ صاحب قول احسن ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کوئی بہت اچھی بات کرے اور عمل اچھا نہ کرے تو قول تو اچھا ہے گو عمل نہیں ہے مثلاً اگر کوئی دعوت الی الاسلام کرے اور خود مسلمان نہ ہو دعوت الی الصلوٰۃ کرے اور خود نمازی نہ ہو اسلام کے اوصاف بیان کرے اور خود ان پر عقیدہ نہ رکھے تو اس پر من احسن قولاً تو صادق آتا ہے کیونکہ اس کے معنی من قولہ احسن ہیں یعنی جس کی بات بہت اچھی ہو۔ وہ احسن قولاً ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب اگر کوئی خود عمل نہ کرے تو اس کے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل رہا اگر اس نے خود نماز نہ پڑھی تو اس کا یہ قول تو احسن ہے زائد سے زائد یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل احسن نہیں تو اس سے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل پڑا۔ اس کا جواب ہنس قرآن بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ قول کے اچھے ہونے میں عمل کے اچھے ہونے کو بھی دخل ہے۔

اقسام داعی

اور اس بناء پر اس آیت سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوا کہ داعی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک صاحب عمل صالح ایک غیر صاحب عمل صالح اول کا قول یا دعوت احسن ہے ثانی کا قول یا دعوت غیر احسن ہے باقی یہ کہ اس کی لم کیا ہے کہ دعوت بلا عمل صالحہ غیر احسن ہے۔

تو اول یہ سمجھنا چاہیے کہ احسن ہونا کیوں ہے سو بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے اور ایک اس کی غایت ہوتی ہے تو قول احسن کی بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک طاعت ہے اور ایک کی غایت ہے اور

وہ غایت یہ ہے کہ وہ دعوت سبب ہے دوسرے شخص کے رجوع الی الخیر کا تو دعوت الی اللہ کو چھا کہا گیا دو وجہ سے کہا گیا ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سبب ہے لوگوں کے متوجہ الی اللہ ہونے کا تو یہ احسبیت تو باعتبار غایت کے ہے اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہا طاعت ہے اور دونوں درجوں میں اس کا احسن ہونا مشروط ہے عمل صالح کیساتھ۔ وعظ اور عمل کے ساتھ ہی اس میں کبر و عجب ہو جاتا ہے کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں حق تعالیٰ اس کے علاج کے لئے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں وقال انسی من المسلمین یعنی اس نے یوں بھی کہا کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔

آپ کو غالباً حیرت ہوگی کہ یہ تو دعویٰ ہوا نہ کہ تواضع۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے عنوانات میں عادت تو دعوے ہی کی ہے اس لئے یہاں بھی دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے مگر یہاں مقصود تواضع ہی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسی چیز ہے جس میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ طاعت کاملہ ہے اور ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ گردن نہاد بن بطاعت ہے گویہ بھی کمال ہے مگر عنوان کمال کا نہیں ہے یا یوں کہو کہ اسلام کی ایک ذات ہے اور ایک صفت ہے جب ذات کے اعتبار سے اپنے اسلام پر نظر پڑتی ہے تو اس نظر کا اور اثر ہوتا ہے اور صفت کے اعتبار سے پڑتی ہے تو اور اثر ہوتا ہے ذات تو ہے گردن نہاد بن بطاعت اور صفت ہے طاعت کاملہ۔ جیسا کہ ان الدین عند اللہ الاسلام اس پر دال ہے یعنی خدا کے نزدیک دین صحیح و کامل اسلام ہی ہے اور چونکہ صفت تابع ہوتی ہے ذات کے اس کا مقتضایہ تھا کہ ہماری نظر اولاً اس کی ذات پر ہوتی مگر اب حیرت ہوگی کہ ہماری نظر اپنے اسلام پر ذات کی حیثیت سے نہیں پڑتی بلکہ صفت کی حیثیت سے پڑتی ہے کہ ہم میں یہ صفت کمال ہے اور اسی بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں کمال ہونے میں تو شک نہیں۔ گفتگو تو یہ ہے کہ تابع پر نظر گئی اصل چیز یعنی ذات پر کبھی نظر نہ گئی اس لئے دعویٰ پیدا ہو گیا چونکہ اس جملہ کے تکلم میں خود عادت ہے دعویٰ کرنے کی نہ کہ تواضع کی اسی لئے قرآن میں بھی سمجھ گئے کہ دعویٰ میں مستعمل ہے حالانکہ یہاں تواضع مقصود ہے اور دونوں کے قصد میں لہجہ بھی جدا جدا ہوتا ہے تو بھائی یہ غلطی تو تمہاری ہے کہ بلجہ دعویٰ پڑھ کر دعویٰ مراد لے لیا تو گویا تم نے معافی کو تابع لہجہ بنا دیا دعویٰ کا کیوں اختیار کیا لہجہ انقیاد کا کیوں نہ اختیار کیا؟

پھر انی مسلم نہیں۔ فرمایا کہ اس میں تفرد کا شبہ ہوتا کیوں کہ بڑے کا تو غلام بنا بھی فخر ہے تو اس صورت میں پھر شائبہ عجب کا رہ جاتا کہ یہ شخص یہ سمجھتا کہ تنہا میں ہی فرمانبردار ہوں سبحان اللہ قرآن مجید میں بھی علوم کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں تو انی من المسلمین میں ایک وجہ دلالت علی التواضع کی تو مادہ کے اعتبار سے تھی اور ایک وجہ صیغہ کے اعتبار سے ہے کہ اس سے اشارہ اس امر کی طرف کر دیا کہ کام کرنے والے بہت ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ایک ہی ہوں کبھی نخرہ پیدا ہوتا کہ میں نہیں کروں گا تو کام رک جائے گا یہ لفظ بھی بتلا رہا ہے کہ وہاں بہت سے غلام ہیں

اگر ایک غلام نے فرمانبرداری نہ کی تو اس نے اپنا ہی کچھ کھویا پھر اس جگہ تو ہر واحد کے اعتبار سے بتایا کہ ایک شخص کے چھوڑ دینے سے ہمارا کام نہیں رک سکتا۔

اب آگے بقیہ آیات کا ترجمہ بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ یعنی اچھائی اور برائی برابر نہیں ہے یہاں سوال ہوتا ہے کہ اوپر تو دعوت الی اللہ کا ذکر تھا یہاں یہ بیان ہے کہ نیکی بدی برابر نہیں ہے آخر اس جملہ کو سیاق و سباق سے کیا مناسبت۔ آگے ارشاد ہے اَدْفَعْ بِالسَّيِّئَةِ هِيَ احْسَنُ یعنی مدافعت کیجئے اس طریقے سے جو اچھا ہو یہ بھی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اخلاق کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اصل تعلق تو دعوت الی اللہ کے معمول سے اَدْفَعْ بِالسَّيِّئَةِ هِيَ احْسَنُ کا ہے اس طرح سے کہ جو شخص دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے عموماً اس کی مخالفت ہوتی ہے لوگ برا بھلا کہتے ہیں ممکن ہے کہ اس وقت اس میں بھی ہيجان پیدا ہوتا ہو اور یہ بھی بدی کے بدلے بدی کر بیٹھے اس لئے ایسے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی تعلیم فرماتے ہیں کہ اخلاق درست کرو اپنے میں ضبط اور صبر پیدا کرو یہ معنی ہوئے اَدْفَعْ بِالسَّيِّئَةِ هِيَ احْسَنُ کے یعنی اَدْفَعِ السَّيِّئَةَ بِالْحَسَنَةِ کہ کوئی برائی کرے تو اسے نیکی کر کے دفع کر دو پس اصل تعلق تو جملہ اَدْفَعِ کا ہے باقی لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ يہ اس کی تمہید ہے یعنی بتانا تو مقصود ہے اَدْفَعِ بِالسَّيِّئَةِ کا مگر تمہید میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ دیکھو نیکی اور بدی اثر میں برابر نہیں ہوتی یعنی اگر برائی کا انتقام برائی سے لے لیا تو اس کا اثر اور ہوگا اور اگر نال دیا تو اس کا اثر اور ہوگا۔ اور وہ اثر یہ ہوگا کہ

فَإِذَا الذِّي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

جس شخص کے اور تمہارے درمیان میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے گاڑھا دوست۔ مطلب یہ کہ دعوت الی الاسلام کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ مخالفین بھڑکیں نہیں کیونکہ اگر بھڑکے۔ تو اس کا شر اور بڑھے گا پہلے چھپی ہوئی عداوت کرتا تھا تو اب کھل ہوئی کرے گا تو اس عداوت سے اور شر سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ نال دو اور انتقام لینے کی فکر نہ کرو تو دشمن دوست بن جاوے گا اور پھر وہ اگر تمہیں مدد بھی نہ دے گا تو تمہاری کوششوں کو روکے گا بھی نہیں اور دعوت الی اللہ کا کام مکمل ہوگا۔

یہاں اس کے متعلق ایک شبہ ہے کہ ہم بعض جگہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس رعایت کے بھی وہ دوست نہیں بنتا بلکہ اپنے شر اور فساد میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بقاعدہ عقلیہ ایک شرط ملحوظ ہے وہ یہ کہ بشرط سلامتہ الطبع کہ وہ شر سے اس وقت باز رہے گا جبکہ سلیم الطبع ہو اور اگر سلامت طبع کی قید نہ ہو تو اس وقت یہ جواب ہے کہ ولی حمیم نہیں بلکہ کانہ ولی حمیم فرمایا ہے تشبیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ شر ہی میں کمی رہے گی اور اگر تم انتقام لو گے تو گو اس وقت یہ عدم قدرت کی وجہ سے خاموش ہو جاوے گا مگر در پردہ کینہ مضمحل

رکھے گا اور حتی الامکان لوگوں سے تمہارے خلاف سازش کرے گا جس کو غلطی سے آدمی کبھی یوں سمجھ جاتا ہے کہ انتقام اُصلح ہوا تو ایک ادب یہ بتانا تبلیغ کا کہ صبر و ضبط سے کام لیا جائے اور جو ناگوار امور مخالفین کی طرف سے پیش آویں انہیں برداشت کیا جاوے اور یہ مدافعت سیدہ بالחסنہ چونکہ کام تھا نہایت مشکل اس لئے اس کی ترغیب کے لئے فرماتے ہیں۔

وما یلقاها الا الذین صبرو او ما یلقاها الا ذو حظ عظیم

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابرین میں شمار ہوگا اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کرو گے تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتاتے ہیں۔

ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ و عمل صالحاً و قال اننی من المسلمین۔

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو بلاوے طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے

اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

تکمیل ایمان کے تین اجزا

اس میں تکمیل ایمان کے لئے تین اجزاء مذکور ہیں۔ ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے۔ امر بالمعروف کرے۔ یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے دوسرے یہ کہ خود بھی اعمال صالحہ اختیار کرے۔ محض نفس ایمان پر اکتفا نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ دعا الی اللہ و عمل صالحاً کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی۔ کیوں کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالحہ بدو اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو اس کے لئے پہلی شرط ہے پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہوگا۔ اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا۔

نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفس ایمان کے مذکور ہیں وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں۔ بدو اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو اب وقال اننی من المسلمین کو اخیر میں کیوں بیان کیا گیا؟ اس کو تو تکمیل استقامت میں دخل نہیں بلکہ نفس استقامت ہی اس پر موقوف ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اسلام من حیث ہوا لا اسلام کا قبول کرنا مراد نہیں کیوں کہ واقع یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا بلکہ فخر کے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ بات نفس اسلام سے زائد ہے۔ یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کا اسلام

کامل ہو۔ لہذا اس کو تکمیل اسلام میں دخل ہوا۔ کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہار اسلام سے عار آتا ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آ گیا تھا۔ مگر میں نے وہاں اس لئے نماز نہیں پڑھی کہ ہندوؤں کے سامنے التماسیدھا ہونے سے اسلام کی تحقیر ہوتی۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے یہ شیطان کی تلمیذ تھی کہ اس نے اس ترکیب سے ترک نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا۔

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں جو اسی آیت کے لئے کالجز و ہے مستقل مضمون نہیں۔ وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجار یا ایداء پہنچاتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تعلیم تو ادفع بالتی ہی احسن سے شروع ہوگی مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں۔

ولا تستوی الحسنة والسینة

یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور برابر تاؤ برابر نہیں ہوتا پس تم کو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہیے وہ کیا ہے؟ آگے اس کا دینیوی فائدہ بتلاتے ہیں۔

ادفع بالتی ہی احسن

یعنی مخالفت کے برے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو بدی کا علاج بھلائی سے کرو۔ اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو ان کے ساتھ خشونت سے پیش نہ آؤ۔

فاذا الذی بینک و بینہ عداوة کانه و لی حمیم

یعنی پھر دیکھ لینا کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے کانه و لی حمیم میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی درست ہو جاتے ہیں اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے لیکن ان کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے اور شر میں تقلیل ہو جاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گو دلی دوست نہ ہو مگر اس میں ایک شرط ہے جس کو میں بھول گیا تھا اپنی تفسیر کو دیکھا تو اس میں اس تمام پر سلامت حس کی قید بڑھائی ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثر یہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے پس اب یہ اشکال نہ رہا کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے جواب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع ہے اس لئے اثر نہیں ہوا سلیم الطبع ہوتا تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے

جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثواب آخرت کے اعتبار سے صاحب نصیب ہے اس میں اس معاملہ کا طریقہ بتلادیا کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو۔ پھر یہ سب کچھ آسان ہو جائے گا۔

آگے فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے (غصہ کا) وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے اس میں غصہ کا علاج بتلایا گیا ہے کہ غصہ کے وقت زبان سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیے اور اس دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہیے کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے جس کے عمل کرنے سے غصہ وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہو جائے گا انہ ہو السميع العليم۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سنتے اور تمہارے اعمال و احوال کو خوب جانتے ہیں اس لئے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو گرفت ہو۔

وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا ذو حظ عظیم۔

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابریں میں شمار ہوگا اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کرو گے تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتاتے ہیں۔ واما

ینزعنک من الشیطن نزع فاستعذ باللہ

اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آوے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے یعنی بعض اوقات مخالفین کی باتوں پر شیاطین غصہ دلاتے ہیں اور اس وقت صبر کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے وقت کے لئے فرماتے ہیں کہ فاستعذ باللہ خدا کی پناہ میں چلے جاؤ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا سے دل سے دعا کرو کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو دور کر دے اور صبر پر استقامت دے انہ ہو السميع العليم بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے یعنی وہ تمہاری زبان سے پناہ مانگنے کو بھی سنیں گے اور دل سے پناہ مانگنے کو بھی جانیں گے اور پھر تم کو پناہ دیں گے اور مدد کریں گے اور شیطان کو دفع کر دیں گے ان آیات میں حق تعالیٰ نے پورے پورے آداب اور مکملات دعوت الی اللہ کے اور اس کے طریقے سب بتادیئے۔

أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ۝

ترجمہ: یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

تفسیری نکات

آغوشِ رحمت

اگر کوئی معشوق اپنے عاشق سے یہ کہے کہ کہو تم مجھے گود میں لیتے ہو یا میں تمہیں گود لے لوں تو واللہ اگر کچھ سلامتی فہم ہے تو کہے گا کہ میری ایسی قسمت کہاں تو مجھے بغل میں لے کے بیٹھے اس لئے کہ بغل میں لینے والا تو محبت ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ اگر کسی کو تمنا ہوتی تو محیط ہونے کی ہوتی ہے خدا کی عنایت ہے کہ وہ تمہیں بغیر تمہاری تمنا کے آغوشِ رحمت میں ایسا گھیرے ہوئے ہے کہ تم کسی آن میں اس سے باہر نہیں ہو سکتے اس سے بڑھ کر اب اور مجالست کیا ہوگی اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے تم یہ چاہتے ہو کہ ثمرات ہوں احوال ہوں ذوق ملے شوق ملے اس کی ایسی مثال ہے کہ

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ پائے بوسی اندریں دم شد گناہ
ترجمہ: بادشاہ اگر دست بوسی کے واسطے کسی کو ہاتھ دیدے تو اس وقت میں قدم چومنا جرم ہے)

سُورَةُ الشُّورَى

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝

ترجمہ: کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے

تفسیری نکات

کوئی چیز حق تعالیٰ کے مماثل نہیں

کہ حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اس لئے خدا کا ہاتھ ہمارے اور تمہارے ہاتھ جیسا نہیں ہے دیکھئے یہاں حق تعالیٰ نے لیس ہو کمثل شیء نہیں فرمایا کیونکہ حق تعالیٰ تو قدیم ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ ان کا وجود کسی شیء کے وجود کی مماثلت پر قائم ہوا ہو اس لئے لیس ہو کمثل شیء کہنے کی ضرورت نہ تھی ہاں دوسری اشیاء حق تعالیٰ کے وجود سے متاخر ہیں ان میں یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید ان میں سے کسی شی کا وجود یا صفت ذات حق تعالیٰ کے وجود یا ذات و صفات کی مثل بنائے گئے ہوں اس کی نفی فرمادی گویا مماثلت طرفین سے ہوتی ہے اور جب ایک طرف سے مماثلت کی نفی ہوگی تو جانب آخر سے بھی نفی ہوگی اس لئے لیس کمثلہ شیء کا مفہوم لیس ہو کمثل شیء کے معنی کو بھی مستلزم ہے مگر پھر بھی جو صورت نفی تشبیہ کی قرآن میں ہے وہ اکمل ہے جس کا نکتہ میں نے بتلادیا۔

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ﴿١٢﴾

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے جو شخص خدا کی طرف رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیتا ہے۔

تفسیری نکات

سلوک و جذب

اجتباء بمعنی جذب ہے یہاں اصطلاح لغت کے موافق ہے یہاں حق تعالیٰ نے جذب کو تو اپنی مشیت پر رکھا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں وہ وعدہ عام نہیں فرمایا اور ہدایت کی انابت پر مرتب فرمایا ہے جو مراد ہے سلوک کا اور فعل ہے عبد کا حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے اختیار سے اعمال قرب کو اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو وصول الی المقصود سے کامیاب فرما دیتے ہیں اور یہ عام طریقہ ہے اس میں کسی کی خصوصیت نہیں۔

یہاں یہ حقیقت سمجھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ ہدایت سے مراد ایصال ہے جس سے معلوم ہوا کہ انابت سلوک پر ایصال ضرور مرتب ہوتا ہے اور ایصال کا حاصل بھی وہی ہے جو اجتباء کا حاصل ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اجتباء عمل سے مقدم ہے اور اس میں عمل کو کچھ دخل نہیں اور ایصال عمل سے مؤخر ہے۔ اس میں انابت و سلوک عبد کو بھی بظاہر کچھ دخل ہے تو معلوم ہوا کہ جذب ہی کی دو قسمیں ہیں ایک قبل العمل ایک بعد العمل۔ مگر زیادہ وقوع جذب بعد العمل کا ہے عادتہ اللہ یہی ہے کہ سلوک یعنی عمل مقدم ہوتا اور جذب مؤخر ہوتا ہے کبھی اس کا بھی وقوع ہوا ہے کہ عمل سے پہلے جذب ہو گیا اور جذب کے بعد عمل مرتب ہوا سو اس جذب قبل العمل کے واقعات دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سلوک و عمل بے کار ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل علت تامہ وصول کی نہیں بلکہ شرط اکثری ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ یوں کہے کہ علاج کو صحت میں دخل نہیں اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ علت نہیں تو صحیح ہے کیونکہ صحت علاج کے بعد ضروری نہیں ممکن ہے کہ ایک شخص علاج کرے اور صحت نہ ہو اور اگر مطلق سببیت کی نفی مراد ہے تو غلط ہے کیونکہ سببیت فی الجملہ مشاہد ہے یہی حال اعمال کا ہے کہ ان کو وصول و قرب میں علیت کا تو دخل نہیں باقی سببیت کی نفی نہیں ہو سکتی۔

یہی مطلب ہے حدیث لا یدخل الجنة احد بعمله کا نہیں داخل ہوگا کوئی جنت میں عمل کے استحقاق کی بناء پر کہ اس میں بھی علیت اعمال کی نفی ہے اور مقصود اس سے عجب کا علاج ہے کہ کوئی شخص عمل

کرے اترائے نہیں کہ میں نے اپنے عمل سے جنت لے لی کیونکہ اول تو عمل کے بعد بھی جذب کی ضرورت ہے اور جذب کا مدار مشیت حق پر ہے سلوک کے بعد بھی وہی پہنچتا ہے جس کو حق تعالیٰ پہنچا دیں کیونکہ وصول عبد کے اختیار سے خارج ہے اس کا مدار ایصال حق پر ہے جو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور گو سلوک پر ایصال کا ترتب عادت ضرور ہوتا ہے مگر جو شے عادت ضروری ہو اور عقلاً لازم نہ ہو اس کو عمل کا معلول نہیں کہہ سکتے اگر وہ عمل کا معلول ہوتا تو عقلاً بھی علت کے بعد اس کا وجود لازم ہوتا اور یہاں ایسا نہیں ورنہ فعل واجب کا معلل ہونا لازم آئے گا اور یہ دلائل سے باطل ہے دوسرے علت و معلول میں مناسبت بھی شرط ہے جزاء عظیم کا ترتب عمل عظیم ہی پر ہو سکتا ہے تو جس درجہ جزاء عظیم ہے عمل بھی اسی درجہ عظیم ہونا چاہیے تو اب دیکھ لو کہ جنت کس درجہ عظیم ہے اور تمہارا عمل کیسا ہے جنت تو کما و کیفاً ہر طرح عظیم ہے کما تو اس کی عظمت یہ ہے کہ غیر متناہی ہے اور کیفاً اس کی یہ شان ہے کہ لا خطر علی قلب بشر (کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزرا) اور ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ کما تو متناہی ہیں اور کیفاً ناقص

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ

دَابَّةٍ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں جو حیوانات پھیلانے ہیں اور وہ ان (خلائق) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے۔

تفسیری نکات

مجموعہ ارض و سماء

مفسرین نے تو اس میں یہ تاویل کی ہے کہ مراد مجموعہ ارض و سما ہے کہ مجموعہ میں دو اب پیدا کئے اور مجموعہ پر حکم ایک جزو کے اعتبار سے بھی صحیح ہے چنانچہ یسخرج منهما اللؤلؤ والمرجان میں مفسرین نے یہی تاویل کی ہے بہر حال ممکن ہے کہ سیارات میں بھی کوئی حیوانی مخلوق ہو اور اس سے اہل سائنس کا غرور تو ٹوٹا کیونکہ وہ اہل مرتخ کو اپنے سے عقل مانتے ہیں پھر اس کے ساتھ سموات اور اجرام علویہ کی مخلوق ملا لو اور اس کے بعد کشف کو بھی ملا تو عبد الکریم جیلی کا کشف ہے کہ ایک دریا زمین و آسمان سے باہر ہے جس کی ایک موج ساتوں آسمان و زمین سے دس لاکھ حصہ زیادہ ہے اگر اس کی موج آسمان و زمین کے ساتھ ٹکرا جائے تو سب غرق ہو جائیں مگر ملائکہ اس کی موجوں کو تھامے ہوئے ہیں تاکہ آسمان اور زمین سے نہ ٹکرائیں اور اس

دریا میں نہ معلوم کتنی مخلوق دریائی ہوگی تو حق تعالیٰ کی کیسی قدرت ہے کہ اپنی تمام مخلوق کی حفاظت اور کافی انتظام فرماتے ہیں اور واقعی اگر وہ حفاظت نہ فرمائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں چنانچہ اس حفاظت پر اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا ایک رات اندھیرے میں خانقاہ سے میں اپنے گھر گیا تو گھر کا راستہ بھول گیا اور کسی کے گھر پر پہنچ گیا بڑی دقت سے گھر کا راستہ ملا اس وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عظمت منکشف ہوئی پس یہ فائدے ہیں مصائب میں کہ ان سے استحضار و عظمت ہوتا ہے کیونکہ رنج و تکلیف اور بیماری میں عظمت حق زیادہ منکشف ہوتی ہے اور اس کے مقابل اپنا عجز بھی زیادہ منکشف ہوتا ہے پس مصائب سے انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے اور عبدیت اعلیٰ مقام ہے اور یہ مصائب میں زیادہ حاصل ہوتا ہے اسی لئے کسی نے کہا ہے

ہلکاران بوقت معزولی شبلی وقت و بایزید شوند
بازچوں میر سند برسر کار شمر ذی الجوش ویزید شوند

عجائبات قدرت کا علم

بعض لوگ جو مرنج میں جانا چاہتے ہیں ہم تو اس ارادہ سے خوش ہیں کیونکہ ہمارے بہت سے کام نکلیں گے اول تو معراج سے اشکال رفع ہوگا دوسرے اخبارات میں وہاں کے حالات پڑھیں گے تو عجائبات قدرت کا علم ہوگا اور شرعاً وہاں آبادی کا ہونا محال نہیں کیونکہ شریعت نے اس کی نفی نہیں کی بلکہ غالب تو یہی ہے کہ سکوت کیا ہے اور احتمال کے درجہ میں بعض نصوص میں اس مسئلہ کو داخل بھی کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر ارشاد ہے۔

ومن ایتہ خلق السموات والارض وما بث فیہما من دابة

”کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں جو حیوانات پھیلائے ہیں (اور دابہ کا اطلاق ملائکہ پر نہیں ہوتا)

شیطان کی مثال

شیطان کی تاریکی جیسی ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگاؤ نہ جلب کے نہ دفع کے لئے ورنہ تم کو لپٹ جائے گا بلکہ اس کو منہ بھی نہ لگاؤ اس کی التفات بھی نہ کرو۔ تم نے اس شیطان سے ڈر کر اس کا دماغ بگاڑ دیا اس سے بالکل نہ ڈرو اور اس کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ انہ لیس لہ سلطان علی الذین امنوا وعلی ربہم یتوکلون انما سلطانہ علی الذین یتولونہ والذین ہم بہ مشرکون جن کا خدا پر بھروسہ ہے جو خدا پر نظر رکھتے ہیں ان پر شیطان کا ذرا بھی قابو نہیں اس کا قابو انہی پر چلتا ہے جو اس سے کچھ وارر رکھتے ہیں اس کو منہ لگاتے ہیں لیس لہ سلطان میں نکرہ تحت انشی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اس کا ذرا بھی قابو

نہیں تم اس کو منہ لگا کر قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہو پس ذکر لسانی و ذکر جہر میں وسوسہ ریا کا اندیشہ نہ کرو اس پر التفات ہی نہ کرو اور اگر شیطان یہ کہے کہ ذکر ریائی بے فائدہ ہے تو کہہ دو کہ تو غلط کہتا ہے یہ بھی ایک واسطہ سے مفید ہے۔ غالباً حضرت حاجی صاحب کی حکایت ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں شخص ریا سے ذکر کرتا ہے فرمایا وہ تجھ سے اچھا ہے اس کا یہی ذکر ریائی ایک ٹٹماتا ہوا چراغ بن کر اسے پل صراط سے پار کر دے گا اور تیرے پاس تو ٹٹماتا ہوا چراغ بھی نہیں اور وہ واسطہ یہ ہے کہ ریا سے آگے چل کر اخلاص بھی پیدا ہو جاتا اور یہ جواب پوری کامیابی نہ ہونے میں مگر پوری ناکامی بھی نہ ہونے میں ایسا ہے جیسا مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک معترض کو جواب دیا تھا۔ اس نے بعض اکابر دین پر جو ایک بڑے کام میں شریک ہوئے تھے مگر ناکام رہے اعتراض کیا تھا کہ ان لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے کو تباہ کیا ان کو کیا حاصل ہوا مولانا نے فرمایا۔

سود اثمار عشق شیریں سے کوہ کن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہہ عشق باز اے روسیہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
مگر اتنا کہے دیتا ہوں کہ ان حضرات کو اپنی سعی میں کامیابی کی توقع غالب تھی اس لئے ان کا وہ فعل موجب اجر تھا گونا گونا کام رہے اور اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو جیسا کہ اس وقت حال ہے تو ایسے افعال جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ یہ گفتگو اس بات پر طویل ہو گئی کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں قالوا اننا لله فرمایا ہے عملہ واعتقدوا نہیں فرمایا تو میں نے بتلادیا کہ قول میں خاص اثر ہے جو مجرد علم میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مصائب کے وقت ہم کو اس مضمون کے استحضار و تکرار کی تعلیم دی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بتلا رہا ہے کہ وہ ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں پریشانی میں نہیں رکھنا چاہتے پس احکام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور معاملات سے بھی اور ان کی صفات سے بھی رحمت و شفقت و رافت کا غلبہ ہوتا ہے چنانچہ جابجا ان اللہ غفور رحیم۔ ان اللہ بکم لرؤف رحیم موجود ہے

ہرچہ می گویند آں بہتر ز حسن یار ماں دارد و آں نیز ہم
جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان حسن سے بہتر ہے۔ ہمارا محبوب یہ آن بھی رکھتا ہے اور حسن بھی۔
اب تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں ایک مقام پر فرماتے ہیں لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حدیث میں ہے سدو و اوقار بوا استقیمو اولن تحصوا ولن یشاد الدین احدا لا علیہ او کما قال جو شخص مشقت میں پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ہی بڑھادیتے ہیں اس کا ترجمہ فارسی میں کسی نے خوب کہا ہے
گفت آساں گیر خود کارکز روی طبع سخت می گیرد جہاں بر مرد مال سخت گوش
ترجمہ: (التفسیر للتفسیر ملحقہ مؤاعظہ تدبیر (توکل) ص ۳۱۰ تا ۳۱۳)

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۝

ترجمہ: اور تم کو (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور بہت سی تو درگزر کر دیتا ہے۔

تفسیری نکات

انسان کی بد اعمالی کے نتائج

تو دیکھئے مسبب واحد ہے اور سبب مختلف مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے جو دبا و عداوت کی وجہ سے پڑا ہے اس کا دوسرا اثر ہے اور جو محبت کی وجہ سے ہے اس کا دوسرا اثر ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک مسبب کے لئے مختلف اسباب بھی ہوا کرتے ہیں تو اب سنئے کہ آپ نے اب تک صرف ایک سبب کو سنا ہے۔ مَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے آتی ہے۔ دوسرا سبب بھی تو سنئے حدیث میں ہے اشد الناس بلاء الانبياء ثم الامثل کہ سب سے زیادہ سخت بلا انبیاء پر آتی ہے۔ پھر ان لوگوں پر جو ان کے بعد دوسروں سے افضل ہوں و علیٰ ہذا معلوم ہوا کہ کلفت کا سبب فقط ایک ہی نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں تو ان پر گناہوں کی وجہ سے کلفت و رنج کا آنا ممکن نہیں لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ کبھی رفع درجات کے لئے بھی کلفت پیش آتی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہ کی وجہ سے آتی ہے کیونکہ مَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ یعنی جو بھی تم کو مصیبت پہنچتی ہے سے عموم مستفاد ہوتا ہے اور فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ تمہارے ہی ہاتھوں کی کر تو ت سے پہنچتی ہے۔ ظاہر احصر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس آیت کو اس حدیث سے تعارض ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا رفع درجات کے لئے بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ ہی کی وجہ سے مصیبت آتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے مَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ کہ جو کچھ تم کو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کر تو ت سے آتی ہے تو یہاں مصیبت کا لفظ ہے اور حدیث میں مصیبت کا لفظ نہیں ہے وہاں بلا کا لفظ ہے۔ پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے کیونکہ مصیبت مذہب (گناہ گار ہی) کو آتی ہے اور اہل مصیبت گناہ گار ہی لوگ ہیں۔ ان پر جب مصیبت آتی ہے گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں وہ اہل بلا ہیں ان پر جب بلاء آتی ہے رفع درجات اور زیادہ بڑھانا محبت کے لئے آتی ہے اور مصیبت اور بلا میں صورۃ فرق کم ہوتا ہے ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے جس

سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی حقیقت بھی الگ الگ ہیں پس مصیبت کی حقیقت ہی سزا اور انتقام اور بلاء کی حقیقت ہے محبوبانہ چھیڑ چھاڑ اور امتحان۔ محبوب کے دبانے اور بھیجنے کو مصیبت کوئی نہیں کہا کرتا پس انبیاء اور مقبولین پر بلا آیا کرتی ہے مصیبت نہیں آیا کرتی اور بلا کے معنی لغت عربی میں آزمائش اور امتحان کے ہیں۔

ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم

صورت مصیبت اور حقیقت مصیبت

کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا اور بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے۔ فاصابتکم مصیبة الموت

نیز غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آیا تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے ان پر یہ مصائب نازل ہوئے اہل حق کا تو مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں حشویہ نے انبیاء کی قدر نہیں کی وہ ان کو معصوم نہیں مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں حشویہ کا یہ قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ اوروں کو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی۔

پس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے تو وہ گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں۔ گو صورت اس کی ہوا ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ غایت انقیاد و تقویٰ سے یوں کہتے تھے

اے حریفان راہ ہار ابستہ یار آہوئے نیگم داو شیر شکار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ درکف شیر زخوں خوارہ

اور یوں کہتے ہیں

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من
یہ حشو یہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے شیر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے انبیاء کو ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کے زابدال حق آگاہ شد
گفتہ اینک مابشر ایشان بشر مادایشاں بستہ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشان از عمی درمیاں فرقی بود بے منتہا
کار پا کاں را قیاس از خود مکیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
ایک شخص نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے

شیر آں باشد کہ آں رام آدمی خورد شیر آں باشد کہ آدمی رامی خورد
آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے ٹکنا چاہے گا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا
نشو و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دو ستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عاشق کی یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش نبوید خلاص از کند
اور یہ حالت ہے کہ

خوشا وقت شورید گاں غمش اگر تلخ بیند و گرم ہمش
گدایا نے از پادشائی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بیند دم درکشند
اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے حقیقت مصیبت

تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔

ما اصابکم من مصیبة پر شبہ کا جواب

مصیبت کی دو قسمیں ہیں ایک صورت مصیبت ایک حقیقت مصیبت۔ اس سے ایک سوال کا جواب حاصل ہو جائے گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا۔ بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے۔ فاصابتکم مصیبة الموت۔ نیز غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آیا تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا؟ جس کی وجہ سے ان پر یہ مصائب نازل ہوئے۔ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں حشویہ (ایک باطل فرقہ) نے انبیاء کی قدر نہیں کی وہ ان کو معصوم نہیں مانتے میں کہتا ہوں حشویہ کا قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہد کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا کہ ان کو تو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی۔ پس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہوا ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ غایت انقیاد و تقویٰ سے یوں کہتے تھے۔

اے حریفان راہ ہار ابستہ یار آہوئے لکیم واد شیر شکار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ درکف شیر زخوں خوارہ
(اے حریفوں یار نے راستہ بند کر رکھا ہے۔ ہم لنگڑے ہرن ہیں اور وہ شکاری شیر ہے۔ بجز تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں ایسے شخص کے لئے جو خونخوار شیر کے ہاتھ میں ہے ۱۲)

اور یوں کہتے ہیں

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من
ناگواری بھی مجھ کو اپنے لئے گوارا ہے۔ اس لئے کہ میرا دل اپنے محبوب پر فدا ہو چکا ہے۔

یہ حشو یہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے شیر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے اور ان کے مصائب میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے اس قیاس فاسد نے ہی مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیونکہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنا جیسا سمجھا مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفتہ ایک مابشر ایثاں بشر ماؤ ایثاں بستنہ خوانیم و خور
ایں ندانستند ایثاں از عی درمیان فرقی بود بے منتہا
کارپاکاں را قیاس از خود مکیر گرچہ ماند درنوشتن شیر و شیر
(ہر عالم اس سبب سے گمراہ ہو گیا۔ بہت کم کوئی ابدال سے واقف ہو سکا۔ کہا اس نے کہ یہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔ یہ اور ہم سب نیند اور کھانے کے محتاج ہیں۔ یہ نہ جانا انہوں نے بے وقوفی سے کہ آپس میں بے انتہا فرق ہے۔ پاک لوگوں کے کام کو خود پر قیاس پر مت کر۔ اگرچہ مانند ہیں لکھنے میں شیر و شیر) ایک شخص نے اس پر یہ اصناف کیا ہے

شیر آں باشد کہ آدم می خورد شیر آں باشد کہ آدم می خورد
(شیر وہ ہے کہ جو آدمی کو کھاتا ہے۔ شیر وہ ہے کہ جس کو آدمی پیتا ہے)

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کے بغل میں دبانا گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا۔ بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کہ وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
(نہ ہو دشمن کا نصیب کہ تیری تلوار سے ہلاک ہوئے۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ کے عاشق ہی چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش بخوید خلاص از کمند
(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا۔ اس کا شکار جال سے خلاصی تلاش نہیں کرتا)

اور یہ حالت ہے کہ

خوشا وقت شوریدگاں غمش اگر تلخ بیند و گر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

دامد شراب الم درکشند وگر تلخ بیند دم در کشند
(کیا ہی اچھا وقت ہے اس کے غم کے شوریدہ حالوں کا۔ خواہ تلخ دیکھتے ہیں اور خواہ اس کا مرہم۔ ایسے
گدا ہیں جو بادشاہی سے نفرت کرنے والے ہیں۔ اس کی امید کے ساتھ گدائی میں صبر کرنے والے ہیں۔
پے بہ پے الم کی شراب پیتے ہیں۔ اگر تلخ دیکھتے ہیں دم کھینچ لیتے ہیں)
اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت
مصیبت تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی
ہے۔ (ماخوذ البدر)

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ

بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ①

ترجمہ: الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر)
کرتے ہیں ایسوں کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے۔

تفسیری نکات

حقوق العباد کی تاکید

اس آیت میں حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے گویا اس کے سابق و سباق کے لحاظ
سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق ہے۔

حق سبحانہ و تعالیٰ کی عجیب تعلیم

بیوی کی قدر کرنا چاہیے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کے معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ
ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں چونکہ آج کل
لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں
حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق۔
بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں عبارت النص
اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃ ابتداء ظلم کو بھی شامل ہے
خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں تعیم پر تنبیہ کر دی ہے

بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالتہ بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتداء ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہذا دلالتہ النص سے بھی یہ آیت ابتداء ظلم کو شامل ہے اس کے بعد فرماتے ہیں ویسغون فی الارض اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں یہ اس لئے بڑھایا کہ بتلادیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تا کد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے یسغون میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے لہذا اس کا علاج بھی ضرور ہوا آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اس کا علاج بتلایا ہے حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلادیا ہے پس وہ شان ہے کہ

درد از یار است و در ماں نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(مرض بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی)

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹنے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف زائل ہو گئی اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو ذرا سوچو تو کہ تمہاری اصل کیا ہے یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدم اور چلتے پھرتے ہگتے موتے ہیں یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بن کر رہنا چاہیے ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے منها خلقنا کم و فیہا نعید کم و منها نخرجکم تارۃ اخری (اس سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو پھر لوٹائیں گے اور اسی میں سے دوبارہ تم کو نکالیں گے) اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے سارا بدن گل سڑ جائے گا پھر کس بات پر تکبر کرتے ہوئے واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیے اسی کو سعدیؒ نے کہا ہے

ز خاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(خداوند تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا پس اے بندہ مثل خاک فروتنی کر)

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ آسمان پر چڑھے جاتے ہیں صاحب یہ سارا ناز اس وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا
الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ
عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

ترجمہ: (اور اسی طرح جیسا کہ اوپر بشر کے ساتھ ہم کلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) ہم نے آپ کے پاس بھی وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (چنانچہ اس سے پہلے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور نہ (مفصلات) یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعہ سے (بواسطہ آپ کے) ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ (اس قرآن وحی کے ذریعہ) ایک سیدھے راستے کی ہدایت کر رہے ہیں (من بیان القرآن ملخصاً)

تفسیری نکات

فطرت سلیمہ کا تقاضا

سو یہاں حق تعالیٰ نے ما کنت تدری فرمایا ہے جس کا ترجمہ بے خبری اور ناواقفی ہی سے کیا جاتا ہے یعنی معنی ہیں ووجدک ضالاً کے مگر ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ضالایا گمراہ کا استعمال کس کس معنی میں آتا ہے اس لئے ان کو وحشت نہیں ہو سکتی اور جاہل کے ذہن میں تو گمراہ کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے اس کو خلجان پیش آئے گا اس لئے ایسے لوگوں کو ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔

اب میں استطراداً ایک اشکال کا اور جواب دینا چاہتا ہوں جو دوسری آیت ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان پر واقع ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کو کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا چیز ہے جس سے بظاہر ایمان کی نفی ہوتی ہے سو سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا جس میں آپ کو ایمان حاصل نہ تھا ہرگز نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو نفس ایمان ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے جس سے مراد صانع عالم کا اعتقاد اور توحید کا قائل ہونا

ہے کہ اس سے کوئی نبی کسی وقت بھی خالی نہیں ہو سکتا وجود صانع اور تو حید صانع کا علم فی نفسہ فطری ہے اگر ایک بچہ کو الگ مکان پر پرورش کیا جائے جہاں اس کے سامنے کسی مذہب کا تذکرہ اثباتاً یا نفیاً نہ کیا جائے پھر جب وہ بلوغ کو پہنچ جائے اس وقت اس سے جنگل میں کھڑا کر کے پوچھا جائے کہ آسمان و زمین کس طرح پیدا ہوئے تو وہ ضرور کہے گا کہ ان کا بنانے والا ضرور کوئی ہے اور وہ واحد ہے فطرت سلیمہ وجود و تو حید صانع کا انکار نہیں کر سکتی اور انبیاء علیہم السلام کی فطرت سب سے زیادہ سلیم ہوتی ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ تو حید کے قائل نہ ہوں۔ یہ علم ان کے لئے ضروریات سے ہے۔ استدلال کی بھی حاجت نہیں الا للتعقوبۃ۔ پس ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان کا یہ مطلب نہیں کہ کسی وقت کو ایمان حاصل نہ تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ایمان کو جانتے نہ تھے اور عدم درایت عدم وجود کو مستلزم نہیں کیونکہ بعض دفعہ ایک آدمی کے پاس کوئی چیز موجود ہوتی ہے مگر اس کو خبر نہیں ہوتی کہ میرے پاس یہ چیز موجود ہے۔

مثلاً ایک ناواقف کے ہاتھ کہیں سے یا قوت یا زمر کا ٹکڑا لگ جائے تو اس وقت یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کے پاس یا قوت و زمر نہیں۔ اسی طرح سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا کوئی وقت نہیں گزرا جس میں آپ ایمان سے شرف نہ ہوں لیکن نبوت سے پہلے آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ ایمان اسی کیفیت کا نام ہے جو میرے اندر موجود ہے جیسے احکام ناسوتیہ میں حکماء اس کے قائل ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس میں عقل و شعور وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس وقت مرتبہ استعداد میں یہ امور ہوتے ہیں اس وقت بچہ کو خود یہ خبر نہیں ہوتی کہ میرے اندر کیا کیا جواہرات ہیں پھر بالغ ہونے کے بعد اس کی عقل وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ ہاں میرے اندر عقل و فہم موجود ہے۔

ایمان اور نبوت

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان سے پہلے بھی حاصل تھا۔ آپ کے اندر اور کمالات کا مادہ بھی سب موجود تھا۔ آپ ابتداء ہی سے معرفت و انوار کے جامع تھے مگر آپ کو اس کی خبر نہ تھی بعد نبوت کے حق تعالیٰ نے ان کمالات سے واقف کر دیا تب معلوم ہوا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی دولت دے رکھی ہے اور اب خبر ہوئی کہ جو کیفیت میرے اندر ابتداء سے موجود ہے اسی کا نام ایمان و معرفت وغیرہ وغیرہ ہے۔ خوب سمجھ لو کہ ماتدری سے خبر کی نفی ہوتی ہے حصول کی نفی نہیں اور یہ بے خبری کچھ نقص نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت و عنایت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ پہلے آپ بے خبر تھے پھر دفعۃً علوم کا دریا بہا دیا۔ اگر آپ پہلے سے باخبر ہوتے پھر وحی نازل ہوتی تو آپ کو حق تعالیٰ کی محبت و عنایت کا کیا پتہ چلتا اس صورت میں محبت حق کی کوئی دلیل نمایاں طور پر نہ ہوتی اور جب پہلے آپ بے خبر تھے پھر دفعۃً تمام عالم سے زیادہ علوم آپ کو عطا کر دیئے گئے۔ اب آپ کے پاس عنایت و محبت حق کی نمایاں دلیل ہو گئی کہ واقعی حق تعالیٰ مجھے بہت ہی چاہتے ہیں۔

رسالة وجيزة و مفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت مكيم الأمت محمد الملت جامع الكمالات منبع الحسنات ماهر العلوم القرآنية، واقف الأسرار الفرقانية،
رأس المفسرين مقدم الراسخين صاحب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة والحققة كاشف الأسرار الغفي منها والجلي اعنى به

مولانا محمد اشرف على التهانوى

نور الله مرقده وجعل الجنة مثواه

سورة الكهف

قيما لينذر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر انه انزل على عبده هذا الكتاب الموصوف بهذا الصفات المذكورة اردفع بيان مالا جله انزله فلعلك باخع الخ الغرض تساوية لرسول صلى الله عليه وسلم انا جعلنا ما على الارض الى قوله صعيدا جرزا اقال ابوسعود والمعنى لا تحزن بما غاينت من القوم تكذيب ما انزلنا عليك من الكتاب فانا قد جعلنا ما على الارض من متفاوتة الاشياء زينة لها لنختبر اعمالهم فتجازيهم بحسبها وانا لمفنون جميع الناس عن قريب و مجاورة لهم بحسب اعمالهم قال المسكين خلاصة الكلام ان الدنيا دار الابتلاء لادار الجزاء فلا يحزنك تمتعهم ههنا فانما يجازون ولا بد في دار الجزاء ام حسبت ان الخ قال المسكين لما لا بين الله تعالى في الايات المتقدمة انزال الكتاب عليه صلى الله عليه وسلم الدال على نبوته وقد اراد اليهود امتحان نبوته بالسؤال عن امور منها قصة اصحاب الكهف حكاهما الله تعالى ليستدل بها على دعوى النبوة و اما حكمته بدأها بهذا العنوان العجيب فتقرير على ما في الكبير و يظهر به ايضا وجه ارتباط عنوان هذه الاية بعنوان الاية المتقدمة هكذا اعلم ان القوم تعجبوا من قصة اصحاب الكهف وسألو عنها رسول على سبيل الاستحاذ فقال تعالى ام حسبت انهم كانوا عجا من اياتنا فقد فلا تحسبن ذلك فان اياتنا كلها عجب فان من كان قادر اعلى تخليق السموات والارض ثم يزين الارض بانواع المعادون والنبات والحيوان ثم يجعلها بعد ذلك صعيدا جرزا خاليتها عن الكل كيف يستبعدون من قدرته وحفظه و رحمته حفظ طائفة مدة ثلثمائه سنة واكثر في النوم واتل ما اوحى الخ قال المسكين عود الى مضمون قول انزل على عبده الكتاب وقوله لينذر بآء ساشديد امن لدنه و يبشر المؤمنين الخ فذكر الله تعالى ههنا اداب التبليغ من التسوية بين المخاطبين الاغنياء منهم والفقراء وعدم الالتفات الى الدنيا لفناءها وعدم

١ ختم السورة المتقدمة بالتكبير والفتح هذه بالتحميد وتعانقهما ظاهرا

المبالاة بعدم ايمانهم لكون النار جزاء و فاقالهم وما يقارب ذلك من المضامين كما فى
الكبير اعلم ان من هذه الاية الى قصة موسى والخضر كلام واحد من قصة واحدة و ذلك
ان اكابر كفار قريش احتجوا و قالو الرسول الله صلى الله عليه وسلم ان اردنت ان تؤمن
بك فاطر دمن عندك هؤلاء الفقراء الذين آمنوا بك والله تعالى نهاه عن ذلك ومنعه
عنه و اطلب فى جملة هذه الايات و قل الحق من ربكم الخ لما امر رسوله بان لا يلتفت الى
اولئك الاغنياء قال و قل الحق اى قل نهؤلاء ان هذا الدين الحق انما اتى من عند الله
فان قبلتموه عاد النفع اليكم و ان لم تقبلوا عاد الضرر اليكم ان الذين آمنوا الخ اعلم نه
تعالى لما ذكر وعيد المبطلين اردفعه بوعده المحققين و اضرب لهم مثلا الخ اعلم ان المقصود
من هذا ان الكفار افتخروا باموالهم و انصارهم على فقراء المسلمين فبين الله تعالى ان
ذلك لا يوجب الافتخار لاحتمال ان يصير الفقير غنيا والغنى فقيرا اما الذى يجب حصول
المفاخرة به فطاعة الله و عبادته و عى حاصلة لفقراء المؤمنين و بين ذلك بضرب هذا
المثل المذكور فى الاية و اضرب لهم مثل الحياة الدنيا الخ اعلم ان المقصود اضرب
مثلا اخريدل على حقارة الدنيا و قلة بقاءها المال و البنون الخ لما بين تعالى ان الدنيا سريعة
الانقراض بين تعالى ان المال و البنين زينة الحياة الدنيا و يوم نسير الجبال الخ اعلم نه تعالى
لما بين خساسته الدنيا و شرف القيامة اردفه باحوال القيامة و اذ قلنا للملئكة الخ قال ابو السعود
و المراد بتذكر قصته تشديد النكير على المتكبرين المفتخرين بانسابهم و اموالهم المستكفين
عن الانتظام فى سلك فقراء المؤمنين ببيان ان ذلك من صنيع ابليس و انهم فى ذلك
تابعون لستويله كما ينبى عنه قوله تعالى افتخذونه و ذريته اولياء من دونى فتطيعونهم
بدل طاعتى ما شهدتهم الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لبيان عدم استحقاقهم للاتخاذ
المذكور و يوم يقول نا دو الخ قال المسكين هو بيان لعدم نفع ولاية الشياطين لهم و لقد
صرفنا فى هذا القرآن الخ قال المسكين بيان لكون الموعظة القرآنية فى الواقعة المذكورة
و غيرها بالغة و جدال الانسان فيها و تمادى كفره الى ان يقع به العذاب و الاشارة الى
قرب و وقوعه بهم فاضرابهم من اهل القرى و ذا قال موسى لفتاه الخ اعلم ان هذا ابتداء
قصة الثالثة ذكرها الله تعالى فى هذه السورة و هذا و ان كان كلاما مستقلا فى نفسه الا
انه يعين على ماهو المقصود اما نفع هذه القصة فى الرد على الكفار فهو ان موسى عليه
السلام مع كثرة علمه و عمله و علوا مصمير ذهب الى الخضر لطلب العلم و تواضع له و

ذلك يدل على ان التواضع خيس من التكبر و يستلونك عن ذى القرنين الخ ان اليهود
امروا المشركين ان يسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قصة اصحاب الكهف و
عن قصة ذى القرنين و عن الروح فالمراد من قوله و يستلونك عن ذى القرنين هو ذلك
السؤال قال المسكين و يمكن ان يجعل اشارة الى ان ذم المال والجاه الذى ذكر فيما
مر لبس على الاطلاق بل اذا جعله الانسان طاغيا باغيا و اما اذ شكر الله تعالى عليهما و
نفع بهما عبادة فهو من اعظم النعم كما كان لذى القرنين الذى جمع المال والعلم فحسب
الذين كفروا الخ اعلم نه تعالى لما بين من حال الكافرين انهم اعرضوا عن الذكر و عن
استماع ما جاء به الرسول اتبعه بقوله فحسب الخ والمراد فظنوا انهم ينتفعون بما عبده
مع اعراضهم عن تدبر الايات و تمردهم عن قبول امره و امر رسوله ان الذين امنوا الخ
اعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد اتبعه بالوعد و لما ذكر فى الكفار ان جهنم نزلهم اتبعه بذكر ما
يرغب فى الايمان والعمل الصالح قل لو كان الجرم اذا اعلم نه تعالى لما ذكر فى هذه
السورة انواع الدلائل والبيانات و شرح فيها اقا صيص الاولين نه على كمال حال القرآن
فقال قل لو كان البحر ممداد الخ قل انما انا بشر مثلكم الخ قال المسكين لما بين تعالى
فى الايتين المتقدمتين فضل الايمان والعمل الصالح و فضل القرآن العظيم ذكر ما يدل
على اثبات النبوة بالجواب عن طعن الكفار بالبشرية بان البشرية لاتنا فى النبوة بل مدار
النبوة على الوحي و قد يوحى الى و خصص من بين ما يوحى امر التوحيد لاهتمامه و لمنا
سبة المقام لان التوحيد والنبوة اصلان عظيمان للايمان ثم نه على ما لا بد من رعايته فى
الاعتدال دلالة من العمل الصالح و شرط قبوله من ترك الشرك الجلى والخفى الذى
هو الرياء فقال من كان يرجو لقاء ربه الخ

سورة مريم عليها السلام

اعلم ان الغرض من هذه السورة بيان التوحيد والنبوة والحشر والمنكرون للتوحيد هم الذين اثبتوا معبود سوى الله تعالى وهؤلاء فريقان منهم من اثبت معبودا غير الله حيا عاقلا وهم النصارى ومنهم من اثبت معبود غير الله جماد اليس يحى ولا عاقل ولا فاهم وهم عبدة الاوثان قال المسكين فى قصص هذه السورة اثبات للتوحيد كما ذكر من قصة عيسى عليه السلام وفيه رد للفريق الاول ومن وعظ ابراهيم عليه السلام وفيه رد للفريق الثانى واثبات للنبوة بوجهين احدهما ببيان نبوة الانبياء للدلالة على ان النبوة ليست بامر بدع فإى بعد فى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم وثانيها ان النبى صلى الله عليه وسلم لم يخالط العلماء ثم قص القصص على ما وقعت فهذه دلالة بينة على كونه مؤيد ابالوحي ثم بعد ذكر القصص ذكر المعاد مختلطا بالتوحيد كما يظهر من تلاوة تلك الايات اولئك الذين انعم الله عليهم الخ اعلم انه تعالى اثنى على كل واحد ممن تقدم ذكره من الانبياء بما يخصه من الثناء ثم جمعهم اخرا فقال اولئك الذين فخلف من بعدهم خلف الخ اعلم انه تعالى لما وصف هؤلاء الانبياء بصفات المدح ترغيبا لنا فى التأسى بطريقتهم ذكر بعدهم من هو بالضد منهم الامن تاب الخ قال المسكين هذا استثناء من المذكورين جنات عدن الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فى التائب انه يدخل الجنة وصف الجنة بامور وما ننزل الابامر ربك الخ قال المسكين هذا حكاية لقول جبرئيل عليه السلام ولعل وضعه ههنا لتقرير امر التوحيد والنبوة ببيان ان الملكة مامورون تحت امر الله تعالى فدل ذلك على كمال عظمة الله تعالى وانفراده بالامر كله و دل على ان الرسالة شأنها محض المامورية فلا يحتمل ان يقولوا ما لم يؤمروا فانتفت شكوك الشاكين فيها ويقول الانسان الخ قال

ما ختم السورة المقدمة باثبات نبوته عليه السلام بقوله قل انما انا بشر مثلكم و بين فى هذه السورة نبوة بعض الانبياء السابقين حصل المناسبة بينها منه عفى عنه

المسكين شرع من ههنا في اثبات المعاد واحواله واذا تتلے عليهم اياتنا الخ قال المسكين اخذا من ابی السعود حكاية لما قالوا عند سماع الايات الناعية عليهم فظاعة حالهم ووخامة مالهم ثم رد عليهم اغتراء هم بزخارف الدنيا بقوله وكم اهلكنا قبلهم من قرن الخ ثم بين حكمة امهالهم بقوله قل من كان في الضلالة الخ ثم ذكرمت غاية للمدو هذا هو المقصود وما سبق كان للتمهيد له في قوله مت حتى اذارأواما يوعدون الخ ويمكن ان يكون كما في الكبير جوابا عن شبهتهم في البعث باننا في سعة ههنا فكذا ثمه لو كان فرضا ويزيد الله الذين الخ قال ابوالسعود كلام مستانف سيق لبيان حال المهتدين اثر بيان حال الضالين افرايت الذي كفر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الدلائل اولا على صحت البعث ثم اورد شبهة المنكرين و اجاب عنها اورد عنهم الآن ما ذكروه على سبيل الاستهزاء طعنا في القول بالحشر واتخذوا من دون الله الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في مسألة الحشر والنشر تكلم الآن في الرد على عباد الاصنام وقالوا اتخذوا الرحمن الخ قال ابوا السعود حكاية لجناية اليهود والنصارى ومن يزعم من العرب ان الملكة بنات الله سبحانه و تعالى عن ذلك علوا كبيرا اثر حكاية عبدة الاصنام بطريق عطف القصة على القصة ان الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما رد على اصناف الكفرة وبالح في شرح احوالهم في الدنيا والاخرة ختم السورة بذكر احوال المؤمنين و انما يسرناه بلسانك الخ كلام مستانف بين به عظيم موقع هذه السورة لما فيها من التوحيد والنبوة والحشر والنشر والرد على فرق المضلين المبطلين وكم اهلكنا الخ قال ابوا السعود وعد لرسول الله صلى الله عليه وسلم في ضمن وعيد الكفرة بالا هلاك و حث له عليه الصلوة والسلام على الانذار

۱ من كونهم في طيب عيش في الدنيا و اجاب عنها بقوله وكم اهلكنا وبقوله قل من كان في الضلالة الخ منه

۲ تقرير امر التوحيد و ابطال الشرك و بيان خاتمة حالهم يوم المعاد بانهم يقون منفردين لاشفيع لهم

سورة طه

ما انزلنا عليك الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتسلية عليه الصلوة والسلام بما كان يعتره من جهة المشركين من التعب الاتذكرة الخ قال ابو السعود كانه قيل ما انزلنا عليك القرآن لتغيب في تبليغه ولكن تذكرة لمن يخشى تنزيلا ممن خلق الخ قال ابو السعود مصدر مؤكد لمضممر مستأنف مقرر لما قبله اى نزل تنزيلا الرحمن على العرش استوى قال ابو السعود فيه اشارة الى ان تنزيل القرآن ايضا من احكام رحمة تعالى يبنى عنه قوله تعالى الرحمن علم القرآن له ما فى السموات الخ قال ابو السعود بيان لسبعة سلطنة وشمول قدرته لجميع الكائنات و ان تجهر بالقول الخ قال ابو السعود بيان لاحاطة علمه تعالى بجميع الاشياء اثربيان سعة سلطنته وشمول قدرة لجميع الكائنات الله لا اله الا هو قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان ان ما ذكر من صفات الكمال موصوفها ذلك المعبود بالحق له الاسماء الحسنى قال ابو السعود بيان لكون ما ذكر من الخالق والرحمانية والمالكية والعالمية اسماء و صفاته من غير تعدو فى ذاته تعالى وهل اتك حديث موسى الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتقرير امر التوحيد الذى اليه انتهى مساق الحديث و بيان انه امر مستمر فيما بين الانبياء كابر اعن كابر و قد حو طب به موسى عليه السلام حيث قبل له اننى انا الله لا اله الا انا وبه ختم عليه الصلوة والسلام مقاله حيث قال انما الهكم الذى لا اله الا هو واما ما قيل من ان ذلك لترغيب النبى صلى الله عليه وسلم فى الائتساء بموسى عليه السلام فى تحمل اعباء النبوة والصبر على مقاساة الخطوب فى تبليغ احكام الرسالة فياباه ان مساق النظم الكريم لصرفه عليه الصلوة والسلام عن اقتحام المشاق

- ١ ختم السورة المقلعة بذكر نزول القرآن و تيسيره بلسان محمد صلى الله عليه وسلم وكذلك افتتح هذا السورة ببيان تنزيل القرآن و نفى العسرو المشقة عنه صلى الله عليه وسلم وهذا هو وجه التناسب بينهما ١٢ منه عفى عنه.
- ٢ فى الكبير انه تعالى عظم حال القرآن بان نسبه الى انه تنزيل ممن خلق الارض و خلق السموات على علوها و انما قال ذلك لان تعظيم الله تعالى يظهر بتعظيم خلقه و نعمة ١٢ منه عفى عنه

كذلك نقص الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما شرح قصة موسى عليه السلام اتبعه بقوله
كذلك نقص عليك من سائر اخبار الامم و احوالهم تكثير الشانك و زيادة فى معجزاتك
وليكثر الاعتبار و الاستبصار للمكلفين بها فى الدين قال المسكين ثم ذكر الكتاب المنطوى
على هذه القصص ثم عظم امره ببيان و عيد المعرض عنه و ذكر يوم الوعيد و احواله من
نفخ الصور و الحشر و نسف الجبال و غيرها ثم بين حال قسيم المعرض المؤمن بالقرآن
و العامل به فى قوله و قد اتيناك من لدنا ذكرا الى قوله فلا يخاف ظلما و لا هضما و كذلك
انزلناه قرآنا عربيا الخ اعلم ان قوله و كذلك عطف على قوله كذلك نقص اى و مثل
ذلك الانزال و على نهجه انزلنا القرآن كله فتعالى الله الملك الحق الخ قال ابو السعود
استعظام له تعالى و لشؤنه التى يصرف عليها عباده من الاوامر و لنواهي و الوعد و الوعيد و
غير ذلك و لاتعجل بالقرآن الخ قال ابو السعود نهى عن ذلك اثر ذكر الانزال بطريق
الاسطرا دوامرنا باستفاضة العلم و استزادته منه تعالى فقل و قل اى فى نفسك رب زدنى
علما اى سل الله عز وجل زيادة العلم فانه الموصل الى طلبتك دون الاستعجال و لقد عهدنا
الى ادم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لتقرير ماسبق من تصريح الوعيد فى
القرآن و بيان ان اساس بنى ادم على العسيان و عرقه ارسخ فى النسيان مع مافيه من انجاز
الموعود فى قوله تعالى كذلك نقص عليك من انباء ما قد سبق افلم يهدلهم الخ قال
ابو السعود كلام مستأنف مسوق التقرير ما قبله من قوله تعات و كذلك نخرى و لولا كلم
سبقت الخ قال ابو السعود كلام مستأنف سيق لبيان حكمت عدم وقوع ما يشعر به قوله
تعالى افلم يهدلهم الاية من ان يصيبهم مثل ما اصاب القرون المهلكة فاصبر على ما يقولون الخ
لما اخبرني به بانه لا يهلك احدا قبل استيفاء اجله امره بالصبر ثم قاله فسيح و هو نظير قوله
واستعينوا بالصبر و الصلوة لاتمدن عينيك الخ اعلم نه تعالى لما صبر رسوله عليه السلام
على ما يقولون و امره بان يعدل الى التسبيح اتبع ذلك نهيه عن مد عينيه الى ما منع به
القوم و أمر اهلك الخ قال ابو السعود امر عليه السلام بان يامر اهل بيته او التابعين له من
امته بعد ما امر هو بها ليتعا و نوا على الاستعانة على خصاصتهم و لايهتموا بامر المعيشة
ولا يلتفتوا الفت ارباب الثروة و قالوا لولا ياتينا الخ انه سبحانه بعد هذه الوصية حكى عنهم
شبهتهم فكانه من تمام قوله فاصبر على ما يقولون ثم بين انه تعالى ازاح لهم كن عذر و علتة
فى التكليف فقال و لو انا اهلكنا الخ ثم انه سبحانه ختم السورة بضرب من الوعيد فقال
قل كل متربص الخ

سورة الانبياء عليهم السلام

اقترب للناس الخ قال ابو السعود مناسبة هذه الفاتحة الكريمة لما قبلها من الخاتمة الشريفة غنية عن البيان ما يأتيهم من ذكر الخ قال المسكين هذا بيان لاعراضهم و غفلتهم بذر جنائياتهم المعتادة من لعبهم و لهوهم و جنائيتهم الخاصة من اسرار النجوى قال ربي يعلم الخ لما ورد هذا الكلام عقيب ما حكى عنهم و جب ان يكون كالجواب لما قالوه فكانه قال انكم وان اخفيتم قولكم و طعانكم فان ربي عالم بذلك و انه من وراء عقوبته فتوعدوا بذلك لكيلا يعودوا الى مثله بل قالوا اضغات احلام الخ انه تعالى عاد الى حكايته قوله المتصل بقوله هل هذا الالبشر الخ ثم ان الله تعالى بدأ بالجواب عن هذه السؤال الاخير بقوله ما امنت والمعنى انهم في العتوا شد من الذين اقترحوا على انبيائهم الايات و عهدو انهم يؤمنون عندها فلما جاء تهم نكثوا و خالفوا فاهلكهم الله فلو اعطينا هم ما يقترحون لكانوا اشد نكثا و ما ارسلنا قبلك الخ قال ابو السعود جواب لقولهم هل هذا الالبشر الخ متضمن لرد ماد سوا تحت قولهم كما ارسل الاولون من التعرض بعدم كونه عليه السلام مثل اولئك الرسل صلوات الله عليهم اجمعين ثم صدقناهم الوعد الخ قال المسكين متمم لحكايته الرسل لتسلية رسول الله صلى الله عليه وسلم و تهديد المنكرين لقد انزلنا اليكم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لتحقيق حقيقة القرآن العظيم الذي ذكر في صدر السورة الكريمة اعراض الناس عما يأتيهم من آياته و الاستهزاء هم به و تسميتهم تارة سحرا و تارة اضغات احلام و اخرى مفترى و شعرا و بيان علور تبتة اثر تحقيق رسالته صلى الله عليه وسلم ببيان انه كسائر الرسل عليهم الصلوة والسلام و كم قصمنا من الخ قال ابو السعود نوع تفصيل لاجمال قوله تعالى و اهلكنا المسرفين و بيان نكفته اهلكهم و سببه و تنبيه على كثرتهم و ما خلقنا السماء و الارض الخ قال المسكين لمانعي الله تعالى على الكفار الموجودين و الماضين شناعة حالهم في الاعراض و اللهو و الظلم بين ان الانسان لم يخلق عبثا و لم يترك سدئى ببيان القول الكللى في ذلك لانه

١ ختم التي تقدمت و افتتح هذه بذكر الوعيد بالتربص و الحساب فالمناسبة جلية غير خفية لامنه عفى عنه

يلزم منه الهو واللعب فى جنبه تعالى عن ذلك علوا كبيرا بل مقتضى حكمته ان يميز بين الحق والباطل وان ذلك مما يقتضى ارسال الرسل الذين منهم محمد صلى الله عليه وسلم الذى ينكرون نبوته و يصفونه بما لا يليق به عليه السلام و يستحقون به الويل ثم اكد كون العباد مكلفين بقوله وله من فى السموات والارض الخ فحصل هذا الكلام تقرير لامر النبوة ام اتخذوا الهة من الارض الخ اعلم ان الكلام من اول السورة الى ههنا كان فى النبوات وما يتصل بها من الكلام سوآلا و جوابا واما هذه الايات فانها فى بيان التوحيد و نفى الاضداد و الانداد و ما جعلنا لبشر من قبلك الخ قال المسكين جواب عن شماتتهم بموته عليه السلام و تمهيد لبيان المعاد المذكور فى قوله و الينا لا ترجعون المقصود فشرع من ههنا فى اثباته بعد النبوة و التوحيد الى قوله و كفى بنا حاسبين و ذكر فى تضاعيفه استهزاء هم بالرسول المحبر عن المعاد و استعجالهم بالعذاب و مال المستهزئين و كلاءة الله تعالى لهم فى الدنيا عن العذاب و ضعف الهتهم عنها و عدم اغترارهم بالتمتع الدنيوى و وقوع ما يدفع نزول العذاب بهم من نقص الاطراف و يتقن و وقوع العذاب لآتيان الوحي به وان لم لسمع الصم و غير ذلك مما يناسب المعاد و لقد اتينا موسى و هارون الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما تكلم فى دلائل التوحيد و النبوة و المعاد شرع فى قصص الانبياء عليهم السلام و فيه كما قال ابو السعود نوع تفصيل لما اجمل فى قوله تعالى و ما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحى اليهم الى قوله تعالى و اهلكنا المسرفين و اشارة الى كيفية انجائهم و اهلك اعدائهم ان هذه امتكم امة واحدة الخ قال المسكين كانها نتيجة القصص اى ملة التوحيد الذى اجمع عليه الانبياء عليهم السلام ملة واحدة ثم افسده هؤلاء بالتفريق المذكور فى قوله و تقطعوا امرهم ثم ذكر امر المعاد بقوله كل الينا راجعون الى قوله و عدا علينا انا كنا فاعلين او الى قوله الصالحون ان فسر الارض بارض الجنة و ان فسرت بارض الدنيا كان مناسبة هذه الاية الاخيرة بما قبلها ان الاعمال الصالحة موجبة للاعزاز فى الدارين اما فى دار الآخرة فذكر اولا واما فى دار الدنيا فذكر فى هذه الاية ثم اثنى على السورة الكريمة المشتملة على التوحيد و النبوة و المعاد بقوله ان فى هذا لبلاغا لقوم عابدين ثم على الرسول الاتى بهذا الكتاب بقوله و ما ارسلناك الا رحمة للعالمين قل انما يوحى الى الخ اعلم انه تعالى لما اورد على الكفار الحجج فى ان لا اله سواه من الوجوه التى تقدم ذكرها و بين انه ارسل رسوله رحمة للعالمين اتبع ذلك بما يكون اعذارا و انذارا فى مجاهدتهم و الاقدام عليهم

سورة الحج

يا ايها الناس اتقوا الخ امرا الناس بالتقوى ثم علل وجوبها عليهم بذكر الساعة ووصفها باهول صفة و من الناس من يجادل الخ قال ابو السعود كلام مبتدأ جنى به اثر بيان عظم شأن الساعة المنبئة عن البعث بيانا لحال بعض المنكرين لها يا ايها الناس ان كنتم الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما حكى عنهم الجدل بغير العلم فى اثبات الحشر والنشر و ذمهم عليه فهو سبحانه اورد الدلالة على صحة ذلك من وجهين احدهما الاستدلال بخلقه الحيوان اولاً الوجه الثانى الاستدلال بحال خلقته النبات على ذلك و من الناس من يجادل فى الله بغير علم ولا هدى الخ قال ابو مسلم الاية الاولى واردة فى الاتباع المقلدين وهذه الاية واردة فى المتبوعين المقلدين قال المسكين والقرينة عليه قوله تعالى ههنا ليضل عن سبيل الله فان الاضلال من شأن المتبوع و من الناس من يعبد الله الخ اعلم انه تعالى لمابين حال المظهرين للشرك المجادلين فيه عقبه بذكر المنافقين ان الله يدخل الخ اعلم انه سبحانه لمابين فى الاية السابقة حال عبادة المنافقين و حال معبودهم بين فى هذه الاية صفة عبادة المؤمنين و صفة معبودهم من كان يظن ان لن ينصره الله الخ. قال المسكين بيان لنصرة المعبود الحق لاولياءه مقابلة لقوله فى الالهة الباطلة ما لا يضره وما لا ينفعه ان الذين امنوا والذين هادوا الخ قال المسكين بيان لمال كل فريق اثر تقسيم الناس الى طرائق الم تر ان الله يسجد له الخ قال ابو السعود بيان لما يوجب الفصل المذكور من اعمال الفرق المذكورة مع الاشارة الى كيفيته و كونه بطريق التعذيب والاثابة والاكرام والاهانة ان الذين كفروا ويصدون الخ اعلم انه تعالى بعد ان فصل بين الكفار والمؤمنين ذكر عظم حرمة البيت و عظم كفر هؤلاء ان الله يدافع الخ اعلم انه تعالى لمابين ما يلزم فى الحج ومناسكها وما فيه من منافع الدنيا والاخرة وقد ذكر ان الكفار صدوهم اتبع ذلك ببيان

ا كانت السورة المتقدمة مفتحة وهذه مفتحة بالانذار فالارتباط ظاهر ۱۲ منه عفى عنه

مايزيل الصد و يؤمن معه التمكن من الحج و ان يكذبوك الخ قال ابو السعود تسليمة
لرسول الله صلى الله عليه وسلم متضمنة للوعد الكريم باهلاك من يعاديه من الكفرة و
تعيين كيفية نصره تعالى له الموعد بقوله تعالى 'ولينصرن الله من ينصره ويستعجلونك
بالعذاب الخ قال المسكين لما تضمنت الآية الاولى و عيد العذاب لهم استعجابوا به فاجابهم
الله تعالى قل يا ايها الناس الخ قال المسكين هذا بيان لعدم مدخلية عليه السلام في العذاب
وانما شانه الانذار فقط ثم بين حال الفريقين في قوله فالذين امنوا وعملوا الصالحات الخ
وما رسلنا من قبلك الخ قال المسكين لما بين الله تعالى سعي الكفار في ابطال الايات
وكيلهم فيما قبل ذكر في هذه الآية كيد الشياطين فيه وما نسخه الله تعالى والذين هاجروا الخ
اعلم انه تعالى لما ذكر ان الملك له يوم القيامة وانه يحكم بينهم ويدخل المؤمنين الجنات
اتبعه بذكر وعده الكريم للمهاجرين ذلك و من عاقب بمثل ما عوقب به الخ قال المسكين
ذكر فيما قبل كون المهاجر مقتولا والان ذكر حكم كونه قاتلا وجارحا و وعده بالنصر
ثم ذكر اقدرته على النصر بقوله ذلك بان الله يولج الليل الخ ثم ذكر اختصاصه بالقدره
بقوله ذلك بان الله هو الحق الخ الم تر ان الله انزل الخ اعلم انه تعالى لمادل على قدرته
من قبل بما ذكره من ولوج الليل في النهار وبنه به على نعمه اتبعه بانواع اخر من الدلائل
على قدرته ونعمته لكل امة جعلنا الخ قال ابو السعود كلام مستأنف جئ به لجرم صريه
عليه السلام من اهل الاديان اسماوية عن منازعته عليه السلام ببيان حال ما تمسكوا به من
الشرائع و اظهار خطأهم في النظر قال المسكين فكانه قسيم لقوله في صدر السورة و من
الناس من يجادل في الله بغير علم فكانت تلك المجادلة بغير علم و هذه بعلم لكن مع
الخطأ و يعبدون من دون الله الخ قال ابو السعود حكاية لبعض اباطيل المشركين و احوالهم
الدالة على كمال سخافته عقولهم و ركائزهم من بناء امر دينهم على غير مبنى من
دليل سمعي او عقلي واعراضهم عما القى عليهم من سلطان بين هو اساس الدين و قاعدته
اشد اعراض الله يصطفى من الملكة الخ اعلم انه سبحانه لما قدم ما يتعلق بالالهيات
ذكر ههنا ما يتعلق بالنبوات يا ايها الذين امنوا ار كعو الخ اعلم انه سبحانه لما تكلم في الالهيات
ثم في النبوات اتبعه بالكلام في الشرائع.

سورة المؤمنون

ولقد خلقنا الانسان الخ اعلم انه سبحانه لما امر بالعبادات فى الآية المتقدمة والاشتغال بعبادة الله تعالى لا يصح الا بعد معرفة الاله الخالق لاجرم عقبها بذكر ما يدل على وجوده واتصافه بصفات الجلال والوحدانية فذكر من الدلائل انواعا النوع الاول الاستدلال بتقلب الانسان فى ادوار الخلقة و اكران الفطرة وهو قوله تعالى 'ولقد خلقنا الانسان النوع الثانى من الدلائل الاستدلال بخلقة السموات وهو قوله تعالى 'ولقد خلقنا فوقكم الخ النوع الثالث الاستدلال بنزول الامطار و كيفية تأثيراتها فى النبات قوله تعالى 'وانزلنا من السماء ماء الخ النوع الرابع الاستدلال باحوال الحيوانات قوله تعالى 'وان لكم فى الانعام الخ واعلم انه سبحانه و تعالى لما بين دلائل التوحيد اردفها بالقصص كما هو العادة فى سائر السور القصة الاولى قصة نوح عليه السلام قوله تعالى 'ولقد ارسلنا نوحا الخ قال ابو السعود شروع فى بيان اهمال الامم السالفة و تركهم النظر والاستدلال فيما عد من النعم الفاتنة للحصر وعدم تذكرهم بتذكير رسلهم وما حاق بهم لذلك من فنون العذاب تحذير للمخاطبين قال صاحب الكبير القصة الثانية قصة هود او صالح عليهما السلام قوله تعالى 'ثم انشأنا من بعدهم قرنا آخرين القصة الثالثة قوله تعالى 'ثم انشأنا من بعدهم قرونا آخرين الخ اعلم انه سبحانه و تعالى يقص القصص فى القرآن تارة على سبيل التفصيل كما تقدم واخرى على سبيل الاجمال كهنا و قيل المراد قصة لوط و شعيب و ايوب و يوسف عليهم السلام القصة الرابعة قصة موسى عليه السلام قوله تعالى 'ثم ارسلنا موسى الخ القصة الخامسة قصة عيسى و مريم عليهما السلام قوله تعالى 'وجعلنا ابن مريم الخ يايتها الرسل الخ قال المسكين لما امر الله تعالى بالعبادة فى صدر السورة ثم ذكر الايات الدالة على القدرة والنعم وايدنها

۱- كان فى خاتمة السورة الاولى ذكر الشرائع من الامر بالركوع والسجود والمجاهدة فى الله وكذا فى اول

هذه السورة فارتبطت ۱۲ منه عفى عنه

بيان القصص بين ههنا ان الامر بالعبادة وافاضة النعم و ترتب العبادة عليها شرع قديم
امر به جمعى الرسل و ان هذه امتكم امة واحدة الخ المعنى انه كما تجب اتفاقهم على
اكل الحلال والاعمال الصالحة فكذلك هم متفقون على التوحيد و على التقاء من معصية
الله تعالى فتقطعوا امرهم الخ قال ابو السعود حكاية لما ظهر من امم الرسل بعدهم من مخالفة
الامر وشق العصا ان الذين هم من خشية ربهم الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لبيان
من له المسارعة فى الخيرات اثر اقنط الكفار عنها وابطال حسابانهم الكاذب لانكلف
نفسا الاوسعها الخ قال ابو السعود جملة مستأنفة سيقى للتحريض على ما وصف به السابقون
من فعل الطاعات المؤدى الى نيل الخيرات ببيان سهولته و قوله تعالى ولدينا كتاب الخ
تتمة لما قبله ببيان احوال ما كلفوه من الاعمال واحكامها المترتبة عليها من الحساب
والثواب والعقاب بل قلوبهم فى غمرة الخ قال المسكين تمهيد لبيان مؤاخضة الكفار
المذكور فى قوله تعالى حتى اذا اخذنا مترفيهم بالعذاب اثر ذكر اعمالهم مع بيان عدم
النصرة لهم قد كانت اياتى تتلى عليكم الخ اعلم انه سبحانه لما بين فيما قبل انه لا ينصرا ولئلك
الكفار اتبعه بعلته ذلك ثم انه سبحانه لما وصف حالهم رد عليهم بان بين ان اقدامهم على
هذه الامور لا بدوان يكون لاحد امورا ربعة احدها ان لا يتأملوا فى دليل نبوة وهو المراد
من قوله افلم يدبر والقول وثانيها ان يعتقدوا ان مجى الرسل امر على خلاف العادة وهو
المراد من قوله ام جاءهم مالم يأت وثالثها ان لا يكونوا عالمين بديانته و حسن خصاله قبل
ادعائه للنبوة وهو المراد من قوله ام لم يعرفوا رسولهم ورابعها ان يعتقدوا فيه الجنون وهو
المراد من قوله ام تقولون به جنة ثم انه سبحانه بعد ان عده هذه الوجوه ونبه على فسادها
قال بل جاءهم الخ ولواتبع الحق قال ابو السعود استئناف مسوق لبيان ان اهواءهم الزائغة
التى ما كرهوا الحق لالعدم موافقته اياها مقتضية لطامة بل اتيناهم بذكرهم الخ قال ابو السعود
انتقال من تشنيعهم بكراهة الحق الذى به يقول العالم الى تشنيعهم بالاعراض عما جبل
عليه كل نفس من الرغبة فيما فيه خير ما فى الكبير ثم بين سبحانه انه عليه السلام لا يطمع
فيهم حتى يكون ذلك سببا للنفرة فقال ام تسئلهم خرجا قوله وانك لتدعوهم الخ اعلم
انه سبحانه و تعالى لما زيف طريقة القوم اتبعه ببيان صحة ما جاء به الرسول صلى الله عليه
وسلم قال المسكين ثم بين عدولهم عن الصراط المستقيم و علة عدولهم عنه بقوله تعالى

وان الذین لایؤمنون الخ ثم بین شدة عنادهم ولجاجة بقوله ولورحنائهم وكشفنا ما بهم الخ ولقد اخذنا هم بالعذاب الخ قال ابو السعد استیناف و مسوق للاستشهاد علی مضمون الشرطیة قال المسکین ثم بین الستکانتهم اذا عاینو عذابا لآخره بقوله حتی اذا فتحنا علیهم الخ وهو الذی انشالکم السمع الخ قال المسکین عود الی باب التوحید والانعام اثر بیان ما یتعلق بالنبوة بل قالو امثل ما قال الاولون الخ اعلم انه سبحانه لما اوضح القول فی دلائل التوحید عقبه بذكر المعاد قل لمن الارض الخ اعلم انه یمکن ان یمکن المقصود من هذه الایات الرد علی منکرى الاعادة وان یمکن المقصود الرد علی عبدة الاوثان ما اتخذ الله من ولد الخ قال المسکین ظاهره اثبات التوحید وفيه اشارة الی اختصاصه بالقدرة علی البعث و عدم قدرة احد علی معارضة تعالی فیہ قل رب اماترینى الخ قال ابو السعد اید ان بکمال فظاعة ما وعدوه من العذاب و کونه بحیث یمکن ان یمکن منه من لا یکاد یمکن ان یمکن به ورد لانکاره اياه واستعجالهم به علی طريقة الاستهزاء به قال المسکین ثم امره علیه السلام بما یمعامل به الکفار فی انکارهم واستهزاء هم بقوله ادفع بالتی هی احسن و قل رب اعوذ بک الخ اعلم انه سبحانه لما ادب رسوله علیه السلام بقوله ادفع بالتی هی احسن اتبعه بما یقوی علی ذلك حتی اذا جاء احدهم الموت الخ قال المسکین تتمیم لذكر المعاد و وقته واحواله وما یقع فیہ الی اخر السورة و من یدع مع الله الخ اعلم انه سبحانه لما بین انه هو الملك الحق لا اله الا هو اتبع بان من ادعی الها اخر فقد ادعی باطلا من حیث لا برهان لهم فبه قال ابو السعد بدأت السورة الکریمة بتقریر فلاح المؤمنین و ختمت بنفی الفلاح عن الکافرين ثم امر رسول الله صلی الله علیه وسلم بالاستغفار والاسترحام فقل و قل رب اغفر الخ ایدانا بانهما من اهم الامور الدینیة حیث امر به من قد غفر له ماتقدم من ذنبه ومات آخر فکیف بمن عداه.

سُورَةُ النُّورِ

سورة انزلناها الخ اعلم انه سبحانه ذكر في هذه السورة احكاما كثيرة الحكم الاول قوله تعالى الزانية والزاني فاجلدوا الخ الحكم الثاني قوله تعالى الزاني لا ينكح الزانية الخ الحكم الثالث القذف قوله تعالى والذين يرمون المحصنات الخ الحكم الرابع حكم اللعان قوله تعالى والذين يرمون ازواجهم الخ الحكم الخامس قصة الافك قوله تعالى ان الذين جاؤا بالافك الخ الحكم السادس في الاستيذان قوله تعالى يا ايها الذين امنوا لا تدخلوا الخ الحكم السابع حكم النظر قوله تعالى قل للمؤمنين الخ الحكم الثامن ما يتعلق بالنكاح قوله تعالى وانكحوا الايامي منكم الخ الحكم التاسع في الكتابة قوله تعالى والذين يبتغون الكتاب الخ الحكم العاشر الاكراه على الزنا قوله تعالى ولا تكرر هو افتياتكم الخ قوله تعالى ولقد انزلنا اليكم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف جئ به في تضاعيف ماورد من الايات السابقة واللاحقة لبيان جلالة شأنها المستوجبة للاقبال الكلى على العمل بمضمونها الله نور السموات الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لتقرير ما فيها من البيان مع الاشعار بكونه في غاية الكمال في بيوت اذن الله الخ قال ابو السعود لما ذكر شان القرآن الكريم في بيانه للشرائع والاحكام ومبايها وغاياتها المرتببة عليها من الثواب والعقاب وغير ذلك من الاحوال الآخرة واهوالها واشير الى كونه في غاية مايكون من التوضيح والاظهار حيث مثل بما فصل من نور المشكوة واشير الى ان ذلك النور مع كونه في اقصى مراتب الظهور انما يهتدى بهداه من تعلقت مشية الله تعالى بهدايته دون من عذاه عقب ذلك بذكر الفريقين و تصوير بعض اعمالهم المعربة عن كيفية حالهم في الاهداء وعلمه الم تر ان الله يسبح له الخ

۱ انكر تعالى في خاتمة السورة المتقدمة على خلق الانسان عبثا مهملا وبين في هذه السورة كون الانسان مكلفا ببعض الاحكام واستلزام التكليف عدم كون خلقه عبثا بديهي ۲ منه عفى عنه

اعلم انه سبحانه لما وصف انوار قلوب المؤمنین و ظلمات قلوب الجاهلین اتبع ذلك بدلائل التوحید قال المسکین و امتد هذا الی قوله ان الله علی کل شیء قدير ثم عاد الی وصف الایات بقوله تعالی لقد انزلنا آیات مبینات الخ و یقولون امنا بالله الخ قال ابو السعود شروع فی بیان احوال بعض من لم یسأ الله هدیته الی الصراط المستقیم قال الحسن نزلت فی المنافقین انما کان قول المؤمنین الخ اعلم انه تعالی لما حکى قول المنافقین و ما قالوه و ما فعلوه اتبعه بذكر ما کان یجب ان یفعلوه و ما یجب ان یسلکة المؤمنون و عد الله الذین امنوا الخ قال ابو السعود استیناف مقرر لما فی قوله تعالی و ان تطیعوه تهتدوا امن الوعد الکریم و معرب عنه بطریق التصریح و مبین لتفاصيل ما اجمل فیہ من فنون السعادات الدینیة و الدنیویة الی هی من اثار الاهتداء و متضمن لما هو المراد بالطاعة الی نیط بها الاهتداء لا تحسبن الذین کفروا الخ قال ابو السعود لما بین حال من اطاعه علیه الصلوة و السلام و اشیر الی فوزه بالرحمة المطلقة المستتبعة لسعادة الدارین عقب ذلك بیان حال من عصاه علیه الصلوة و السلام و مال امره فی الدنیا و الآخرة بعد بیان ثنایه فی الفسق تکمیلاً لامر الترغیب و الترهیب یا ایها الذین امنوا لیستاذنکم الخ قال ابو السعود رجوع الی بیان تنمة الاحکام السابقة بعد تمهید ما یوجب الامثال بالا و امر و النواهی الواردة فیها و فی الاحکام اللاحقة من التمثیلات و الترغیب و الترهیب و الوعد انما المؤمنون الذین امنوا الخ قال ابو السعود استیناف جئ به فی اواخر الاحکام السابقة تقريرها و تاکید الوجوب مراعاتها و تکمیلاً لها بیان بعض اخر من جنسها لا تجعلوا دعاء الرسول الخ قال ابو السعود استیناف مقرر لمضمون ما قبله

سورة الفرقان

تبارك الذى نزل الفرقان الخ اعلم ان الله سبحانه و تعالى تكلم فى هذه السورة فى التوحيد والنبوة و احوال القيامة ثم ختمها بذكر صفات العباد المخلصين الموقنين ولما كان اثبات الصانع واثبات صفات جلاله يجب ان يكون مقدما على الكل لاجرم افتتح الله هذه السورة بذلك واتخذ وامن دون الله الهة الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما وصف نفسه بصفات الجلال والعزة والعلواردف بتزئيف مذهب عبدة الاوثان و قال الذين كفروا الخ اعلم انه سبحانه تكلم اولا فى التوحيد وثانيا فى الرد على عبدة الاوثان و ثالثا فى هذه الاية تكلم فى مسئلة النبوة و حكى سبحانه شبهتهم^٢ فى انكار نبوة محمد صلى الله عليه وسلم الشبهة الاولى قولهم ان هذا الا افك وان الله تعالى اجاب عن هذه الشبهة بقوله فقد جاؤا ظلما وزورا الشبهة الثانية لهم قوله تعالى وقالوا اساطير الاولين و اجاب الله عن هذه الشبهة بقوله قل انزله الذى يعلم السر الخ الشبهة الثالثة وهى فى نهاية الركاة ذكر و اله صفات خمسة فزعموا انها تخل بالرسالة فاجاب الله تعالى عن هذه الشبهة بوجوه احدهما قوله انظر كيف ضربوا الخ تبارك الذى انشاء جعل الخ اعلم ان هذا هو الجواب الثانى عن تلك الشبهة بل كذبوا بالساعة الخ هذا جواب ثالث عن تلك الشبهة كانه سبحانه و تعالى قال ليس ما تعلقوا به شبهة علمية فى نفس المسئلة بل الذى حملهم على تكذيبك تكذيبهم بالساعة استثقالا للاستعداد لها و يحتمل ان يكون المعنى انهم يكذبون بالساعة فلا يرجون ثواب ولا عقابا ولا يتحملون كلفة النظر و الفكر فلهذا لا ينتفعون بما يورد عليهم من الدلائل قل اذلك خير الخ اعلم انه تعالى لما وصف حال العقاب المعد للمكذبين بالساعة اتبع بما يؤكده الحسرة والندامة فقال لرسوله قل الخ و يوم نحشرهم

١ هى التى ذكرت فى قوله تعالى واقموا الصلوة. ٢ ختم السورة المقدمة بذكر حقوق الرسول عليه الصلوة والسلام ووجوب اطاعة كن لك اثبت رسالة بالدلائل وازاحة الشبهات فى مفتح هذه السودة فتناست ٢ امه.

الخ اعلم ان قوله تعالى و يوم نحشرهم راجع الى قوله واتخذ وامن دونه الهة وما ارسلنا قبلك الخ هذا جواب عن قولهم مال هذا الرسول ياكل الطعام وجعلنا بعضكم لبعض الخ صبره الله تعالى على كل تلك الاذية و بين انه جعل الخلق بعضهم فتنة لبعض و قال الذين لا يرجون الخ اعلم ان قوله تعالى و قال الذين الخ هو الشبهة الرابعة لمنكرى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم وحاصلها لم ينزل الله الملكة حتى يشهدوا ان محمد امحق فى دعواه او نرى ربنا حتى يخبرنا باننا ارسله الينا لقد استكبروا الخ اعلم ان هذا هو الجواب عن تلك الشبهة يوم يرون الملكة الخ هو جواب لقولهم لولا انزل علينا الملكة فبين تعالى ان الذى سالوه سيوجدولكنهم يلقون منه مايكرهون و قدمنا الى ما عملوا الخ قال المسكين بيان لارتفاع اسباب النفع اثر بيان اجتماع اسباب الضرر اصحاب الجنة يومئذ خير الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما بين حال الكفار فى الخسار الكل و الخيبة التامة شرع وصف اهل الجنة تنبيها على ان الحظ كل الحظ فى طاعة الله تعالى و يوم تشقق السماء الخ اعلم ان هذا الكلام مبنى على ما استدعوه من انزال الملكة فبين سبحانه انه يحصل ذلك فى يوم له صفات و قال الرسول يارب الخ اعلم ان الكفار لما اكثر و امن الاعتراضات الفاسدة و وجوه التعنت ضاق قدر الرسول صلى الله عليه وسلم وشكاهم الى الله تعالى و قال يارب الخ ثم انه تعالى قال مسلما لرسوله عليه الصلوة والسلام و معزياله وكذلك جعلنا الخ و قال الذين كفروا لولا انزل الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الخامسة لمنكرى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم ولا يأتونك الخ لما بين فساد قولهم بالجواب الواضح قال ولا يأتونك بمثل من الجنس الذى تقدم ذكره من الشبهات الاجتناك بالحق الذى يدفع قولهم الذين يحشرون الخ الاقرب انه صفة للقوم الذين اوردوا هذه الاسئلة على سبيل التعنت و ان كان غيرهم من اهل النار يدخل معهم واعلم انه تعالى بعد ان تكلم فى التوحيد و نفى الانداد و اثبات النبوة و الجواب عن شبهات المنكرين لها و فى احوال القيامة شرع فى ذكر القصص على السنة المعلومة القصة الاولى قوله تعالى ولقد اتينا موسى الخ اعلم انه تعالى لما قال و كذلك جعلنا لكل نبي عدوا من المجرمين اتبعه بذكر جماعة من الانبياء و عرفه بمانزل بمن كذب من اممهم القصة الثانية قصة نوح عليه السلام قوله تعالى و قوم نوح الخ القصة الثالثة قوله تعالى و عا دا و ثمود الخ القصة الرابعة قوله تعالى ولقد اتوا على القرية الخ قوله تعالى و اذاراؤك الخ اعلم انه سبحانه لما بين مبالغة المشركين

فى انكار نبوة و فى ايراد الشبهات فى ذلك بين بعد ذلك انهم اذاروا الرسول اتخدوه
 هزوا فلم يقتصروا على ترك الايمان به بل زادوا عليه بالاستهزاء والاستحقاق وسوف
 يعلمون الخ لما حكى عنهم هذا الكلام زيف طريقتهم فى ذلك الم ترالى ربك الخ
 اعلم انه تعالى لما بين جهل المعرضين عن دلائل الله تعالى و فساد طريقتهم فى ذلك
 ذكر بعده انواعا من الدلائل الدالة على وجود الصانع قال المسكين وامتد هذا الاستدلال
 الى قوله تعالى و كان ربك قديرا و اشار فى تضاعيفه الى عموم بعثة عليه السلام بقوله
 ولوشئنا لبعثنا ونهاد عليه الصلوة والسلام عن المداراة مع الكفار والتلطف فى الدعوة
 فى قوله فلا تطع الكافرين مناسبة لقوله فابى اكثر الناس الا كفورا و يعبدون من دون الله الخ
 اعلم انه تعالى لما شرح دلائل التوحيد عاد الى تهجين سيرتهم فى عبادة الاوثان وما ارسلناك
 الا مبشرا الخ قال المسكين لما زيف طريق الكفار امر لرسول عليه الصلوة والسلام بدعوتهم
 الى الحق و عدم الحزن ان لم يؤمنو و باعلامهم باخلاص الدعوة وبالتوكل على الله تعالى
 فيما يعرض فى الدعوة ثم لما امره بان يتوكل عليه وصف نفسه بامور الحياة والعلم
 والقدرة والرحمة و اذا قيل لهم اسجدوا الخ قال المسكين لما ذكر اوصاف الكمال له
 تعالى ذكر جهالة الكفار فى نفورهم عن عبادة من هو موصوف بتلك الاوصاف والكمالات
 تبارك الذى جعل الخ اعلم انه سبحانه لما حكى عن الكفار مزيد النفرة عن السجود
 ذكر ما لو تفكروا فيه وجوب السجود والعبادة للرحمن فقال تبارك الذى جعل فى السماء
 بروجاء و عباد الرحمن الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لبيان اوصاف خلص عباد
 الرحمن واحوالهم الدنيوية والاخرية بعد بيان حال النافرين عن عبادته والسجود له قل
 ما يعابكم الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بان يبين للناس ان الفائزين
 بتلك النعماء الجليلة التى يتنافس فيها المتنافسون انما نالوها بما عدد من محاسنهم
 ولولا هالم يعتد بهم اصلا فقد كذبتم الخ قال ابو السعود بيان لحال الكفرة من المخاطبين
 كما ان ما قبله بيان لحال المؤمنين منهم.

سورة الشعرا

طسم تلك ايات الكتاب الخ لما ذكر الله تعالى انه بين الامور قال بعده لعلك باخع
منبهاً بذلك على ان الكتاب وان بلغ في البيان كل غاية فغير مدخل لهم في الايمان لما
انه سبق حكم الله بخلافه فلا تبلغ في الحزن والاسف على ذلك ثم بين تعالى انه قادر
على ان ينزل اية يدلون عندها و يخضعون و قوله ما ياتيهم الخ من تمام قوله ان نشاء
ننزل عليهم فنبه تعالى على انه مع قدرته على ان يجعلهم مؤمنين بالالغاء رحيم بهم من
حيث ياتيهم حال بعد حال بالقران وهو الذكر وهم مع ذلك على حد واحد في الاعراض
والاستهزاء ثم عند ذلك زجروا وتوعد فقال فقد كذبوا ثم انه تعالى بين انه مع انزله القرآن
حالا بعد حال قد اظهرا دلة تحدث حالا بعد حال فقال اولم يروا الى الارض الخ اما قوله
ان في ذلك لاية وما كان اكثرهم مؤمنين المعنى ان في ذلك دلالة لمن يتفكروا ويتدبرو مع
كل ذلك يستمرا اكثرهم على كفرهم و ان ربك لهوا العزيز الرحيم المراد انهم مع
كفرهم و قدرة الله تعالى على ان يعجل عقابهم لا يترك رحمتهم بما تقدم ذكره من خلق
كل زوج كريم من النبات ثم من اعطاء الصحة والعقل والهداية واذنادى ربك الخ قال
ابوا السعود كلام مستأنف مسوق لتقرير ما قبله من اعراضهم عن كل ما ياتيهم من الايات
التنزيلية و تكذيبهم بها اثر بيان اعراضهم عما يشاهدونه من الايات التكوينية و اذ منصوب
على المفعولية بمضمرة خوطب به النبي عليه السلام اى و اذكر لا ولئلك المعرضين
المكذبين زجر الهم عما هم عليه من التكذيب و تحذيرا من ان يحقق بهم مثل ما حاق
باضرابهم المكذبين الظالمين في الكبير القصة الثانية قصة ابراهيم عليه السلام قوله تعالى

١ لعله سقط ههنا لفظ من النسخ و كان العبارة لعلوا وجوب الخ ٢ منه ٣ في الكبير عن ابن عباس رضى الله
عنهما ان البروج هي الكواكب العظام ٢ منه ٣ فالدعاء بمعنى العبادة ١٢ ٤ ذكر في خاتمة السورة
المتقدمة الوعيد على التكذيب و ذكر في هذه السورة تفصيل جزاء المكذبين السابقين ١٢ منه عفى عنه

واتل عليهم الخ القصة الثالثة قصة نوح عليه السلام قوله تعالى كذبت قوم نوح الخ القصة الرابعة قصة هود عليه السلام قوله تعالى كذبت عاد الخ القصة الخامسة قصة صالح عليه السلام قوله تعالى كذبت ثمود الخ القصة السادسة قصة لوط عليه السلام قوله تعالى كذبت قوم لوط الخ القصة السابعة قصة شعيب عليه السلام قوله تعالى كذبت اصحاب الايكة الخ القول فيما ذكره الله تعالى من احوال محمد عليه الصلوة والسلام قوله تعالى وانه لتنزيل الخ قال المسكين هذا اعود الى ما ذكر فى صدر السورة من حقيقة الكتاب المبين ونبوة عليه السلام وتمهد هذا الى اخر السورة و ذكر فى تضاعيفها جهل الكفار وعنادهم وامره عليه السلام بالتبليغ وعدم الاهتمام سيكيدهم و شرهم واجاب عن شبهاتهم الواهية و ختم السورة بالتهديد العظيم لمن انكر بعد وضوح الحجة.

سورة النمل

قال المسكين افتتح الله هذه السورة بحقيقة القرآن وايمان السعداء به وانكار الاشقياء له ومال كل من الفريقين وانك لتلقى الخ هذه الاية بساط و تمهيد المايريد ان يسوق بعدها من الاقاصيص واعلم ان الله تعالى ذكر فى هذه السورة انواعا من القصص القصص الاولى قصة موسى عليه السلام قوله اذ قال موسى الخ القصة الثانية قصة داود وسليمان عليهما السلام قوله تعالى ولقد اتينا داود الخ القصة الثالثة قصة صالح عليه السلام قوله تعالى ولقد ارسلنا الى ثمود الخ القصة الرابعة قصة لوط عليه السلام قوله تعالى و لوطا اذ قال لقومه الخ القول فى خطاب الله تعالى مع محمد صلى الله عليه وسلم قوله تعالى قل الحمد لله الخ قال المسكين لما فرغ من ذكر القصص بدأ فى التوحيد واثباته بالدلائل وابطال الشرك فالمقصود هو قوله الله خيرام مايشركون الخ واما قوله قل الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى فهو كالخطبة المقدمة على المقصود توطئة و تبركا قل لايعلم من فى السموات الخ قال ابوا السعود بعد ما حقق تفرد الله تعالى بالالوهية ببيان اختصاصه بالقدة الكاملة التامة والرحمة الشاملة العامة عقبه بذكر ماهو من لوازمه وهو اختصاصه بعلم الغيب تكميلا لما قبله و تمهيدا لما بعده من امر البعث بل ادارك علمهم الخ قال ابوا السعود لما نفى عنهم علم الغيب واكد ذلك بنفى شعورهم بوقت ماهو مصيرهم لامحالة بولغ فى تاكيده و تقريره و قال الذين كفرو الخ قال ابوا السعود بيان لجهلهم بالآخرة وعميهم منها بحكاية انكارهم للبعث قل سيروا فى الارض الخ قال المسكين امر صلى الله عليه وسلم بتهديهم على التكذيب ولا تحزن عليهم الخ قال المسكين هذا تسلية له عليه الصلوة والسلام ويقولون متى هذا الوعد الخ قال المسكين عود الى انكارهم للبعث بنهج اخر ثم اجاب عنه بوعدهم ببعض ما استعجلوه فى قوله قل عسى ان يكون الخ ثم بين سبب تاخر العذاب الاكبر بقوله و ان ربك لذو فضل الخ ثم

١ بين حقيقة القرآن فى فاتحة هذه وخاتمة ما قبلها فحصلت المناسبة ١٢ منه عفى عنه

١ فى خاتمة السورة السابقة لماتمم الحجة على الكفار بقوله و من ضا فقا . انما انا من المنذرين بين فى هذه حال من

اشار الى ان لهم قبائح غير ما يظهرونه وانه تعالى يجازيهم على الكل في قوله وان ربك
ليعلم ما تكن الخ ثم اشار الى ان قبائحهم كما هي معلومة له تعالى كذا هي مثبتة مع الاشياء
الاخر في اللوح المحفوظ في قوله وما من غائبة في السماء الخ ثم بين فضائل القرآن
العظيم المشتمل على هذه الامور المهمة النافعة في قوله ان هذا القرآن الخ ثم صلى
رسول الله صلى الله عليه وسلم بان قضاء هم موكل الى الله تعالى فلا تهتم بهم ان
كذبوك ولا تخفهم ان عاندونك بل توكل على الله ولا تحزن ان لم يؤمنوا لانهم
كالموتى والصم والعمى في قوله تعالى ان ربك يقضى الى قوله فهم مسلمون فكل هذا
متعلق بالنبوة ثم عاد الى المعاد فقال واذا وقع القول عليهم الخ قال ابو السعود وبيان لما
اشير اليه بقوله تعالى بعض الذي تستعجلون من بقية ما يستعجلونه من الساعة ومباديها و
يوم نحشر من كل امة الخ قال ابو السعود بيان اجمالى لحال المكذبين عند قيام الساعة
بعد بيان بعض مباديها الم يروا انا جعلنا الليل الخ قال المسكين اخذا من ابي السعود
هذا دليل لصحة البعث وانموذج له يستدل به عليها فان من تأمل في تعاقب الليل والنهار
وشاهد من الافاق تبدل ظلمة الليل المحاكية للموت بضياء النهار المضاهي للحياة
وعاين في نفسه تبدل النوم الذي هو اخو الموت بالانتباه الذي هو مثل الحياة قضى بان
الساعة آتية لا ريب فيها وان الله يبعث من في القبور و يوم ينفخ الخ اعلم ان هذا هو
العلامة الثانية لقيام وتري الجبال الخ اعلم ان هذا هو العلامة الثالثة لقيام القيامة من جاء
بالحسنة الخ اعلم انه تعالى لماتكلم في علامات القيامة شرح بعد ذلك احوال
المكلفين بعد قيام القيامة انما امرت ان اعبد الخ قال ابو السعود امر عليه الصلوة
والسلام ان يقول لهم ذلك بعد ما بين لهم احوال المبدأ والمعاد وشرح احوال القيامة
تنبيها لهم على انه قد اتم امر الدعوة بما لا مزيد عليه ولم يبق له عليه الصلوة والسلام بعد
ذلك شأن سوى الاشتغال بعبادة الله عز وجل والاستغراق في مراقبته غير مبال بهم
ضلوا ام رشدوا اصلحوا او افسدوا وقل الحمد لله سيريكم الخ انه سبحانه ختم هذه
الخاتمة في نهاية الحسن وهي قوله وقل الحمد لله على ما اعطاني من نعمة العلم والحكمة
والنبوة او على ما وفقني من القيام باداء الرسالة وبالانذار سيريكم آياته القاهرة فتعرفونها
لكن حين لا ينفعكم الايمان وما ربك بغافل عما تعملون لانه من وراء جزاء العاملين.

سورة القصص

ان فرعون علا الخ قال ابو السعود استيناف جار مجرى التفسير للجمل الموعود ولقد اتينا موسى الكتب الخ قال ابو السعود والتعرض لبيان كون ايتاءها بعد اهلاكم للاشعار بمساس الحاجة الداعية اليه تمهيد المايقبه من بيان الحاجة الداعية الى انزال القرآن الكريم على رسول الله صلى الله عليه وسلم فان اهلاك القرون الاولى من موجبات اندراس معالم الشرائع وانطماس اثارها واحكامها الموديين الى اختلال نظام العالم وفساد احوال الامم المستدعين للتشريع الجديد بتقرير الاصول الباقية على من الدهور وترتيب الفروع المتبدلة بتبدل العصور وتذكر احوال الامم الخالية الموجبة للاعتبار وما كنت بجانب الغربى الخ قال ابو السعود شروع فى بيان ان انزال القرآن الكريم ايضا واقع فى زمان شدة مساس الحاجة اليه واقتضاء الحكمة له البتة ولولا ان تصيهم الخ قال المسكين هذا تعليل للارسال اى ارسلناك قطعاً لمعاذيرهم بالكلية فلما جاءهم الحق الخ قال المسكين من ههنا الى قوله تعالى ضل عنهم ما كانوا يفترون تهجين طريقة المشركين فى اقوالهم وعقائدهم وبيان شبهاتهم والجواب عنها وتهديدهم بتذكير حال من قبلهم وبما يرون يوم القيامة واثبات توحيده تعالى وعدم اغناء الهتهم عنهم شيئاً فهذا كله كلام واحد متداخل بعضه فى بعض ثم ذكر تعالى قصة قارون كالتفسير الاجمال قوله تعالى وكم اهلكنا من قرية بطرت معيشتها الخ تنبيهها على ان متاع الحيوة الدنيا وزينتها لا ينبغي الاغترار به فان ما عند الله خير وابقى ثم ختم القصة ببيان من يصلح للدار الآخرة بقوله تلك الادارا الآخرة نجعلها الخ ثم ذكر القول الكلى لبيان جزاء طالب الدنيا وطالب الآخرة بقوله من جاء بالحسنة الخ ثم لما ختم تفصيل احوال الكفار وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم فى اهتمام و اغتمام من امرهم كما يدل عليه قوله تعالى انك لا تهدي من احببت خاطب عليه السلام ليقوى قلبه ببعض البشارات وذكره بعض امتنانات وامره بالاستقامة على الحق وعدم المبالاة بالكفار والثبات على الدعوة وتفويض الحكم اليه تعالى اذ ارجع الكل اليه كل هذا مذكور فى قوله تعالى ان الذى فرض عليك القرآن الى اخر السورة ولله الحمد.

١ فى خاتمة السورة السابقة لماتمم الحجة على الكفار بقوله و من ضل فقل انما انا من المنذرين بين فى هذه حال من ضل كفرعون و من انذر كموسى عليه السلام ١٢ منه عفى عنه

سورة العنكبوت

الم احسب الناس الخ الوجه في تعلق اول هذه السورة بما قبلها هو انه تعالى لما قال في اخر السورة المتقدمة وادع الى ربك و كان في الدعاء اليه الطعان والحراب والضراب لان النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه كانوا مامورين بالجهاد ان لم يؤمن الكفار بمجرد الدعاء فشق على البعض ذلك فقال احسب الناس ان يتركوا الخ ولقد فتنا الذين من قبلهم الخ ما يوجب تسليتهم فقال كذلك فعل الله بمن قبلهم ولم يتركهم بمجرد قولهم امنا بل فرض عليهم الطاعات واوجب عليهم العبادات ام حسب الذين الخ لما بين حسن التكليف بقوله احسب الناس بين ان من كلف بشئ ولم يات به يعذب وان لم يعذب في الحاك فيعذب في الاستقبال ولا يفوت الله شئ في الحال ولا في المال من كان يرجوا الخ لما بين بقوله احسب الناس ان العبد لا يترك في الدنيا سدى و بين في قوله ام احسب الذين يعملون السيئات ان من ترك ما كلف به يعذب كذا بين ان من يغتفر بالاخرة ويعمل لها لا يضيع عمله ولا نجيب اصله و من جاهد الخ لما بين ان التكليف حسن واقع و ان عليه وعدا وايعادا ليس لهما دافع بين ان طلب الله ذلك من المكلف ليس لنفع يعود اليه فانه غنى مطلقاً والذين امنوا الخ لما بين اجمالاً ان من يعمل صالحاً فلنفسه بين مفصلاً بعض التفصيل جزاء المطيع الصالح عمله ووصينا الانسان الخ لما بين الله حسن التكليف ووقعها و بين ثواب من حقق التكليف اصولها وفروعها تحريضا للمكلف على الطاعة ذكر المانع ومنعه من ان يختار اتباعه فقال الانسان ان انقاد لاحد ينبغي ان ينقاد لابويه ومع هذا لو امراه بالمعصية لا يجوز اتباعهما غيرهما فلا يمنعن احدكم شئ من طاعة الله ولا يتبعن احد من يأمر بمعصية الله والذين امنوا و عملوا الخ قال المسكين اعاده لان ما قبله كان بيانا لحالتهم الحقيقية وهذا بيان لحالتهم الاضافية و من الناس من يقول الخ نقول اقسام المكلفين ثلاثة مؤمن ظاهر بحسن اعتقاده و كافر مجاهر بكفره و عناده ومذبذب

۱ وجه تعلق السورتين المذكور في المتن ۱۲ منه عفى عنه

بينهما يظهر الايمان بلسانه و يضمرك الكفر فى فؤاده والله تعالى لما بين القسمين بقوله تعالى فليعلمن الله الذين صدقوا و ليعلمن الكاذبين و بين احوالها بقوله ام حسب الذين يعملون السيئات الى قوله والذين امنوا و عملوا الصلحت بين القسم الثالث و قال و من الناس من يقول امنا بالله و قال الذين كفروا للذين امنوا الخ قال ابو السعود بيان لحملهم للمؤمنين على الكفر بالاستمالة بعد بيان حملهم لهم بالاذية والوعيد ولقد ارسلنا نوحا الخ ان الله تعالى لما بين التكليف و ذكر اقسام المكلفين و وعد المؤمن الصادق بالثواب العظيم و اوعد الكافر والمنافق بالعذاب الليم و كان قد ذكر ان هذا التكليف ليس مختصا بالنبي واصحابه وامته حتى صعب عليهم ذلك بل قبله كان كذلك كما قال تعالى ولقد فتنا الذين من قبلهم ذكر من جملة من كلف جماعة منهم نوح النبي عليه السلام و قومه ومنهم ابراهيم عليه السلام و غيرهما مثل الذين اتخذوا الخ لما بين الله تعالى انه اهلك من اشرك عاجلا و عذب من كذب اجلا و لم ينفعه فى الدارين معبوده و لم يدفع ذلك عنه ركوع و سجوده مثل اتخاذه ذلك معبودا باتخاذ العنكبوت بيتا لا يجير اويا ولا يريح ثاويا قال المسكين ثم قرر امر التوحيد ببيان ضعف ما يدعون من دونه و بلاغة المثل المذكور واضرابه و كونه تعالى خالقا بالحق ثم قال ان فى ذلك لاية للمؤمنين اى دليلا على التوحيد اتل ما اوحى اليك الخ يعنى ان كنت على كفرهم فاتل ما اوحى اليك لتعلم ان نوحا ولوطا وغيرهما كانوا على ما انت عليه بالغوا الرسالة وبالغوا فى اقامة الدلالة ولم ينقذوا قومهم من الضلالة والجهالة ولا تجادلوا اهل الكتاب الخ لما بين الله طريقة ارشاد المشركين و نفع من انتفع و صل الياس ممن امتنع بين طريقة ارشاد اهل الكتاب ثم بعد ذلك ذكر دليلا قياسيا فقال وكذلك انزلنا اليك الكتاب يعنى كما انزلنا على من تقدمك انزلنا اليك و هذا قياس و ما كنت تتلوا من قبله الخ هذا المبحث فى الاجوبة عن الشبهات فى النبوة من اقتراحهم الايات واستعجال العذاب ان كان نبيا و نحوهما و امتد هذا الى قوله ذوقوا ما كنتم تعملون يا عبادى الذين امنوا الخ قال المسكين بيان الامر الهجرة اثر بيان عنا الكفار المفضى اليها غالبا كل نفس ذائقة الموت الخ لما امر الله تعالى المؤمنين بالمهاجرة صعب عليهم ترك الاوضاع و مفارقة الاخران فقال لهم ان ماتكرهون لا بد من وقوعه فان كل نفس ذائقة الموت والموت مفرق الاحباب فالاولى ان يكون ذلك فى سبيل الله يجازيكم عليه فان الى الله مرجعكم والذين امنوا و عملوا الصلحت الخ بين ما يكون للمؤمنين وقت الرجوع الخ و كاين من دابة الخ قال ابو السعود

روى ان النبى صلى الله عليه وسلم لما امر المؤمنين الذين كالوا بمكة بالمهاجرة الى المدينة قالوا و كيف فقدم بلدة ليس لنا فيها معيشة ولئن سألتهم الخ قال المسكين عود الى تقرير التوحيد الذى كان مذكورا فى قوله تعالى مثل الذين اتخذوا الخ بالثبات الخالقية و الرزاقية و غيرهماله تعالى ثم حقر شان الدنيا المانقة لهم عن الاقبال على الاخرة بالايمان بالله و رسول مع اعترافهم بالتوحيد و فت السؤال فى قوله وما هذه الحيوۃ الدنيا الخ ثم اشار الى عودهم الى الفطرة الاصلية التى تقتضى التوحيد اذا زال المانع من الركون الى الزخارف والشهوات وقت ركوبهم فى الفلك بقوله فاذا ركبوا فى الفلك الخ ثم ذكر لهم نعمة عظيمة من امنهم فى الحرم تحملهم على الايمان فى قوله اولم يروا انا جعلنا حرما الخ و من اظلم ممن افترى الخ لما بين الله الامور على الوجه المذكور ولم يؤمن به احدين انهم اظلم من يكون والذين جاهدوا افينا الخ قال المسكين كانه قسيم لقوله من اظلم ممن افترى اى حال العاصى ذلك و حال المطيع هذا والله اعلم.

سورة الروم

اولم يتفكرو الخ قال ابو السعود انكار واستقبح لقصم لظهرهم على ما ذكر من ظاهر الحيوية الدنيا مع الغفلة عن الآخرة اولم يسيروا فى الارض الخ قال ابو السعود توبيخ لهم بعدم اتعاضهم بمشاهدة احوال امثالهم الدالة على عاقبتهم ومالهم الله يبدأ الخلق الخ قال المسكين كان ما ذكر من قوله اولم يسيروا الخ دليلا وانموذ جابو قوع الآخرة وهذا دعوى وقوعها وما تكون فيها من احوال المؤمنين والكفار فسبحان الله الخ قال ابو السعود اثر ما بين حال فريقى المؤمنين العاملين للصالحات والكافرين المكذبين بالآيات ومالهما من الثواب والعذاب امر واما ينجى من الثانى و يفضى الى الاول من تنزيه الله عز وجل عن كل مالا يليق بشانه سبحانه ومن حمده تعالى على نعمه العظام يخرج الحى من الميت الخ قال المسكين بيان لبعض اعاجيب قدرة تعالى ليدل على استحقاقه للحمد وليدل على صحة البعث التى فيها الكلام ههنا ثم ذكر الآيات الدالة على البعث الى قوله وله المثل الا على فى السموات والارض وهو العزيز الحكيم قوله ضرب لكم مثلا الخ لما بين العادة والقدرة عليها بالمثل بعد الدليل بين الوجدانية ايضا بالمثل بعد الدليل واذا مس الخ لما بين التوحيد بالدليل وبالمثل بين ان لهم حالة يعرفون بها وان كانوا ينكرونها فى وقت وهى حالة الشدة ام انزلنا عليهم سلطانا الخ لما سبق قوله تعالى بل اتبع الذين ظلموا اهواءهم بغير علم حقق ذلك بالاستفهام بمعنى الانكا واذا اذقنا الناس رحمة الخ قال المسكين بيان لاثار التوحيد المتزلزل الذى كان فى المشركين ثم بين قصور نظرهم فى قوله اولم يروا الخ ببيان كون كل من الاحوال من الله تعالى فيجب ان يرجع اليه فى كل حال ثم ذكر علامات اعتقاد كون الرزق من الله الخ الذى يجب ان يتصف به المؤمنون عن ايتاء اهل الحقوق حقوقهم

١ لما كان المذكور فى خاتمة ما قبلها حال العاصى والمطيع من حيث ان احدهما ظالم مستحق لجهennem والاخر مهيد مستحق لميته تعالى بين فى فاتحة هذه السورة حالهما بوجه من حيث كون احدهما غالبا والاخر مغلوبا كما افصح عنه قوله تعالى و يومئذ يفرح المؤمنون بنصر الله ١٢ منه عفى عنه

الدال على كمال التوكل و عدم الخشية من الاقلال ونهاهم عن الحرص و اطمع و طلب
الزيادة فى قوله فات ذا القربى حقه الى قوله اولئك هم المضعفون الله الذى خلقكم الخ
قال المسكين عود الى مسئلة التوحيد والحشر ظهر الفساد الخ وجه تعلق هذه الاية بما
قبلها هو ان الشرك سبب الفساد قل سيروا فى الارض الخ لما بين حالهم بظهور الفساد
فى احوالهم بسبب فساد اقوالهم بين لهم هلاك امثالهم واشكالهم الذين كانت افعالهم
كافعالهم فاقم وجهك الخ قال المسكين امر بالتوحيد مع الوعيد من اتيان القيامة و فصل
الامور فيما ومن آياته ان يرسل الخ قال المسكين اقامة لدلائل التوحيد والبعث ولقد ارسلنا
من قبلك والله قال ابو السعود لعل توسيط الاية الكريمة بطريق الاعتراض بين ما سبق
وما لحق من احوال الرياح واحكامها لانذار الكفرة و تحذير هو عن الاخلال بمواجب
الشكر المطلوب بقوله تعالى لعكم تشكرون بمقالته النعم المعدوة المنوطة بارسالها
كيلا يحل بهم مثل ما حل باولئك الامم من الانتقام الله الذى يرسل الخ قال ابو السعود
استيناف مسوق لبيان ما اجمل فيما سبق من احوال الرياح ولئن ارسلنا الخ لما بين انهم
عند توقف الخير يكونون مبلسين ايسين وعند ظهوره يكونون مستبشرين بين ان تلك
الحالة ايضا لا يدومون عليها بل لوا صاب زرعهم ربح مصفر لكفرو افهم منقلبون غير
ثابتين لنظرهم الى الحال لا الى المال فانك لا تسمع الموتى الخ لما علم تعالى رسوله
انواع الادلة و اصناف الامثلة و وعدو اوعد ولم يزد هم دعاءى الافرارا قال له فانك
لا تسمع الخ الله الذى خلقكم الخ لما اعاد من الدلائل التى مضت دليل من دلائل الافاق
وهو قوله الله الذى يرسل الرياح وذكر احوال الرياح من اوله الى اخره اعاد دليلا من دلائل
الانفس وهو خلق آدمى وذكر احواله فقال خلقكم من ضعف الخ ويوم تقوم الساعة الخ
قال المسكين تصريح بالمطلوب من اثبات الحشر بعد المقدمة من بيان الدليل ولقد ضربنا
للناس الخ اشارة الى ازالة الاعذار والاتيان بما فوق الكفاية من الانذار والى انه لم يبق من
جانب الرسول تقصيرى فان طلبوا شيئا اخر فذلك عناد ثم بين تعالى ان ذلك بطبع الله
على قلوبهم بقوله كذلك يطبع الله ثم انه تعالى سلى قلب النبى صلى الله عليه وسلم
بقوله فاصبر الخ.

سورة لقمان

الم تلك ايات الكتاب الحكيم الخ وجه ارتباط اول هذه السورة باخر ما قبلها هو ان الله تعالى لما قال ولقد ضربنا للناس الخ اشارة الى كونه معجزة وقال ولئن جئتهم بآية اشارة الى انهم يكفرون بالآيات بين ذلك الم تلك ايات الكتاب الحكيم اي هذه ايات ولم يؤمنوا بها والى هذا اشار بعد هذا بقوله واذا تتلى الخ ومن الناس من يشتري الخ لما بين ان القرآن كتاب حكيم يشتمل على ايات حكمية بين من حال الكفار انهم يرون ذلك يشتغلون لغيره ان الذين امنوا الخ لما بين حال من اذا تتلى عليه الآيات ولى بين حال من يقبل على تلك الآيات ويقبلها خلق السموات بغير عمد الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لاستشهاد بما فصل فيه على عزته تعالى التى هى كمالا اخذرة حكمة التى هى كمال العلم وتمهيد قاعدة التوحيد و تقريره و ابطال امرا لا شرآك و تبكى اهله ولقد آتينا لقمان قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لبيان بطلان اشرك و وصينا الانسان الخ قال ابو السعود كلام مستأنف اعترض به على نهج الاستطراد فى اثناء وصية لقمان تاكيد المافيه من النهى عن الشرك يانبى انها ان تك الخ قال ابو السعود شروع فى حكاية بقية وصايا لقمان اثر تقرير ما فى مطلعها من النهى عن الشرك و تاكيده بالاعتراض الم ترو ان الله سخر الخ قال ابو السعود رجوع الى سنن ماسلف قبل قصة لقمان من خطاب المشركين و توبيخ لهم على اصرارهم على ما هم عليه مع مشاهدتهم لدلائل التوحيد و من يسلم وجهه الخ لما بين حال المشرك والمجادل فى الله بين حال المسلم المستسلم لامر الله و من كفر فلا يحزنك الخ قال المسكين هذا تسلية للنبي عليه السلام ولئن سألتهم الخ لما استدلل بخلق السموات بغير عمد و بنعمة الظاهرة والباطنة بين انهم معترفون بذلك غير منكرين له ولوان ما فى الارض الخ قال المسكين بيان لكمال عظمة تعالى ببيان عظمة

كلماته ما خلقكم ولا بعثكم الخ لما بين كمال قدرته وعلمه ذكر ما يطل استعبادهم للحشر الخ
 الم تر ان الله يولج الخ قال المسكين عود الى اثبات التوحيد بالدلائل و كذا قوله الم تر ان
 الفلك تجري الخ واذا غشيهم موج الخ لماذا ذكر الله ان في ذلك لايات ذكر ان الكل
 متصرفون به غير ان البصير يدركه اولا ومن في بصيرته ضعف لا يدركه اولا فاذا غشيه
 موج ووقع في شدة اعترف يا ايها الناس الخ لماذا ذكر الدلائل من اول السورة الى اخرها وعظ
 بالتقوى لانه تعالى لما كان واحدا اوجب التقوى البالغة فان من يعلم ان الامر بيد اثنين لا يخاف
 احدهما مثل ما يخاف لو كان الامر بيدهما لا غير قال المسكين و ايضا فيه بيان لكيفية
 الحشر و ماهنا ان الله عنده علم الساعة الخ قال المسكين لنا بين الساعة فيما قبل سألوا
 امتي الساعة فذكر الله تعالى اختصاصه بعلمها مع اخواتها من علوم الغيب والله اعلم.

سورة السجده

الم تنزيل الكتاب الخ لما ذكر الله تعالى فى السورة المتقدمة دليل الواحدية و ذكر
الاصل الاخر وهو الحشر وختم السورة بهما بدأ ببيان الرسالة فى هذه السورة الله الذى خلق
السموات الخ لما ذكر الرسالة بين ما على الرسول من الدعاء الى التوحيد واقامة الدليل
وقالوا ذا ضللنا الخ لما قال قليلا ماتشكرون بين عدم شكرهم باتيانهم بضده وهو
الكفرو انكار قدرته على احياء الموتى وقد ذكرنا ان الله تعالى فى كلامه القديم كلما
ذكر اصلين من الاصول الثلاثة لم يترك الاصل الثالث و ههنا كذلك ولما ذكر الرسالة
بقوله تنزيل الكتاب الى قوله لتذرو ذكر الواحدية بقوله الله الذى خلق الى قوله جعل
لكم السمع والابصار ذكر الاصل الثالث وهو الحشر بقوله تعالى وقالوا ذا ضللنا الخ
ولو ترى اذا المجرمون الخ لما ذكر انهم يرجعون الى ربهم بين ما يكون عند الرجوع
على سبيل الاجمال انما يؤمن باياتنا الخ قال المسكين بيان لحال المؤمنين اثر حال
الكافرين افمن كان مؤمنا الخ لما بين حال المجرم والمؤمن قال للعاقل هل يستوى
الفريقان ثم بين انهما لا يستويان ثم بين عدم الاستواء على سبيل التفصيل و من اظلم
ممن الخ يعنى لنذيقنهم ولا يرجعون فيكونون قد ذكروا ابايات الله من النعم ولا والنقم
ثانيا ولم يؤمنوا فلا اظلم منهم احد ولقد اتينا موسى الخ لما قرر الاصول الثلاثة على
ما بيناه عادالى الاصل الذى بدأ به وهو الرسالة فى قوله لتذرو قوما وقال قل ما كنت بدعا
من الرسل ان ربك هو يفصل الخ قال المسكين بيان للفصل بين من امن بالرسول و من
لم يؤمن بهم اثر اثبات الرسالة اولم يهدلهم الخ قال المسكين وعيد للمكذبين الرسول
وهذا تذكير للنعم التى وبما تحمل على الايمان اولم يروا انا نسوق الماء الخ قال
المسكين هذا تذكير للنعم التى وبما تحمل على الايمان ويقولون متى هذا الفتح الخ
قال المسكين لما اوعده و ابو قوع الفصل فى قوله ان ربك هو يفصل بينهم استبعده
فحكى الله تعالى استبعادهم واجابهم عنه.

۱ وجه المناسبة بينها وبين ما قبلها مذكور فى المتن ۱۲ منه عفى عنه

سورة الاحزاب

قال المسكين فى جميع هذه السورة ذب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما اودى به من انواع الانداء قتال الاحزاب معه و معاونة المنافقين لهم و طعن المنافقين فى نكاحه عليه الصلوة والسلام بزینب رضى الله تعالى عنها و طلب الزواج الزيادة فى الانفاق و اشتغال بعض المسلمين بالاحاديث فى بيت عليه السلام ونحو ذلك مما تاذى به النبى صلى الله عليه وسلم فهذا القدر هو المقصود الاصل من السورة وما سوى ذلك فهو ما توطئة لبعض ما هو المقصود و امامكمل له كما يظهر كل ذلك من التأمل فى النظم الكريم ولما كان اشد الايداء من الكافرين و المنافقين بذ الله تعالى بالا مرتقوى الله تعالى و عدم خشية لهم التى تقضى احيانا الى الاطاعت و بالتوكل على الله فقال يا ايها النبى اتق الله الخ ثم صرح ببعض مقاصد السورة بقوله وما جعل ادعياءكم ابناءكم الخ جوابا من قصة زينب و ذكر قبله مثلا لتأييده بقوله ما جعل الله لرجل من قلبين فى جوفه وما جعل ازواجكم اللائى تظاهرون منهن امهاتكم ثم اشار الى ان نفى الابوة الصورة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يستلزم نفى الابوة المعنوية بل هو اقرب من الالباء فى هذه المرتبة فقال النبى اولى بالمؤمنين الخ ثم لما كان لنبى صلى الله عليه وسلم ولاية مع جميع المؤمنين ما المؤمنين كلهم اولياء بعضهم لبعض فاورثت شبهة التوارث بين كلهم فدفعها الله تعالى بقوله والوارحام الخ اى مدار التوارث الرحم لاهذه الولاية المعنوية ثم اكدا الله تعالى ما امره به من اتباع ما يوحى بقوله واذاخذنا من النبىين ميثاقهم الخ ببيان وقوع السؤال عن التبليغ فوجب الاتباع وعدم الخوف من الطاعنين ثم شرع الله تعالى فى حكاية غزوة الاحزاب فبقوله وانزل الذين ظاهروهم الخ ثم ذكر طلب الازواج الزيادة فى الانفاق والجواب عنه بقوله

ا ختم السورة ببيان الوعيد للمكذبين الرسول و بين فيهذه حقوقه عليهم السلام من تصديقا و تعظيمه مفصلاً وبينهما من انتقابل ما لا يحق ١٢ منه عفى عنه

يايها النبي قل لازواجك الخ ثم شرع في قصة زينب بقوله وما كان لمؤمن ولا مؤمنة الخ
ثم ذكر الله تعالى حقوقه و حقوق نبيه على المؤمنين ليزدادوا تعظيماً له واجلاً لا ولالودوه
فقال يايها الذين امنوا اذكروا الله الى قوله سراجاً منيراً ثم امر نبيه بشارة المؤمنين المعظمين لو
وانذار المنكرين المؤذنين له بقوله وبشر المؤمنين الخ ثم اراد الله ان يذكر بعض احكام النكاح
لنبيه عليه السلام التي لها شأن خاص تشعد باجلاله ومحبوبيه لله تعالى في قوله يايها النبي
انا احللنالك الخ و ذكر قبلها بعض الاحكام النكاحية المتعلقة بالمؤمنين ليظهر التفاوت
بين النبي والامة بكون الاحكام المتعلقة بالامة عامنة وبالنبي خاصة فقال يايها الذين امنوا
اذا نكحتم الخ ثم ذكر مسألة دخول بيوت النبي والحجاب بقوله يايها الذين امنوا لا تدخلوا الخ
ثم بين متمم مسألة الحجاب بقوله لا جناح عليهن الخ ثم امر بالصلوة على النبي صلى الله
عليه وسلم لا كمال احترامه فقال ان الله وملئكته الخ ثم ذكر الوعيد على ايداء الرسول
ونبه على ان ايداء ه كابداء ه تعالى فقال ان الذين يؤذون الله الخ ثم ذكر بعض افعال
المنافقين من التعرض للجوارى الذى يتأذى به النبي صلى الله عليه وسلم والمؤمنون وارشد
الى سد بابيه فقال يايها النبي قل لازواجك وبناتك الخ ثم ذكر سؤالهم عن الساعة الذى
قصدوا به تكذيب النبي صلى الله عليه وسلم و ايداء ه فقال يستلك الناس عن الساعة الخ
ثم ختم السورة بالتصريح بالنهى عن ايداء ه عليه السلام بقوله يايها الذين امنوا لا تكونوا
كالذين اذوا موسى الخ ثم لمانهى الله تعالى عما يؤذى النبي صلى الله عليه وسلم امرهم
بما ينبغي ان يصدر عنهم فقال يايها الذين امنوا اتقوا الله الخ ثم بينا ان ما نكلفكم به انما
تحملتموه من انفسكم لانا حملناكم فقال انا عرضنا الامانة الخ ثم ذكر حال الذين ادوا حق
الامانة والذين لم يودوه فقال ليعذب الله المنافقين الخ والحمد لله تعالى على ما القى في
روعى من تقرير الارتباط فيما بين آيات هذه السورة.

سورة سبا

الحمد لله الذي له ما في السموات الخ قال المسكين صدر السورة بتقرير التوحيد الذي من الاصول العظيمة الدين وقال الذين كفرو الخ قال المسكين ذكر امر الساعة اثر التوحيد كما هو العادة الشائعة في القرآن ولذكر الساعة ههنا مناسبة خاصة لامر التوحيد لانه حكمفي الاية الاولى باثبات الحمد له تعالى في الآخرة وقد انكر الآخرة قوم فتصدى لاثباتها ليجزى الذي امنوا الخ قال ابو السعود علة لقوله تعالى لتاتينكرو بيان لما يتضى اثباتها والذين سعوا في اياتنا الخ لما بين حال المؤمنين يوم القيمة بين حال الكافرين ويرى الذين اوتوا العلم الخ قال ابو السعود مستأنف مسوق للاستشهاد باولى العلم على الجهلة الساعين في الايات وقال الذين كفرو الخ قال المسكين حكاية لقول منكرى الساعة بل الذين لا يؤسسون قال ابو السعود جواب من جهة الله تعالى عن ترديدهم الوارد على طريقة الاستفهام بالاضراب عن شقه والبطالهما واثبات قسم ثالث كاشف عن حقيقة الحال ناع عليهم سوء حالهم الم يروا الى ما بين ايديهم الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لتحويلها اجتروا عليه من تكذيب آيات الله تعالى واستعظام ما قالوا في حقه عليه الصلوة والسلام وانه من العظائم الموجبة لنزول اشد العقاب و حلول افطع العذاب من غير ريث و تاخير ان نشأنخسف الخ قال ابو السعود بيان لما سبني عنه ذكر حاطتهما من المحذور المتوقع من جهتهما ولقد اتينا داؤد الخ لما ذكر الله تعالى من ينيب من عباده ذكر منهم من اناب و اصاب و من جملتهم داؤد كما قال تعالى عنه فاستغفر ربه و خر را كعا و اناب و بين ما اتاه الله على انابة ثم لما ذكر المنيب الواحد ذكر منيبا آخر وهو سليمان كما قال تعالى

١ لما ذكر في خاتمة ما قبلها جزاء الحافظين للامانة والمضيعين لها ذكر في اول هذه وقت الجزاء وهو الساعة واعظم الامانات وهو التوحيد ١٢ منه عفى عنه

و القينا على كرسية جسد اثم اناب و ذكر ما استفاد هو بالانابة فقال و لسيمان الريح الخ
قال تعالى لقد كان لسبأ الخ لما بين الله حال الشاكرين لنعمه بذكر داود سليمان بين حال
الكافرين بانعمه بحكاته اهل سبا ولقد صدق عليهم الخ قال المسكين بيان لكونهم متبعين
لابليس في كفرهم و كون المؤمنين بمعزل عن ذلك والحكمة في تسليته عليه قل ادعوا
الذين الخ قال المسكين عود الى التوحيد في هيئة المناظرة التي لا اعتسان فيها كما قال
تعالى و انا و اياكم لعلى هدى او فى ضلل مبين الخ وما ارسلناك الا كافة الخ لما بين مسألة
التوحيد سرع في الرسالة و يقولون متى هذا الوعد الخ لما ذكر الرسالة بين الحشر وما
ارسلنا في قرية قال ابوالسعود تسليته لرسول الله صلى الله عليه وسلم مما منى به من
قوله من التكذيب والكفر بما جاء به والنافه بكثرة الاموال والاولاد والمفاخرة بحفظ
الدين وزخارفها والتكبر بذلك على المؤمنين والاستهابة بهم من اجله قل ان ربي الخ
قال ابوالسعود عليهم و حسم لمادة طمعهم الفارغو تحقيق للحق الذي عليه يدور امر التكوين
وما اموالكم الخ قال ابوالسعود كلام مستأنف من جهة غرو علاخوطب به الناس بطريق
التلوين والالتفات مبالغة في تحقيق الحق. و تقرير ماسبق والذين يسعون الخ قال المسكين
بيان لان الاموال لا تجدى نفعا للكفار المحضرين وما انفقتم من شىء الخ قال المسكين
بيان لنفع الاموال للمؤمنين خلاف ما عليه الكفار و يوم يحشرهم جمعا الخ قال المسكين
تتمة لمسئلة الحشر و اذا تتلى عليهم الخ قال المسكين عود الى مسألة الرسالة و تقرير
دليل لرساله من الايات القرانية واثبات حقيقتها ولوترى اذ فرعوا الخ قال المسكين بيان
لوضوح خطاهم اذا اكشف العطاء و تحسروهم حينئذ حيث لا ينفع الندم.

سورة فاطر

الحمد لله فاطر السموات الخ قال المسكين بذاك الكلام بالتوحيد ببيان الخالقية والقدرة ونفوذ المشيئة ونفاذ الامرو الرازقية وان يكذبوك الخ لما بين الاصل الاول وهو التوحيد ذكر الاصل الثانى وهو الرسالة فقال تعالى و ان يكذبوك الخ ثم بين الاصل الثالث وهو الحشر فقال تعالى يا ايها الناس ان وعد الله حق الخ ثم قال تعالى ان الشيطان لكم عدو الخ لما قال ولا يغرنكم ذكر ما يمنع العاقل من الاغترار ثم بين الله تعالى حال حزبه و حال حزب الله فقال الذين كفروا افمن زين له سوء عمله الخ قال ابو السعود تقرير لما سبق من التباين بين عاقبتى الفريقين ببيان تباين حالهما الوديين الى تينك العاقبتين والله الذى ارسل الخ قال المسكين دليل على صحة ابعد كما يدل عليه قوله تعالى كذلك النشور من كان يريد العزة الخ قال المسكين بيان لما يتعزز به العبد عند الله تعالى من التوحيد والعمل الصالح وما يتدلل به من المكرا السيئ والكفرون كان ظهور هذه العزة والذلة يوم الحشر ناسب ذكره بعده والله خلقكم من تراب الخ قال المسكين عود الى التوحيد بحيث يتضمن الاستدلال على صحة البعث من كيفية بخلق الانسان وايلاج الليل فى النهار وبا لعكس وجريان كل من الشمس والقمر لاجل مسمى و بين فى اثناءه مثلا لعدم استواء المؤمن والكافر فى قوله وما يستوى البحران يا ايها الناس انتم الفقراء الخ قال المسكين بيان لما يحمل العبد على التوحيد من فقره اليه تعالى وقدرته تعالى عليه بالتبديل ان شاء و انحصار الفقرا الى الله تعالى ببيان ان احدا لا يجدى احدا يوم القيامة ولو كان ذا قربى ثم لما كان اصرار الكفرة مع هذه الدلائل يؤذى النبى صلى الله عليه وسلم اشد الايذاء بين الله تعالى

ا كانت السورة المتقدمة قد ختمت بتقرير الرسالة والوعيد لمن انكرها وهذا السورة قد بدئت بالتوحيد وتلاصقهما غنى عن البيات ۱۲ منه عفى عنه

لستلية عليه السلام اختلاف احوال الناس في استعدادهم لقبول الحق واوضحه بقوله وما يستوى الاعمى والبصير وارشده عليه الاسلام بان لا يهتم بهم فان عليه الرسالة فقط وما هو باول من كذب من الرسل الم تر ان الله انزل من السماء ماء الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتقرير ما قبله من اختلاف احوال الناس ببيان ان الاختلاف والتفاوت امر مطرد في جميع المخلوقات من الثبات والجمادى والحيوان انما يخشى الله قال ابو السعد تكملة لقوله تعالى انما تنذر الذين يخشون ربهم بالغيب ان الذين يتلون الخ قال المسكين بيان لثمرات الخشية من الايمان والاعمال الصالحة مع بيان جزاءها من التجارة التي لن تبور ثم لتقرير قوله يتلون كتاب الله قال تعالى والذي اوحينا اليك من الكتاب الخ ولتفصيل قوله تجارة لن تبور قال جنات عدن يدخلونها الخ ثم قال تعالى والذين كفروا لهم نار جهنم الخ عطف على قوله ان الذين يتلون كتاب الله وما بينهما كلام متعلق بالذين يتلون الكتاب ان الله عالم غيب الخ قال المسكين عود الى التوحيد ببيان كما لاته العلمية كما في هذه الاية وكمالاته العملية كما في قوله الاتى هو الذى جعلكم الخ قل ارايتم شركاء كم الخ تقرير للتوحيد وابطال للاشراك ان الله يمسك السموات الخ لما بين انه لا خلق للاصنام ولا قدرة لها على جزء من الجزاء بين ان الله قد بقوله ان الله يمسك الخ ويحتمل ان يقال لما بين شركهم قال مقتضى شركهم زوال السموات والارض كما قال تعالى تكاد السموات يتفطرن منه وتنشق الارض الخ ويدل على هذا قوله فى اخر الاية انه كان حليما غفورا. واقسموا بالله الخ قال المسكين بيان لقبح كفرهم ان كفروا بعد ان اقسموا الخ ثم اوعدهم بسنة الاولين على الكفر فى قوله فهل ينظرون الخ ثم بين فى قوله ولو يؤاخذ الله الخ ان لا يغتروا بالامهال بل

سورة يس

يس والقرآن الحكيم الخ قال المسكين مدار الكلام على اثبات رساله بالقسم والغرض من الرسالة من الانذار والاشارة الى الدليل عليها من القران و بيان ما على الرسول من الانذار فقط لا الجبر على الهداية و انما امرها الى الله تعالى و قد حق القول على اكثرهم انهم لا يؤمنون و بيان منعهم عن الايمان و بيان ان المنتفعون بالانذار من هم و هذا كله مذكور الى قوله اجر كريم كما يظهر بالتأمل انا نحن نحى الموتى الخ قال ابو السعود بيان لسان عظيم ينطوى على الانذار والتبشير انطواء اجماليا واضرب لهم مثلا الخ قال الله انك لمن المرسلين و قال لتذر قال قل لهم ما كنت بدعاً من الرسل بل قبلى بقليل جاء اصحاب القرية مرسلون يا حسرة على العباد الخ قال المسكين تلهف على التكذيب اثر اقتصاص حال المكذبين الم يروا كم اهلكنا الخ لما بين الله تعالى حال الاولين قال للحاضرين الم يروا الخ وان كل لما جميع الخ قال ابو السعود بيان لرجوع الكل الى المحشر بعد بيان عدم الرجوع الى الدنيا واية لهم الارض الخ مناسب لما قبله من وجهين احدهما انه لما قال و ان كل لما جميع لدينا محضرون كان ذلك اشارة الى الحشر فذكر ما يدل على امكانه و ثانيهما انه لما ذكر حال المرسلين و كان شغلهم التوحيد ذكر ما يدل عليه و اذا قيل لهم اتقوا الخ قال ابو السعود بيان لاغراضهم عن الايات التنزيلية بعد بيان اغراضهم عن الايات الافاقية التى كانوا يشاهدونها و اذا قيل لهم انفقوا الخ قال المسكين بيان لشناعتهم الاخرى اشد من الاولى فان الانكار لقدرة الله الذى هو الغرض من كلامهم

اے كان الله تعالى فى خاتمة فاطر قد اخبر عن قولهم لنن جاء هم نذير ليكونن اهدى من احدى الامم و قد قرر فى اول يس عليه الصلوة والسلام نذير احمد منه عفى عنه

لا الامتناع من الاله ناع اشد من الاحراض عن ايات الله فكانه دليل لمضمون الاية السابقة
 اى اذا اتوا بالانكار فای استبعاد فى الاعراض و يقولون متى هذا الوعد الخ قال المسكين
 عود الى مسئلة الحشر فهو مرتبط بقوله و ان كل لما جميع لدينا محضرون و امتد هذا
 الى قوله اليوم نختم على افواههم الاية و لو نشاء لطمسنا الخ قال المسكين هذا تقريب
 لوقوع الختم يوم القيامة اى لو نشاء لا وقعنا الطمس و المسخ فى الدنيا جزاء على كفرهم
 لكننا لم نشأ و نشاء الختم يوم القيامة فيقع ثم استدل على تقريب الطمس و المسخ بقوله
 تعالى و من نعمه ننكسه فان هذا التغيير قريب من تغيير المسخ و الطمس فالقادر على
 واحد قادر على اخر و ما علمناه الخ لما ذكر الاصلين الواحدانية و الحشر ذكر الاصل
 الثالث و هو الرسالة ثم انه تعالى اعاد الواحدانية و دلائل دالة عليها فقال تعالى اولم يروا
 انا خلقنا الخ و قوله فلا يحزنك قولهم الخ اشارة الى الرسالة لان الخطاب معه ما يوجب
 تسلية قلبه دليل اجتنابه و اختياره اياه اولم ير الانسان الخ قال ابوا السعود كلام مستأنف
 مسوق لبيان بطلان انكارهم البعث بعدما شاهدوا فى انفسهم اوضح دلائله و اعدل شواهده
 كما ان ما سبق مسوق لبيان بطلان اشرکهم بالله تعالى بعد ما عاينوا فيما بايديهم ما يوجب
 التوحيد و الاسلام.

سُورَةُ الصّٰفَّاتِ

قال المسكين افتتح الله تعالى هذه السورة باثبات التوحيد بعد القسم كما يدل عليه قوله تعالى ان الهكم لواحد ثم استدل عليه بربوبية تعالى للسموات والارض وغيرهما ثم بتزيين السماء بالكواكب بحيث يتضمن اثبات الرسالة ببيان امتناع الشياطين من الاستراق ثم شرع فى اثبات المعاد بقوله فاستفتهم اهلهم اشد خلقا الخ وامتد هذا الى قوله ثم ان مرجعهم لالى الجحيم انهم الفوا اباؤهم الخ قال ابو السعود تعليل لاستحقاقهم ما ذكر من فنون العذاب بتقليد الاباء فى الدين من غير ان يكون لهم ولا لآباءهم شىء يتمسك به اصلا ولقد ضل قبلهم الخ ذكر لرسوله ما يوجب السلية له فى كفرهم وتكذيبهم فبين تعالى انارساله للرسول قد تقدم والتكذيب لهم قد سلف ولقد نادانا نوح الخ اعلم انه تعالى لما قال من قبل ولقد ضل قبلهم اكثر الاولين و قال فانظر كيف كان عاقبة المنذرين اتبعه بشرح وقائع الانبياء عليهم السلام فالقصة الاولى حكاية نوح عليه السلام قوله لقد نادانا القصة الثانية قصة ابراهيم عليه السلام قوله تعالى و ان من شيعته لابراهيم الخ قوله تعالى ولقد مننا على موسى الخ اعلم ان هذا هو القصة الثالثة من القصص المذكورة فى هذه السورة وان الياس الخ اعلم ان هذه القصة الرابعة من القصص المذكورة فى هذه السورة وان لوطا لمن المرسلين الخ هذا هو القصة الخامسة وان يونس لمن المرسلين الخ اعلم ان هذا هو القصة السادسة وهو اخر القصص المذكورة فى هذه السورة فاستفتهم الربك البنات الخ قال ابو السعود امر الله عز وجل فى صدر السورة الكريمة رسوله صلى الله عليه وسلم تبكى قريش وابطال مذهبهم فى انكار البعث بطريق الاستفتاء وساق البراهين القاطعة بتحقيقه لامحالة و بين وقوعه وما سيلقونه عند ذلك من فنون العذاب واستتى منهم عبادة المخلصين و

١٤ قد ذكر فى خاتمة السورة المارة امر البعث متضمنا لتقرير الواحدانية والرسالة و ذكر فى فاتحة هذه دليل الواحدانية ثم عقبها بالبعث فالمناسبة ظاهرة ١٢ منه عفى عنه

فصل مالهم من النعم المقیم ثم ذکر انه قد ضل من قبلهم اکثر الاولین وانه تعالی ارسل الیهم منذرین علی وجه الاجمال ثم اورد قصص کل واحد منهم علی وجه التفصیل منها فی کل قصة منها انهم من عباده تعالی و اصفالهم تارة بالاخلاص و اخرى بالایمان ثم امره علیه السلام و الصلوة ههنا بتبکیتهم بطریق الاستفتاء عن وجه امر منکر خارج عن العقول بالکلیة و هی القسم الباطلة اللازمة لما كانوا علیه من الاعتقاد الزائغ حیث كانوا یقولون کبعض اجناس العرب جهینة و نبی سلمة و خزاعة و بنی ملیح الملئكة بنات الله و الفاء لترتیب الامر علی ما سبق من کون اولئک الرسل الذین هم اعلام الخلق علیهم الصلوة و السلام عباده تعالی فان ذلک مما یؤکد التبکیت و یتظهر بطلان مذهبهم الفاسد ثم تبکیتهم بما یتضمنه کفرهم المذکور من الاستهانة بالملئكة بجعلهم اناثا ثم ابطل اصل کفرهم المنطوی علی هذین الکفرین و هو نسبة الولد الیه سبحانه و تعالی ان ذلک علوا کبیرا ولم ینظمه فی سلك التبکیت لمشارکتهم النصاری فی ذلک و جعلوا بینهم و بین الجنة الخ قال ابو السعود التفات الی الغیبة لایذان بانقطاعهم عن الجواب سقوطهم عن درجة الخطاب و اقتضاء حالهم ان یرض عنهم و تحکی جنایاتهم لآخرین والمراد بالجنة الملئكة و انما اعيد ذکره تمهید المایعقبه من قوله تعالی و لقد علمت الجنة انهم لمحضرون الخ والمراد به المبالغة فی التکذیب ببيان ان الذین یدعی هؤلاء لهم تلک النسبة و یعلمون انهم اعلم منهم بحقیقة الحال یکذبونهم فی ذلک و یحکمون بانهم معذبون لاجله حکما مؤکدا قوله سبحانه الله عما یصفون حکایة تنتزیه الملئكة اياه تعالی عما وصفه المشرکون به بعد تکذیبهم لهم فی ذلک و قوله تعالی الاعداد الله المخلصین شهادة منهم ببراءة المخلصین من ان یصفوه تعالی بذلک و قوله تعالی فانکم و ماتعبدون الخ تعلیل و تحقیق لبراءة المخلصین مما ذکر ببيان عجزهم عن اغوائهم و اضلالهم و قوله تعالی و ما منا الاله مقام الخ تبیین لجلية امرهم و تعیین لحیزهم فی موقف العبودية بعد ما ذکر من تکذیب الکفرة فیما قالو او تنزیه الله تعالی عن ذلک و تبرئة المخلصین عنه و اظهار لقصور شانهم و قماء تهم هذا هذا هو الذی یقتضیه جزالة التنزیل انتهى مقال ابی السعود و ان كانوا یقولون الخ قال المسکین تعیر للکافر فی کفرياتهم المذکورة و غیر المذکورة بانهم فی هذا یاناتهم کلها ناقضون للعهدنا کثون للوعد فیالها من عار و شامع اهلیتهم للنار و لقد سبقت کلمتنا الخ

قال ابو السعود استيناف مقرر للوعيد و تول عنهم حتى حين الخ قال ابو السعود تسلية
لرسول الله صلى الله عليه وسلم اثر تسلية و تأكيد لوقوع الميعاد غب تأكيد سبحان ربك الخ
قال ابو السعود تنزيه لله سبحانه عن كل ما يفصه المشركون به مما لا يليق بجناب كبريائه
وجبروته مما ذكر فى السورة الكريمة ومالم يذكر وقوله تعالى وسلام على المرسلين.
تشرىف لهم عليهم السلام بعد تنزيهه تعالى عما ذكر و تنويه بشأنهم واذا ان بانهم سالمون
عن كل المكارة فائزون بجميع المارب وقوله تعالى والحمد لله رب العالمين الى وصفه
عز وجل بصافته الكريمة الثبوتية بعد التنبيه على اتصافه بجميع صفاته السلبية.

سورة ص

والقرآن ذی الذکر الخ قال المسکین افتتح السورة بتنویہ شان القرآن وجواب القسم محذوف ای انه لحق او نحوه بل الذین کفروا الخ قال ابو السعود اضراب کانه قيل لاریب فیه قطعاً وليس عدم اذعان الکفرة له لشائبة ریب ما فیه بل هم فی استکبار وحمية شديدة و شقاق بعید الله تعالى ولرسوله ولذلك لا یذعنون له کم اهلکنا من قبلهم الخ قال ابو السعود وعیدلهم علی کفرهم واستکبارهم ببيان ما اصاب من قبلهم من المستکبرین. وعجبوا ان جاءهم الخ قال ابو السعود حکایة لاباطیلهم المتفرعة علی ما حکى من استکبارهم وشقاقهم قال المسکین ومخلص اباطیلهم هذه انکار النبوة ثم ذکر الجواب عنها بقوله بل هم فی شک من ذکرى الی قوله فلیر تقوا فی الاسباب جند ما هنالك الخ قال المسکین هو تسلیة لرسول الله صلى الله علیه وسلم بانهم جند ما من الکفار المتحزبین علی الرسل مهزوم مکسور عما قریب فلا تبال بما یقولون ولا تکثر بما یهدون کذبت قبلهم الخ قال ابو السعود استیناف مقرر لمضمون ما قبله ببيان احوال العتاة الطغاة الذین هؤلاء جند ما من جنودهم مما فعلوا من التکذیب و فعل بهم من العقاب ان کل الاکذب الخ قال ابو السعود استیناف جئ به تقرير التکذیبهم وبياناً لکیفیه و تمهید السماء یعقبه وما ینظر هؤلاء الخ قال ابو السعود شروع فی بیان عقاب کفار مکة اثر بیان عقاب اضرابهم من الاحزاب وقالوا ربنا عجل لنا الخ قال ابو السعود حکایة لما قالوه عند سماعهم بتأخیر عقابهم الی الاخرة اصبر علی ما یقولون الخ قال المسکین هذا تسلیة لرسوله صلى الله علیه وسلم بتعلیم الصبر و تذکیره قصص الرسل الذین کانوا صابرين او بین اولی الایدی والابصار متحملین للشدائد فی دین الله وانجر هذا الی قوله کل من الاختیار واورد فی مطاوی القصص لتقرير البعث

۱- کان المذكور فی خاتمة ما سبق امر التوحید فی قوله سبحانه ربک الخ والرسالة فی قوله و سلام علی المرسلین الخ وهذا هو المذكور فی فاتحة هذه السورة فتأمل تستبیط ۱۲ منه عفی عنه

والحساب والجزاء الذى ذكر فى قوله وما ينظر هؤلاء الخ كلاما مستأنفا هو قوله وما خلقنا السماء والارض الخ اى خلقنا هما بالحكمة البالغة المقتضية لان لا يهمل امر الخلق سدى ثم اشار الى مال المؤمنين وانفجار فى قوله ام نجعل الذين امنوا و عملوا الصلحت الخ ثم لما كان الهأى الى هذه الاسرار والحكم هو القرآن اثنى عليه بقوله كتاب انزلناه اليك الخ ثم بعد تمام القصص عاد الى ذكر الحساب والجزاء بقوله وان للمتقين لحسن مآب الى قوله ان ذلك لحق تخاصم اهل النار ثم عاد الى ما ذكر فى اول السورة من امر التوحيد والرسالة فقال قل انما انا منذر تصريح بالرسالة وما من اله الا الله الواحد القهار الخ تصريح بالتوحيد قل هو نبأ عظيم الخ قال المسكين عود الى تنويه شان القرآن الذى اشير اليه فى صدر السورة وهو المراد بضمير هو كما يدل عليه اخر السورة من قوله قل ما اسالكم عليه من اجر الخ ما كان لى من علم بالملا الأعلى الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لتحقيق انه نبأ عظيم وارد من جهته تعالى بذكر نبأ من انبائه على التفصيل من غير سابقة معرفة به ولا مباشرة سبب من اسبابها المعتادة فان ذلك حجة بنية دالة على ان ذلك بطريق الوحي من عند الله تعالى وان سائر انبائه كذلك ان يوحى الى الخ قال ابو السعود اعتراض وسط بين اجمال اختصاصهم و تفصيله تقرير الثبوت علمه عليه السلام و تعيينا لسبب اذ قال ربك للملئكة الخ قال ابو السعود شروع فى تفصيل ما اجمل من الاختصاص الذى هو ماجرى بينهم من التقاول قال المسكين وايضا المقصود من ذكر هذه القصة ههنا كما فى الكبير المنع من الحسد والكبر وذلك لان ابليس انما وقع فيما وقع فيه بسبب الحسد والكبر والكفار انما نازعوا محمدا عليه السلام بسبب الحسد والكبر قل ما اسئلكم عليه الخ قال المسكين عود الى كون القرآن من عند الله تعالى وكون ما فيه حقا واقعا ولوبعد حين كما ذكرنا فى تفسير قوله تعالى قل هو نبأ عظيم فتذكر.

سورة الزمر

انا انزلنا اليك الكتاب الخ قال ابو السعود شروع في بيان شان المنزل اليه وما يحب^۱ عليه اثر بيان شان المنزل وكونه من عند الله تعالى الا لله الدين الخالص الخ قال بوا السعود استيناف مقرر لما قبله من الامر باخلاص الدين له تعالى ووجوب الامثال به والذين اتخذوا امن دونه الخ قال ابو السعود تحقيق لحقية ما ذكر من اخلاص الدين الذي هو عبارة عن التوحيد ببيان بطلان الشرك الذي هو عبارة عن ترك اخلاصه لو اراد الله الخ قال المسكين ابطال لنوع اخر من الشرك من اتخاذ الوالد له تعالى عن ذلك علوا كبيرا خلق السموات والارض الخ اعلم ان الاية المتقدمة دلت على انه تعالى بين كونه منزها عن الولد بكونه الها واحدا وقهारा غالبا اى كامل القدرة فلما بنى تلك المسئلة على هذه الاصول ذكر عقيبتها ما يدل كمال القدرة وعلى كمال استغناء وايضا فانه تعالى طعن فى الهية الاصنام فذكر عقيبتها الصفات التى باعتبارها تحصيل الالهية ان تكفروا الخ قال المسكين قطع للحجة و فصل للقول بعد ذكر فنون نعمائه وتعريف شئونه العظيمة الموجبة للايمان والشكرو اذا مس الانسان الخ اعلم ان الله تعالى لما بين فساد القول بالشرك. بين ان الله تعالى هو الذى يجب ان يعبد بين فى هذه الاية ان طريقة هؤلاء الكفار الذين يعبدون الاصنام متناقضة قل تمتع الخ قال ابو السعود تهديد لذلك الضال والمضل وبيان لحاله وماله امن هو قانت الخ قال ابو السعود من تمام الكلام المامور به كانه قيل له تاكيد للتهديد وتهكما به أنت احسن حالا ومالا ام من هو قائم بمواجب الطاعات ودائم على اداء وظائف العبادات حالتى السراء والضراء لا عند مساس الضر فقط كدأبك قل هل يستوى الخ قال ابو السعود بيان للحق

۱ كما قال تعالى بل الذين كفروا فى عزة وشقاق ۱۲ منه ۲ المذكور فى فاتحتها وخاتمته ما قبلها كون القرآن حقا منزلا من الله تعالى ۱۲ منه عفى عنه. ۳ من العبادة الخالصة المامور بها فى قوله فاعبد الله الخ ۱۲ منه ۴ اما ترتيب الامر بالعبادة على انزال الكتب لان الكتاب يامره ۱۲ منه

و تنبيه على شرف العلم والعمل قل يا عباد الخ قالوا السعود امر صلى الله عليه وسلم بتذكير المؤمنين وحملهم على التقوى والطاعة اثر تخصيص التذكر باولى الالباب ايذانا بانهم هم كما سيصرح به قل انى امرت الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم ببيان ما امر به نفسه من الاخلاص فى عبادة الله الذى هو عبارة عما امر به المؤمنون من التقوى مبالغة فى حثهم على الاتيان بما كلفوه وتمهيد الماي عقبه مما خوطب به المشركون والذين اجتنبوا الخ اعلم ان الله تعالى لما ذكر وعيد عبدة الاصنام والاثوان ذكر وعد من اجتنبا عبادتها واحترز عن الشرك ليكون الوعد مقرونا بالوعيد ابدا فيحصل كما الترغيب والترهيب الم تر ان الله انزل الخ اعلم انه تعالى لما وصف الآخرة بصفات توجب الرغبة العظيمة لاولى الالباب فيها وصف الدنيا بصفة توجب اشتداد النفرة عنها افمن شرح الله صدره الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى تقرير البيانات الدالة على وجوب الاقبال على طاعة الله وجوب الاعراض عن الدنيا بين بعد ذلك ان الانتفاع بهذه البيانات لا يكمل الا اذا شرح الله صدره ونور القلب الله نزل احسن الحديث الخ لما بين تعالى ذلك اردفعه بما يدل على ان القرآن سبب لحصول النور والشفاء والهداية وزيادة الاطمينان افمن يتقى بوجهه الخ قال ابو السعود استيناف جار مجرى التعليل لما قبله من تبائن حالى المهتدى والضال كذب الذين من قبلهم الخ لما بين الله تعالى كيفية عذاب القاسية قلوبهم فى الآخرة بين ايضا كيفية وقوعهم فى العذاب فى الدنيا ولقد ضربنا للناس الخ لما ذكر الله تعالى هذه الفوائد المتكاثرة والنفائس المتوافرة فى هذه المطالب بين تعالى انه بلغت هذه البيانات الى حد الكمال والتمام ضرب الله مثلا الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى شرح وعيد الكفار اردفع بذكر مثل ما يدل على فساد مذهبهم وقبح طريقته انك ميت الخ قال ابو السعود تمهيد لما يعقبه من الاختصاص يوم القيامة ثوم انكم يوم القيامة الخ قال المسكين هذا هو المقصود وهو مرتبط بقوله ضرب الله مثلا الذى كان تقريراً للتوحيد وهذا اختصاص فيه فمن اظلم الخ قال ابو السعود مسوق لبيان كل من طرفى الاختصاص الجارى فى شان الكفرو الايمان اليس الله بكاف الخ قال المسكين كان ماسبق بيانا لحال المحققين والمبطلين وهذا جواب عما كان المبطلون يخوفون المحققين به حيث قالو التكفن عن شتم الهتنا اوليصينك منهم خبل او جنون ولئن سالتهم الخ اعلم انه تعالى لما اطلب فى وعيد المشركين

وفى وعد الموحدين عاد الى اقامة الدليل على تزئيف طريقة عبدة الاصنام قل يا قوم اعملوا
 الخ لما اورد الله عليهم هذه الحجة التى لا دافع لها قال بعده على وجه التهديد قل الخ
 انا انزلنا عليك الخ قال المسكين هذا تسلية لقلب النبى صلى الله عليه وسلم من حزنه
 باصرار المشركين على قبائحهم ثم عاد الى اقامة الدليل على التوحيد فقال الله يتوفى الانفس الخ ثم
 ابطل عقيدتهم الشركية فقال ام اتخذوا من دون الله الخ ثم لزيادة قوة قلبه عليه السلام
 امره بادعاء بقوله قل اللهم فاطر السموات الخ اذا تحير فيا مر الدعوة وضجر من شدة شكيمتهم
 فى المكابرة والعناد ثم بين اثار الحكم الذى استدعاه النبى صلى الله عليه وسلم وغاية
 شدته وفضاعته بقوله ولو ان للذين ظلموا الخ ثم بين تناقضهم القبيح فى انكارهم للتوحيد بانهم
 لا يدومون على حال بل ينسبون الكل فى حال العجز والخاجة الى الله تعالى و يقطعون
 عن الله فى حال السلامة والصحة فقال فاذا مس الانسان ضر الخ والتناقض دليل القطع
 عن الحجة فعلم ان حجته على دعواهم الشرك داحضة فثبت التوحيد قل يا عبادى
 الذين الخ اعلم انه تعالى لما اطلب فى الوعيد ارفع بشرح كمال رحمة وفضله واحسانه
 فى حق العبيد قال المسكين وهو ايضا اراحة لما عسى ان يختلج فى صدر من امر بالتوحيد
 ان الشرك الذى مضى منا كيف يغفر فذكر الله تعالى رحمة العامة و مغفرته التامة ثم ذكر
 شرطها من التوبة والانابة و اشار فى تضاعيفه الى احوال يوم القيمة الله خالق كل شىء الخ
 اعلم انه تعالى لما اطل الكلام فى شرح الوعد والوعيد عاد الى دلائل الالهية والتوحيد
 وما قدروا الله حق قدره الخ قال المسكين تتميم للتوحيد ببيان عظمة الله تعالى و تفصيل
 لاحوال القيامة الذى كان مبذ منها قد ذكر فى آيات الانابة ثم كيفية احوال اهل العقاب
 ثم كيفية احوال اهل الثواب و ختم السورة.

سورة المؤمن

ما يجادل فى آيات الله الخ اعلم انه تعالى لما قرر ان القرآن كتاب انزله ليهتدى به فى الدين ذكر احوال من يجادل لغرض ابطاله واخفاء امره كذبت قبلهم الخ قال المسكين كشف عن معنى قوله فلا يغرك الخ الذين يحملون العرش الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الكفار يبالغون فى اظهار العداوة مع المؤمنين بين ان اشرف طبقات المخلوقات هم الملائكة الذين هم حملة العرش والحافون حول العرش يبالغون فى اظهار المحبة والنصرة للمؤمنين كانه تعالى يقول ان كان هؤلاء الارذال يبالغون فى العداوة فلا تبال بهم ولا تلتفت اليهم ولا تقم لهم وزنا فان حملة العرش معك والحافون من حول العرش معك ينصرونك ان الذين كفروا بنا دون الخ اعلم انه تعالى لما عاد الى شرح احوال الكافرين المجادلين فى الايت الله وهم الذين ذكرهم الله فى قوله ما يجادل فى آيات الله الا الذين كفروا بين انهم فى القيامة يعترفون بذنوبهم واستحقاقهم العذاب الذى ينزل بهم ويسألون الرجوع الى الدنيا ليتلافوا ما فرط منهم ذلكم بانه اذا دعى الله الخ قال ابو السعود جواب لهم باستحالة حصول ما يرجونه ببيان ما يوجبها من اعمالهم السيئة هو الذى يريكم آياته الخ قال المسكين لما علل فى الآية السابقة عذابهم باشراكهم اشار الى دلائل التوحيد وبين فى تضاعيفه احوال القيمة تتيما لما مر من بعض احوالها وامتد هذا الى قوله ان الله هو السميع البصير ولم يسيروا فى الارض الخ لما بالغ فى تخويف الكفار بعذاب الآخرة اردفع ببيان تخويفهم باحوال الدنيا ولقد ارسلنا موسى الخ اعلم انه تعالى لما سلى رسوله بذكر الكفار الذين كذبوا الانبياء قبله وبمشاهدة اثارهم سلاه ايضا بذكر قصة موسى عليه السلام وانه مع قوة معجزاته بعثه الى فرعون وهامان وقارون فكذبوه وكابروه وقالوا هو ساحر كذاب واذا يحتاجون الخ اعلم ان الكلام فى تلك القصة لما انجر الى شرح احوال النار لاجرم ذكر الله عقيها قصة المناظرات التى تجرى بين الرؤساء والاتباع

لما ختم السورة المتقدمة بذكر احوال المؤمنين والكافرين فى الآخرة بين فى اول هذه احوال الفريقين فى الدنيا من كون الكفار على شرف الهلاك وكون المؤمنين محبوبين عند الملكة حيث يدعون لهم الخ ۱۲ منه عفى عنه

من اهل النار وانا لننصر رسلنا الخ ان الكلام فى اول السورة انما وقع من قوله ما يجادل فى آيات الله الخ وامتد الكلام فى الرد على اولئك المجادلين و على ان المحققين ابدا كانوا مشغولين بدفع كيد المبطلين و كل ذلك انما ذكره الله تعالى لسلبية للرسول صلى الله عليه وسلم وتصويره على تحمل اذى قومه ولما بلغ الكلام فى تقرير المطلوب الى الغاية القصوى وعد تعالى رسوله بان ينصره على اعدائه فى الحياة الدنيا وفى الآخرة ولما بين الله تعالى انه ينصر الانبياء والمؤمنين فى الدنيا والآخرة ذكر نوعا من انواع تلك النصرة فى الدنيا فقال ولقد اتينا موسى الهدى الخ ولما بين ان الله تعالى ينصر رسله وينصر المؤمنين فى الدنيا والآخرة وضرب المثال فى ذلك بحال موسى خاطب بعد ذلك محمدا صلى الله عليه وسلم فقال فاصبر ان وعد الله حق الخ فالله ناصر ك ثم امره بان يقبل على طاعة الله ان الذين يجادلون الخ اعلم انا بينا ان الكلام فى اول هذه السورة انما ابتدئ ردا على الذين يجادلون فى آيات الله تعالى واتصل البعض البعض وامتد على الترتيب الذى لخصناه والنسق الذى كشفنا عنه الى هذا الموضع ثم انه تعالى به فى هذه الآية على الداعية التى تحمل اولئك على تلك المجادلة لخلق السموات الخ قال ابوا السعود تحقيق للحق و تبين لاشهر ما يجادلون فيه من امر البعث على منهاج قوله تعالى اوليس الذى خلق السموات والارض بقادر على ان يخلق مثلهم وما يستوى الاعمى الخ قال المسكين لما اقام الدليل على صحة البعث فقبل بعض وانكر بعض بين الفرق بينهما بمثال ان الساعة لآتية الخ لما قدر الدليل على امكان وجود يوم القيمة اردف بان اخبر عن وقوعها ودخولها فى الوجود وقال ربكم ادعوني الخ اعلم انه تعالى لما بين ان القول بالقيمة حق و صدق و كان من المعلوم بالضرورة ان الانسان لا ينتفع يوم القيمة بالبطاعة لله و كان اشرف انواع الطاعات الدعاء والتضرع لاجرم امر الله تعالى به فى هذه الآية الله الذى جعل لكم الليل الخ قال المسكين لما امر الله تعالى فى الآية السابقة بالعبادة واصل العبادة التوحيد فاقام الدلائل على التوحيد الى قوله فانما يقول له كن فيكون الم ترى الى الذين يجادلون الخ اعلم انه تعالى عاد الى ذم الذين يجادلون فى آيات الله فاصبر ان وعد الله حق الخ اعلم انه تعالى لما تكلم من اصل السورة الى هذا الموضع فى تزئيف طريقة المجادلين امر فى هذه الآية رسوله بان يصبر على اذائهم بتلك المحادلات الله الذى جعل لكم الانعام الى آخر السورة اعلم انه تعالى راعى ترتيبا لطيفا فى آخر هذه السورة و ذلك انه ذكر فصلا فى دلائل الالهية ثم اردف بفصل فى التهديد والوعيد

سورة حم السجدة

قال المسكين الاقرب ان المقصود ههنا اثبات التوحيد الذي صرح به في قوله قل انكم لتكفرون بالذي خلق الارض الخ والذي قبله من كون القرآن منزلا من الرحمن الرحيم كالتمهيد له لاشتمال القرآن على التوحيد و ذكر معه اعراض الكفار والجواب عنه والامر بالاستقامة والاستغفار ولوعيد على الشرك والوعد للمؤمنين استطرادا و ذكر ايضا في تضاعيفه ما هو المقصود من قوله انما الهكم اله واحد الخ قل انكم لتكفرون الخ اعلم انه تعالى لما امر محمد صلى الله عليه وسلم في الآية الاولى ان يقول انما انا بشر مثلكم يوحى الى انما الهكم اله واحد اردفع بما يدل على انه لا يجوز اثبات الشراكة بينة تعالى وبين هذه الاصنام في الالهية والمعبودية فان عرضوا الخ اعلم ان الكلام انما ابتدئ من قوله انما الهكم اله واحد واحتج عليه بقوله قل انكم لتكفرون و حاصله ان الاله الموصوف بهذه القدرة القاهرة كيف يجوز الكفر به وكيف يجوز جعل هذه الاجسام الخسيسة شركاء له في الالهية ولما تمت تلك الحجة قال فان عرضوا فقل انذرتكم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود و بيان ذلك ان وظيفة الحجة قد تمت على اكمل الوجوه فان بقوا مصرين على الجعل لم يبق علاج في حقهم الا انزال العذاب عليهم و يوم يحشروا عدا الله الخ اعلم انه تعالى لما بين كيفية عقوبة اولئك الكفار في الدنيا اردفع بكيفية عقوبتهم في الآخرة ليحصل منه تمام الاعتبار في الزجر والتحذير وقيضنا لهم قرناء الخ اعلم انه تعالى ما ذكر الوعيد الشديد في الدنيا والآخر على كفر اولئك الكفار و اردفه بذكر السبب الذي لاجله وقعوا في ذلك الكفر وقال الذين كفروا لا تسمعوا الخ قال المسكين بيان لتزئين كفرهم بحيث لا يودون سماع الهداية ثم بين وعيدهم بالعذاب ثم عين ذلك العذاب انه النار وقال الذين كفروا ربنا الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الذي حملهم على الكفر الموجب للعقاب الشديد مجالسة قرناء السوء بين ان الكفار عند الوقوع في العذاب الشديد يقولون ربنا ارنا الخ ان الذين قالوا ربنا الله الخ اعلم انه تعالى لما اطلب في الوعيد اردفع بهذا الوعد الشريف وهذا ترتيب لطيف مدار كل القرآن عليه و من احسن قولنا الخ قال المسكين اخذ امن الكبير و ابي السعد لما ذكر الله تعالى في اول السورة

١- مناسبة لقوله تعالى الله الذي جعل لكم الليل الخ ١٢ منه. ٢- مناسبة لقوله فاما نرينك الخ ١٢ منه.

٣- ختم السورة المتقدمة على التوحيد والتهديد وكذا افتتح هذه بالتوحيد كما قال قل انكم لتكفرون الخ وبالتهديد كما قال فان عرضوا الخ ١٢ منه عفى عنه

ما قالوه للنبي صلى الله عليه وسلم من ان قلوبنا فى اكنة و فى وسطها من قولهم لا تسمعوا
 هذا القرآن الخ و كان عليه الصلوة والسلام يتأذى بهذه الاقوال امره تعالى فى هذه الايات
 بالصبر على الدعوة ايذائهم و مقابلة اساءتهم بالاحسان و من آياته الليل والنهار الخ قال
 المسكين عود الى التوحيد و اقامة الدلائل عليه و اشار فى الاخر الدلائل الى صحة البعث
 بقوله ان الذى احيانا لمحيى الموتى الخ ان الذين يلحدون فى آياتنا الخ قال المسكين
 لما اقام الله تعالى الدلائل هدد من ينازع فى هذه الدلائل و يلحد فيها ان الذين كفروا
 بالذكر الخ قال السميع كان ما قبله بيانا للآيات التكوينية و هذا بيان للآيات التنزيلية و
 شرفها مع التسلية لرسول عليه الصلوة والسلام فى قوله ما يقال لك الا ما قد قيل الخ
 ولو جعلناه قرآنا اعجميا الخ هذا الكلام متعلق بقوله و قالوا قلوبنا فى اكنة الخ و جواب
 له و التقدير انا لو انزلنا هذا القرآن بلغة العجم لكان لهم ان يقولوا كيف ارسلت الكلام
 العجمى الى القوم العرب و يصح لهم ان يقولوا قلوبنا فى اكنة مما تدعونا اليه اى من هذا
 الكلام و فى اذاننا و قرمنه لانفهم و لانحيط بمعناه اما انزلنا هذا الكتاب بلغة العرب
 وبالفاظهم وانتم من اهل هذه اللغة فكيف يمكنكم ادعاء ان قلوبكم فى اكنة منها و فى
 اذانكم و قرمنها ولقد اتينا موسى قال ابوا السعود كلام مستأنف مسوق لبيان ان الاختلاف
 فى شان الكتب عادة قدسية غير مختص بقومك على منها بقوله تعالى ما يقال لك الا ما
 قد قيل الخ اليه يرد علم الساعة الخ اعلم انه تعالى لما هدد الكفار بقوله من عمل صالحا الخ و
 معناه ان جزاء كل احد يصل اليه فى يوم القيمة و كان سائلا قال و متى يكون ذلك اليوم
 فقال تعالى انه لا سبيل الى الخلق الى معرفة ذلك اليوم ولا يعلمه الا الله ولما بين الله
 تعالى من حال هؤلاء الكفار انهم بعد ان كانوا مصرين على القول باثبات الشركاء والاضداد
 لله تعالى فى الدنيا تبرؤا عن تلك الشركاء فى الآخرة بين ان الانسان فى جميع الاوقات
 متبدل الاحوال متغير المنهج فان احسن بخير و قدرة انتفخ و تعظم و ان احسن ببلاء و
 محنة ذبل فقال لا يستم الانسان الخ واعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد العظيم على الشرك
 و بين ان المشركين يرجعون عن القول بالشرك فى يوم القيامة ذكر عقبيه كلاما اخر
 يوجب على هؤلاء الكفار ان لا يبالغوا فى اظهار النفرة من قبول التوحيد و ان لا يفرطوا فى
 اظهار العداوة مع الرسول صلى الله عليه وسلم فقال قل ارايتم ان كان من عند الله الخ
 ولما ذكر هذه الوجوه الكثيرة فى تقرير التوحيد والنبوة وما جاب عن شبهات المشركين و
 تمويهات الضالين قال سنريهم آياتنا الخ ثم قال اولم يكف بربك الخ والمعنى الم
 تكفهم هذه الدلائل الكثيرة التى اوضحها الله تعالى و قررناها فى هذه السورة و فى كل
 سور القرآن الدالة على التوحيد والنبوة والمعاد ثم ختم السورة بقوله الا انهم فى مرية الخ
 يعنى ان القوم فى شك عظيم و شبهة شديدة من البعث والقيامة.

سورة الشورى

كذلك يوحى اليك الخ هذه المماثلة المراد منها المماثلة فى الدعوة الى التوحيد والعدل والنبوة والمعاد وتقبيح احوال الدنيا والترغيب فى التوجه الى الآخرة ولما ذكر ان هذا الكتاب حصل بالوحى بين ان الموحى من هو فقال انه هو العزيز الحكيم والصفة الثالثة قوله ما فى السموات وما فى الارض والصفة الرابعة والخامسة قوله تعالى وهو العلى العظيم تكاد السموات يتفطرن الخ لما بين ان الموحى لهذا الكتاب هو الله العزيز الحكيم بين وصف جلاله وكبريائه فقال تكاد السموات يتفطرن من فوقهن اى من هيبة وجلاله ثم قال والملائكة يسبحون بحمد ربهم ويستغفرون لمن فى الارض الخ اعلم ان مخلوقات الله تعالى نوعان عالم الجسمانيات واعظمها السموات وعالم الروحانيات واعظمها الملائكة والله تعالى يقرر كمال عظمة لاجل نفاذ قدرته وهيئته فى الجسمانيات ثم يردفه بنفاذ قدرته استيلاء هيئته على الروحانيات وقوله تعالى يسبحون بحمد ربهم اشارة الى الوجه الذى بهم الى عالم الجلال والكبرياء وقوله يستغفرون لمن فى الارض اشارة الى الوجه الذى لهم الى عالم الاجسام ثم قال تعالى والذين اتخذوا من دونه اولياء اى جعلوا شركاء وانداداً هو محاسبهم عليها انما انت منذر قال المسكين ثم بين الله كونه عليه السلام منذراً بقوله وكذلك اوحينا اليك الخ ثم بين شان اليوم الذى امر عليه السلام بالانذار منه فقال لا ريب فيه هذه صفته الاولى وقال فريق فى الجنة وفريق فى السعير هذه صفته الثانية اى هو يوم الفصل ولو شاء الله لجعلهم الخ المراد تقرير قوله والذين اتخذوا الى قوله وما انت عليهم بوكيل ثم قال تعالى ام اتخذوا من دونه اولياء اعاد ذلك الكلام على سبيل الاستنكاك ثم قال وما اختلفتم فيه من شىء الخ وجه النظم انه تعالى كما منع الرسول صلى الله عليه وسلم ان يحمل الكفار على الايمان قهر افكذلك منع المؤمنين ان يشرعوا

۱- فهو مرتبط بقوله اليه يرد علم الساعة ۱۲ منه. ۲- لما ختمت السورة المتقدمة بذكر البعث فى قوله الا انهم فى مرية من لقاء ربهم افتتح هذا السورة بذكر التوحيد وتلازمه ظاهر منه عفى عنه

معهم فى الخصومات والمنازعات قال المسكين ثم وصف الحاكم نفسه بانه هو الرب الذى يحق التوكل عليه والانابة اليه فاطر السموات والارض الى قوله انه بكل شىء عليم شرع لكم من الدين الخ اعلم انه تعالى لما عظم وحيه الى محمد صلى الله عليه وسلم بقوله كذلك يوحى اليك الخ ذكر فى هذه الاية تفصيل ذلك كبر على المشركين الخ قال ابو السعود شروع فى بيان احوال بعض من شرع لهم ما شرع من الدين القويم الله يجتبى اليه الخ قال ابو السعود استيناف واراد لتحقيق الحق وفيه اشعار بان منهم من يجيب الى الدعوة وما تفرقوا الخ قال ابو السعود شروع فى بيان احوال اهل الكتاب عقيب الاشارة الاجمالية الى احوال اهل الشرك وان الذين اورثوا الكتاب الخ قال ابو السعود بيان لكيفية كفر المشركين بالقرآن اثر كيفية كفر اهل الكتاب فلذلك فادع الخ قال المسكين تفريع على الاختلاف اى لما وقع الاختلاف وجب الدعوة الى الاتفاق مع الاستقامة والاعراض عن اهوائهم والايمان والعدل واتمام الحجة والذين يحتاجون الخ قال المسكين لماتم الله الحجة هدد من يعاند فيها بغير حق الله الذى انزل الكتاب الخ لما قرر الله هذه الدلائل خوف المنكرين بعذاب القيمة والمعنى على ما قال ابو السعود انها على جناح الايمان فاتبع الكتب واعمل به وواظب على العدل قبل ان يفاجئك اليوم الذين يوزن فيه الاعمال ويوفى جزائها يستعجل بها الذين الخ قال المسكين لما قرر امر الساعة ذكر ان لها منكرين وصدقين الله لطيف الخ قال المسكين لعله جواب عن استعجالهم اى لا تغتروا بالامهال الذى منشأه اللطف والربوبية وهذا الامهال لا يدوم لانه القوى العزيز من كان يريد الخ قال المسكين تقرير لعدم الاغترار بالعاجلة وترغيب فى الاجلة ام لهم شركاء الخ قال المسكين ذم على ردهم الشرع الذى وصحابه نوحا الخ وانكارهم للبعث ووعيد لهم بالعذاب اذا ارتفع المانع ترى الظلمين الخ قال المسكين بيان لوقوع العذاب بالظلمين وحصول الثواب لمقابلتهم وانجر هذا الى قوله غفور شكور واورد فى اثناء الكلام فى صورة لجملة المعترضة مايرى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن طلب الاجر على التبليغ ليدل على خلوصه وصدقه ووقوع ماخبر به حتماام يقولون افتري الخ اعلم ان الكلام فى اول هذه السورة انما ابتدئ فى تقرير ان هذا الكتاب انما حصل بوحي الله وهو قوله تعالى كذلك يوحى اليك واتصل الكلام فى تقرير هذا المعنى وتعلق البعض ببعض حتى وصل الى ههنا

حكى ههنا شبهة القوم وهي قولهم ان هذا ليس وحيامن الله تعالى فان يشأ الله الخ قال ابو السعود استشهاد على بطلان ما قالوا ببيان انه عليه السلام لو افترى على الله لمنعه من ذلك قطعاً وقيل المعنى ان يشاء يجعلك من المختوم على قلوبهم فانه لا يجترئ على الافتراء عليه تعالى الا من كان كذلك ومؤداه استبعاد الافتراء من مثله عليه السلام و يمحوا الله الخ قال ابو السعود استيناف مقرر لنفي الافتراء اى و من عادته تعالى انه يمحوا الباطل فلو كان افتراء كماز عموا المحقه ودفعه او عدة لرسول الله صلى الله عليه وسلم بانه تعالى يمحوا الباطل الذى هم عليه بنصرتهم عليهم وهو الذى يقبل التوبة الخ اعلم انه تعالى لما قال ام يقولون افترى الخ ثم برأرسوله ما اضافوه اليه من هذا وكان المعلوم انهم قد استحقوا بهذه القرية عقاباً عظيماً لاجرم نذبهم الله تعالى الى التوبة وعرفهم انه بقبلها من كل مسيء وان عظمت اساءته ولو بسط الله الرزق الخ اعلم انه تعالى لما قال فى الآية الاولى انه يجيب دعاء المؤمنين ورد عليه سوال وهو ان المؤمن قديكون فى شدة وبلية وفقر ثم بدعو فلا يشاهد اثر الاجابة فكيف الحال فيه مع ما تقدم من قوله ويستجيب الذين امنوا فاجاب تعالى عنه بقوله ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فى الارض ولا قدموا على المعاصى ولما كان ذلك محذوراً وجب ان لا يعطيهم ما طلبوه ولما بين تعالى انه لا يعطيهم ما زاد على قدر حاجتهم لاجل انه علم ان تلك الزيادة تضرهم فى دينهم بين انهم اذا احتاجوا الى الرزق فانه لا يمنعه منه فقال وهو الذى ينزل الغيث الخ ثم ذكر اية اخرى تدل على الهيته فقال ومن اياته خلق السموات الخ قال المسكين ثم اشار الى صحته البعث اثر بيان الالوهية كما هو الشائع فى القرآن فقال وهو على جمعهم اى حشرهم بعد البعث للمحاسبة اذا يشاء قدير ثم اشار الى انموذج المحاسبة الواقع فى الدنيا دفعا لاستبعاد المحاسبة فى الآخرة فقال وما اصابكم من مصيبة الخ ثم بين عدم قدرتهم على الهرب عن المحاسبة فقال وما انتم بمعجزين الخ ثم عاد الى ذكر دليل الالوهية فقال ومن اياته الجوار فى البحر الخ فى الكبير اعلم ان المقصود من ذكره امر ان احدهما ان يستدل به على وجود القادر الحكيم والثانى ان يعرف ما فيه من النعم العظيمة لله تعالى على العباد ثم قال تعالى ان يشأ يسكن الريح الخ والمقصود التنبيه على ان المؤمن يجب ان لا يكون غافلاً عن دلائل معرفة الله البتة واعلم انه تعالى لما ذكر دلائل التوحيد اردفها بالتنفير عن الدنيا وتحقير شأنها لان

الذى يمنع من قبول الدليل انما هو الرغبة فى الدنيا بسبب الرياسة و طلب الجاه فاذا صغرت الدنيا فى عين الرجل لم يلتفت اليها فحينئذ ينتفع بذكر الدلائل فقال فما اوتيتم من شىء الخ ثم قال وما عند الله خير و ابقى ثم بين ان هذه الخيرية انما تحصل لمن كان موصوفا بصفات ان يكون من المؤمنين الخ ومن يضل الله فماله من ولى الخ قال المسكين لما ذكر فى الايات السابقة حال المهتدين و استحقاقهم لما عند الله من الثواب ذكر فى هذه الاية حال الضالين و استحقاقهم للعذاب و الحسرة استجيبوا الربكم الخ اعلم انه تعالى لما اطنب فى الوعد و الوعيد ذكر بعده ما هو المقصود فان عرضوا الخ و ذلك تسلية من الله تعالى ثم انه تعالى بين السبب فى اصرارهم على مذاهبهم الباطلة فقال و انا اذا اذقنا الانسان الخ ولما ذكر الله تعالى اذاقة الانسان الرحمة و اصابة بضدها اتبع ذلك بقوله لله ملك السموات الخ المقصود منه ان لا يغتر الانسان بما ملكه من المال و الجاه بل اذا علم ان الكل ملك الله و ملكه و انما حصل ذلك القدر تحت يد لان الله انعم عليه به فحينئذ يصير ذلك حاملا له على مزيد الطاعة و الخدمة ثم ذكر من اقسام تصرف الله فى العالم و ما كان لبشر الخ اعلم انه تعالى لما بين كمال قدرته و علمه و حكمته اتبعه ببيان انه كيف يخص انبياءه بوحيه و كلامه قال المسكين و فى هذا جواب عن قوال اليهود للنبي صلى الله عليه وسلم الاتكلم الله و تنظر اليه ان كنت نبيا و كان مقصودهم القدح فى النبوة فازاح الله هذه الشبهة تقرير النبوة بعد تقرير التوحيد.

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

سُورَةُ الْكَهْفِ

۵	قصہ اصحاب کہف
۷	اللہ تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے
۱۰	اہل اللہ خلوت کو پسند فرماتے ہیں
۱۱	آرائش دنیا
۱۳	عورتیں زینت دنیا نہیں
۱۴	باقیات صالحات
۱۵	اعمال باقی
۱۶	دنیا کی حقیقت
۱۶	اعمال قیامت میں اپنی شکل میں ظاہر ہوں گے
۲۱	سفارش سے خضر علیہ السلام کے واقعہ سے ایک نکتہ
۲۲	حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ پر چند اشکالات اور لطیف جواب
۲۴	شیطان کا منقش اشیاء کا حال معلوم کر لینا منافی عصمت نہیں
۲۴	دوسری آیت میں لک بڑھانے کا سبب
۲۵	عدم مناسبت کے سبب علیحدگی
۲۵	آباؤ اجداد کی برکت سے اولاد کو نفع پہنچتا ہے
۲۶	لم دریافت کرنے کا منشاء کبر ہے
۲۶	آداب شیخ
۲۷	حق تعالیٰ شانہ نے اپنا نام لینے کیلئے القاب و آداب کی شرط نہیں لگائی

۲۷

سبب قسم

۲۸

مسئلہ تقدیر کی تعلیم

سُورَةُ مَرْيَمَ

۳۰

ممنوع نام رکھنے کا رواج عام

۳۱

حق سبحانہ و تعالیٰ کی بے انتہا شفقت

۳۳

حکم استقامت عبدیت

۳۴

تخصیص کی نفی

۵

مقام طالب و مطلوب

۳۶

حب مال کے اثرات

۳۷

شرف باسم شرف مسمیٰ کی دلیل ہے

۳۸

حب مال و حب جاہ

۳۹

طریق نجات

۴۰

ودا کا مفہوم

۴۰

محبوبیت کا باطنی سبب

۴۱

ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل

سُورَةُ طه

۴۲

اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مفہوم

۴۳

عرش اللہ تعالیٰ کا مکان نہیں ہے

۴۴

تجلی کی معنی

۴۴

حوادث اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مظاہر ہیں

۴۵

نماز کا ایک عظیم ثمرہ

۴۶

نماز کی روح

۴۷

امور طبعیہ کے مؤثر ہونے میں حکمتیں

۴۷	قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر
۴۸	حق تعالیٰ سے ہم کلامی
۴۹	حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی
۴۹	امور طبعیہ فطری چیز ہیں
۵۱	فرعون کا روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے
۵۲	ولایق الساحر پرشبہ
۵۳	ایک شبہ کا حل
۵۳	ساحران موسیٰ علیہ السلام کا ایمان کامل
۵۴	دنیا کی تمام اشیاء کا مقصود
۵۵	تصور شیخ کا مقصود
سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ	
۵۶	علماء انبیاء کے وارث ہیں
۵۷	صرف کمال علمی مدح نہیں
۵۸	خشوع عمل قلب ہے
۵۹	شمس و قمر وغیرہ کے جہنم میں ڈالنے کا سبب
۶۱	ارض جنت
۶۲	جاہ کیلئے خواہش سلطنت مذموم ہے
۶۳	شان رحمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سُورَةُ الْحَجِّ	
۶۶	ارض و سموات، شمس و قمر وغیرہ سب مطیع ہیں
۶۷	صورۃ تعذیب
۶۸	مکہ میں معاصی کا گناہ اور مقامات سے زیادہ ہے
۶۹	حق سبحانہ و تعالیٰ کا ایک بڑا انعام

۷۱	اسلام کا حاصل
۷۲	تین بڑے اعمال
۷۳	علامات دین کی تعظیم کا سبب
۷۴	قاعدہ کلیہ
۷۴	مفہوم شعار
۷۴	تعظیم شعار
۷۵	اہل ظاہر کی غلطی
۷۵	قربانی کرنے والوں کی اقسام
۷۵	روح قربانی
۷۶	حکمت تکبیر
۷۷	تکبیر تشریق
۷۸	کذب اخبار میں ہوتا ہے
۷۹	مقدار یوم بعث الف و خمسين الف میں تطبیق عجیب
۸۳	صلح کا حاصل
۸۳	اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کی اجازت نہیں
۸۵	دین اور دشواری
۸۶	اسرار شریعت
۸۶	ملت ابراہیمی دراصل ملت محمدیہ ہی ہے

سورة الْمُؤْمِنُونَ

۸۷	خشوع لوازم ایمان سے ہے
۸۸	پابندی صوم و صلوٰۃ کے باوجود خشیت خداوندی
۸۹	قیامت کے دن تک
۸۹	حق سبحانہ و تعالیٰ کیلئے صیغہ واحد کا استعمال خلاف ادب نہیں
۹۰	عباد مقبولین کا کام صبر ہے

سُورَةُ النُّورِ

۹۲	آیت سرقہ السارق کی اور آیت زنا میں الزانیہ کی تقدیم میں حکمت
۹۳	واقعہ افک پر منطقی اشکال کا جواب
۹۴	سُوْنِ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے
۹۴	بے تحقیق کوئی بات کرنا بڑا جرم ہے
۹۴	بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے
۹۶	بلا تحقیق بات کرنا بہتان ہے
۹۷	گناہ کو صغیرہ سمجھنا
۹۸	قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت
۱۰۰	شکایت سے متاثر نہ ہونا
۱۰۱	کشف بلا تلخیص بھی حجت نہیں
۱۰۱	قانون خدا میں جھوٹا
۱۰۲	حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا
۱۰۲	منتہی سلوک کا مقام
۱۰۳	محبت آمیز نکیر
۱۰۴	ضروری تعلیم
۱۰۵	صفات نسواں
۱۰۶	کمالات دین دنیا
۱۰۸	علم و عمل
۱۰۹	صفات نسواں
۱۱۰	مسئلہ استیذان
۱۱۰	معاشرت کا ایک علمی نکتہ
۱۱۲	حفاظت شرم گاہ کا بہترین ذریعہ
۱۱۲	پردہ کی ضرورت

۱۱۴	مراقبہ خشیت
۱۱۵	سمت امن
۱۱۵	نظر بد سے بچنا غیر اختیاری نہیں
۱۱۶	ظلمت معصیت
۱۱۷	چہرہ اور بازوؤں کے پردہ میں داخل ہونے کی مدلل بحث
۱۲۱	نور چراغ سے تشبیہ
۱۲۲	لفظ نور کا معنی
۱۲۲	خلاصہ آیت
۱۲۳	اعمال قرب حق سبحانہ و تعالیٰ
۱۲۳	انوارات مقصود نہیں
۱۲۶	مؤمن کا مال اصلی
۱۲۷	آیت کی تفسیر
۱۲۷	ذکر اللہ
۱۲۸	سلوک کی ابتداء
۱۲۹	ادب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
۱۳۰	ادب کا مدار عرف پر ہے

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

۱۳۲	اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہ ہونے میں حکمت اور مصلحت
۱۳۲	حق تعالیٰ شانہ کے دیکھنے اور سننے کا مراقبہ
۱۳۳	قرآن مجید کے تدریجاً نزول میں حکمت
۱۳۴	سابقہ کتب کا نزول دفعی میں حکمت
۱۳۵	شریعت میں سخت مرض کا بھی آسان علاج ہے
۱۳۶	تبدیل سیئات کی متعدد تفسیریں
۱۳۷	توبہ کا طریق

۱۳۸	نیک اعمال کی تاکید
۱۳۹	تبدیل ملکات کی حقیقت
۱۴۰	توبہ کا طریق
۱۴۱	گنہگاروں کو بشارت

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

۱۴۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کیلئے رسول بنانے کی دعاء میں حکمت؟
۱۴۴	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساحران موسیٰ کو اجازت دینے کا راز
۱۴۵	اصحاب موسیٰ بوجہ ضعیف الیقین معیت حق سے محروم تھے

سُورَةُ النَّملِ

۱۴۸	سماع موتی اور اہل قبور سے فیض کا ثبوت
۱۴۹	وصال نبوی کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ
۱۴۹	حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

سُورَةُ الْقَصَصِ

۱۵۰	ازالہ خوف و حزن کی تدبیر
۱۵۱	ضبط نفس کی تعلیم
۱۵۲	قواعد شرعیہ جامع مانع ہوتے ہیں
۱۵۳	کبھی معمولی غلطی پر بھی گرفت ہو جاتی ہے
۱۵۴	اختیاری غم ممنوع ہے اضطراری نہیں
۱۵۸	خوف و حزن کا بقاء اختیاری ہے
۱۵۸	درجات خوف و حزن
۱۵۹	خوف و حزن کے دو درجے
۱۶۰	طبعی خوف نبوت و کمال کے منافی نہیں

۱۶۰	حربی کے قتل کو ناجائز قرار دینے کا سبب
۱۶۱	نمرود و فرعون خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے
۱۶۲	شان موسویت
۱۶۳	صاحب حق مرعوب نہیں ہوتا
۱۶۴	مذمت ترجیح ہوئی
۱۶۵	اقسام ہوئی
۱۶۶	ضرورت قصد اصلاح
۱۶۷	عزم اصلاح
۱۶۸	شان نزول
۱۶۸	اختیار تکوینی اور تشریعی صرف اللہ کیلئے ہے
۱۶۹	حقیقت رجاء
۱۷۰	طب علوم مطلقاً مذموم ہے
۱۷۱	سوائے ذات باری کے سب فانی ہیں

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

۱۷۲	مصائب کی حکمت جلی اور خفی
۱۷۵	دعویٰ اور دلیل
۱۷۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے روایت باری تعالیٰ کا اثبات
۱۷۶	امتحان کی حقیقت
۱۷۷	امتحان سے مقصود مدعی کو خاموش کرنا ہوتا ہے
۱۷۸	رجاء کا مفہوم
۱۸۰	رجاء و امکان
۱۸۰	صفات خداوندی
۱۸۱	نصیحت ناصح
۱۸۲	عمل بغیر ایمان کے مقبول نہیں

۱۸۲	کفر و شرک پر اتفاق نا اتفاقی سے بدتر ہے
۱۸۳	شب قدر میں معمولات سلف
۱۸۳	نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے سے روکتی ہے
۱۸۴	ایک عجیب تفسیری نکتہ
۱۸۴	اللہ کا بتلایا ہوا راستہ
۱۸۵	نماز کی روح
۱۸۵	ذکر اللہ کی ضرورت
۱۸۷	ذکر اللہ ہی اصل مقصود ہے
۱۸۸	آیات بینات
۱۸۹	حقیقت دنیا
۱۹۱	دنیا کے مذموم
۱۹۲	مقصود طریق
۱۹۵	اصل مطلوب رضائے الہی ہے
۱۹۵	مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے
۱۹۵	وصول میں دیر نہیں لگتی

سُورَةُ الرُّومِ

۱۹۶	یہ آیت کفار کے لئے مخصوص ہے
۱۹۷	مومن و کافر کی تفریق
۱۹۷	تسمیہ و ن کی تفسیر
۱۹۸	فضل و رحمت
۱۹۹	نکاح کا اصل موضوع لہ
۱۹۹	جوش کا کم ہونا کمال محبت کی دلیل ہے
۲۰۰	معاملہ نکاح میں دلائل قدرت
۲۰۱	مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

۲۰۱	نکاح میں آیات کثیرہ
۲۰۱	عورت باورچن نہیں
۲۰۱	مودۃ ورحمة کا مفہوم
۲۰۱	زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں
۲۰۲	مستورات پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا بے رحمی ہے
۲۰۳	عورتوں کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں
۲۰۳	لیل و نہار کا تعلق عام ہے

سُورَةُ لُقْمَانَ

۲۰۴	حقوق والدین
۲۰۵	ایک جدید مرض اور اس کا علاج
۲۰۵	اتباع کا صحیح معیار
۲۰۵	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتباع وحی کا حکم
۲۰۷	خفی کہلانے میں کوئی قباحت نہیں
۲۰۷	حضرت مجتہدین کا اتباع
۲۰۹	آثار تکبر اور اس کی مذمت
۲۱۰	منکرین تو حید سے شکایت
۲۱۲	تسخیر کا مفہوم
۲۱۳	نعمت کی دو قسمیں ظاہرہ و باطنہ
۲۱۵	جدال کی دو قسمیں
۲۱۵	فضائل علم

سُورَةُ الْأَحْزَابِ

۲۱۷	ایک شخص میں دو دل ممکن ہیں یا نہیں
۲۱۸	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فطانت

۲۱۸	عشق و محبت
۲۲۰	نقشبندیہ اور چشتیہ کے الوان میں مناسبت
۲۲۱	نبی کی بیبیوں سے زنا کا صدور نہیں ہوتا
۲۲۲	ازواج مطہرات کی فضیلت کا سبب
۲۲۲	عورت کی تہذیب
۲۲۳	ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں
۲۲۵	اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے
۲۲۷	ایک مخلص کی حکایت
۲۲۸	ذکر اللہ کی اہمیت
۲۲۸	امور معاشیہ میں بھی احکام کی پابندی ضروری ہے
۲۲۸	فروج کا معنی
۲۲۹	والحفظین فروجہم کا سلیس ترجمہ
۲۲۹	حضرت زینبؓ سے نکاح کے شبہ کا ازالہ
۲۳۱	عوام کی رعایت کو سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے
۲۳۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے روحانی والد ہیں
۲۳۳	ازواج مطہرات مؤمنین کی مائیں ہیں
۲۳۴	کثرت ذکر اللہ کا حکم
۲۳۵	صبح و شام ذکر الہی کا مفہوم
۲۳۵	اعتدال شریعت
۲۳۶	رسول اکرم ﷺ کی ایک خاص صفت کی تشبیہ کا مفہوم
۲۳۷	مشبہ بہ کا مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں
۲۳۷	حضور ﷺ کو آفتاب یا چاند سے تشبیہ نہ دینے کی وجہ
۲۳۸	جامع کمالات
۲۳۹	محبت اور خلعت میں فرق

۲۴۰	حضور ﷺ میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے
۲۴۱	درویش شریف پڑھنے کا اجر و ثواب بلا استحقاق ہے
۲۴۲	مشقت اور الجھن دفع کرنے کا طریق
۲۴۳	خشیت الہی پیدا کرنے کی ضرورت
۲۴۵	خوف حاصل ہونے کا طریقہ
۲۴۶	محبت الہی حاصل ہونے کا طریقہ
۲۴۷	کونسا نفع قابل تحصیل ہے
۲۴۸	اصل مابہ الامتیاز محبت ہے
۲۴۸	محبت سبب حمل امانت ہے
۲۴۹	حامل امانت
۲۵۰	امانت سے مراد اختیار ہے
۲۵۱	آیت مبارکہ میں امانت کا مفہوم
۲۵۲	شیطان کے مردود ہونے کا سبب
۲۵۳	علاج النفس

سُورَةُ سَبَا

۲۵۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر خصوصی انعامات
۲۵۵	شکر کا تعلق قول و عمل دونوں سے ہے
۲۵۶	انتفاع کی دو شرطیں
۲۵۷	صبر کی حقیقت
۲۵۷	شکر کی حقیقت
۲۵۸	نعمت کی حقیقت
۲۵۸	مصیبت کی حقیقت

۲۵۸	رباط کی تفسیر
۲۵۹	قرب کا مفہوم
۲۵۹	دین کے شعبے
سُورَةُ فَاطِر	
۲۶۱	اقسام توحید و رسالت
۲۶۲	تین امہات مسائل
۲۶۲	اللہ تعالیٰ کا کمال غلبہ و قدرت
۲۶۳	آیت مقلوہ کی عجیب و غریب تفسیر
۲۶۵	عظمت خداوندی
۲۶۷	علماء صاحب خشیت ہیں
۲۶۷	خشیت کی علامت
۲۶۸	ایک علمی اشکال
۲۷۰	خشیت کی ضرورت
۲۷۱	علم اور خشیت
۲۷۱	خشیت کے لئے علم ضروری ہے
۲۷۲	نفس کی اہمیت
۲۷۳	مقصدین کی مدح
۲۷۴	جوانی کی عمر بھی تذکر کے لئے کافی ہے
۲۷۴	نذیر کی تفسیر
۲۷۴	آیت میں سب غافلین کو خطاب ہے
۲۷۴	اصلاح کے لئے ایک مراقبہ
۲۷۵	عجیب و غریب ربط

سُورَةُ يٰسَـٰ

۲۷۶	سورة یسین کی تلاوت کی فضیلت
۲۷۶	قرآن کوئی طب اکبر نہیں
۲۷۷	ازواج کا معنی
۲۷۷	کسی نے قرآن سے دانہ کا نرمادہ ہونا ثابت کیا ہے
۲۷۸	سائنس کو دین کے مطابق کرنا چاہئے نہ بالعکس
۲۷۸	سائنس کو قرآن میں داخل کرنا ہدم دین ہے
۲۷۸	قرآن کا فخر یہ ہے کہ غیر دین اس میں نہ ہو

سُورَةُ الصّٰفٰتِ

۲۷۹	حقیقت قربانی
۲۸۰	سنت ابراہیم کا مصداق
۲۸۰	استعداد نبوت
۲۸۰	اصل مقصود تسلیم و رضا ہے
۲۸۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان
۲۸۳	اصل مقصود عمل ہے
۲۸۳	ابتداء قربانی

سُورَةُ صَـٰ

۲۸۴	جعل کے دو معنی
۲۸۵	حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ امتحان
۲۸۷	اتباع ہوا کی مذمت
۲۸۸	نزول قرآن کی غرض
۲۸۸	ضعفاء کے حق میں عین رحمت
۲۸۸	ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے مطابق ہے
۲۹۱	آداب اسناد

سُورَةُ الزُّمَرِ

۲۹۲	شرک پر وعیدیں اور مشرکین کی حالت
۲۹۳	ہر شے کو مقصود کے حصول سے سکون ملتا ہے
۲۹۴	مقصود حقوق حقیقی حاصل کرنے کا طریق
۲۹۵	یونی کے معنی
۲۹۶	عبادت مع الاخلاص ہی مقبول ہے
۲۹۸	اخلاص کی اہمیت
۲۹۹	طاغوت کا مفہوم
۳۰۰	شیطان کی عبادت کا مفہوم
۳۰۰	انابت کے درجات
۳۰۱	تحصیل علم واجب ہے
۳۰۲	صراط مستقیم پر ہونا بہت بڑی نعمت و بشارت ہے
۳۰۳	مستقین کیلئے بشارت
۳۰۳	اقسام اطاعت
۳۰۴	علم اور اتباع
۳۰۵	رومائے قرآن حکیم
۳۰۵	قرآن کا ہر جزو احسن ہے
۳۰۷	ضرورت علم و عمل
۳۰۸	طب روحانی میں کوئی مرض لا علاج نہیں
۳۰۸	شان نزول
۳۰۹	شان نزول
۳۱۰	شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص
۳۱۱	گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید

۳۱۳	لنن اشرت کی تفسیر بے نظیر
۳۱۴	شرک کا مفہوم
۳۱۴	عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ
۳۱۵	عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ
۳۱۷	مشیت استثناء کا وقع
۳۱۸	صعقہ موت
۳۱۹	سوق کا اطلاق مسلمانوں سے مشاکلت کے طور پر ہے

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

۳۲۲	دو گنا ہوں کا ذکر
۳۲۲	بد نگاہی کی سزا بیان نہ کرنے میں حکمت
۳۲۳	رخصت کے وقت بھی مصافحہ درست ہے
۳۲۳	کذلک یطیع اللہ علی کل قلب متکبر جبار کی ایک عجیب توجیہ
۳۲۳	حسن سلوک کا اثر
۳۲۳	دعاسب کی قبول ہوتی ہے یہاں تک کہ شیطان کی بھی
۳۲۴	کیا کافر کی دعا قبول ہو سکتی ہے
۳۲۵	انسان عالم صغیر ہے
۳۲۵	ثبوت معاد
۳۲۶	اہمیت دعاء
۳۲۷	ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ

سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ

۳۲۸	بد فالی بری چیز ہے
۳۳۰	اقرار تو حیدور بوبیت بہ قلب

۳۳۱	استقامت آسان ہے
۳۳۲	منافی کی دو قسمیں
۳۳۵	حقیقت دنیا
۳۳۸	احسن قول کی تحقیق
۳۳۸	اقسام داعی
۳۴۱	تکمیل ایمان کے تین اجزا
۳۴۲	آغوش رحمت

سُورَةُ الشُّورَى

۳۴۵	کوئی چیز حق تعالیٰ کے مماثل نہیں
۳۴۶	سلوک و جذب
۳۴۷	مجموعہ ارض و سماء
۳۴۸	عجائبات قدرت کا علم
۳۴۸	شیطان کی مثال
۳۵۰	انسان کی بد اعمالی کے نتائج
۳۵۱	صورت مصیبت اور حقیقت مصیبت
۳۵۲	ما اصابکم من مصیبة پر شبہ کا جواب
۳۵۵	حقوق العباد کی تاکید
۳۵۵	حق سبحانہ و تعالیٰ کی عجیب تعلیم
۳۵۷	فطرت سلیمہ کا تقاضا
۳۵۸	ایمان اور نبوت

